بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ

احسن الحدیث

طالب جوہری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ــــــ احسن الحدیث

نام مصنف ــــــ علامہ طالب جوہری

ناشر ــــــ ذوالفقار علی شیخ

بار دوم ــــــ فروری ۱۹۹۶ء

طابع ــــــ نثار آرٹ پریس لاہور

صفحات ــــــ

تعداد ــــــ دو ہزار پانچ صد (۲۵۰۰)

ہدیہ ــــــ

Rs- 400

مقام

امام بارگاہ بابُ العلم نشاط کالونی آر۔ اے بازار، لاہور چھاؤنی

کتابت

غلام حسین خوشنویس، نفیس دارالکتابت حضرت کیلیانوالہ

فہرست مضامین

موضوعات	صفحہ	موضوعات	صفحہ
عرضِ ناشر	۷	رحمٰن کی تقدیم کا سبب	۶۹
حرفِ آغاز	۹	بسملہ کی جامعیت	۷۰
سورۂ فاتحہ کے مختلف اسماء	۳۰	صفت رحمت	۷۱
سورہ کی اہمیّت	۳۲	اسماء کی ترتیب	//
بسملہ کا مفہوم	۳۶	نقطۂ بائے بسم اللہ	۷۳
الفاظ بسملہ	//	بسملہ جزءِ سورہ ہے	۷۶
بائے بسملہ	//	مفہوم حمد	۷۹
اسم	۴۰	آغاز سُور اور حمد	۸۱
اسم و مسمّٰی	۴۲	مفہوم رب	۸۲
اللہ	۴۳	عالمین	۸۳
لفظ اللہ ماضی بعید میں	۴۵	ربوبیت کا عالمینی تصوّر	۱۴
اللہ کا مفہوم	۴۸	نظام خلق و تسویہ	۹۰
اللہ ـــــ ایک حقیقت	۴۹	نظام تقدیر	۹۲
ایک افسانوی تصوّر	۵۰	نظام ہدایت	//
دلیلِ نظم (وجودِ خدا)	۵۷	نظام سکونت	۹۳
قرآن کا طریقۂ استدلال	۵۸	نظام تنفس	//
رحمٰن و رحیم کا فرق	۶۳	نظام آب	۹۴
رحمٰن عہد قرآن سے پہلے۔	۶۵	نظام غذا	//
قرآنی استعمال	۶۷	اسبابِ حمد	۹۷

موضوعات	صفحہ	موضوعات	صفحہ
رب اور دُعا	۹۰	مقطعات کے ابعاد وجہات	۱۵۰
عالمین کی وسعت	۱۰۱	مقطعات کا جائزہ	۱۶۰
حدوث مادہ اور واجب الوجُود	۱۰۳	ایمان بالغیب	۱۶۸
رسُول اکرمؐ کی دہریوں سے گفتگو	۱۰۵	اقامۂ صلوٰۃ	۱۶۹
یوم الدّین کا قرآنی تصور	۱۱۶	انفاق رزق	
استعانت کا مفہوم	۱۲۵	تنزیل خدا پر ایمان	۱۷۱
حصر استعانت	۱۲۶	آخرت پر ایقان	۱۷۲
جبر و تفویض	۱۲۷	قلب اور نفاق	۱۷۸
فطری ہدایت	۱۲۸	لَعَلّ کا استعمال	۱۹۴
عقلی ہدایت	۱۲۹	زمین و آسمان	۱۹۵
نبوی ہدایت	۱۳۰	عبد مطلق	۲۰۱
توفیقی ہدایت		ضرورت معجزہ	۲۰۳
سُنت ہدایت	۱۳۲	غیر معمولی افعال	۲۰۴
درجات ہدایت	″	معجزہ اور اثبات نبوت	″
صراط مستقیم	″	دعوائے نبوت اور معجزہ کا ربط	۲۰۶
آیات کا باہمی ارتباط	۱۳۹	کیفیت معجزہ	″
سُورۂ حمد کی تقسیم	۱۴۱	امام رضا علیہ السلام کا بیان	۲۰۸
اسماء کی ہمہ گیری	″	معجزات رسُول اکرمؐ	۲۰۹
سورۂ کا معاشرتی پہلو	۱۴۲	اعجاز قرآن	۲۱۱
سُورہ کا دعائیہ اسلُوب	″	وجوہ اعجاز	۲۱۳
دُعا کی اہمیت	۱۴۶	فصاحت و بلاغت	۲۱۴
شرائط اجابت	۱۴۷	تاثیر	
تقابلی مطالعہ (انجیل اور سُورۂ حمد)	۱۴۸	جامعیت	۲۱۶
تعارف و فضائل (سُورۂ بقرہ)	۱۵۳	کائناتی انکشافات	۲۱۷
مقطعات قرآنی	۱۵۶	عدم اختلاف	۲۱۹

موضوعات	صفحہ
اخبار بالغیب	۲۲۰
ارض وسماوات	۲۳۲
خلقت سماوات وارض	۲۳۳
لَکُمْ کی اہمیت	۲۳۶
فرشتے	۲۴۳
عصمت ملائکہ	″
فرشتوں کی ماموریت	۲۴۵
نہج البلاغۃ کا اقتباس	۲۴۰
خلیفہ	۲۴۸
آدم	۲۴۹
علم وقدرت	۲۵۲
جائزہ (قصہ آدم وابلیس)	۲۵۷
تبصرہ	۲۶۳
بلا تبصرہ (توریت کا بیان)	۲۶۷
بنی اسرائیل	۲۶۸
بنی اسرائیل پر احسانات	″
مُوسیٰ کا طور پر جانا	″

موضوعات	صفحہ
صلوٰۃ وزکوٰۃ	۲۸۴
شفاعت	۲۹۲
آلِ فرعون	۳۰۱
مُوسیٰ	۳۱۶
رویت باری	۳۲۴
باب حطہ	۳۳۴
رسالتِ محمدؐ پر ایمان	۳۴۷
رفع طور	۳۵۱
سبت اور اصحاب سبت	۳۵۴
ذبح بقرہ	۳۶۰
توریت میں تحریف	۳۷۶
جہنم میں ہمیشہ رہنے والا	″
والدین	۳۸۱
رشتہ دار	۳۸۳
یتیم	۳۸۴
مسکین	″
قولِ حَسَن	۳۸۵

عرضِ ناشر

یُوں تو رہتی دُنیا تک قرآن کریم کی تفسیریں اور تعبیریں ہوتی رہیں گی۔ لیکن ہر عہد اس ضمن میں اپنے اپنے انداز کے گوناں گوں تقاضے لے کر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کی جدیدیت اور اس کے جدید ذہن کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہیں جن کے پیشِ نظر عرصہ دراز سے ایک ایسی تفسیر کی بے حد ضرورت محسُوس کی جا رہی تھی جو جدید دُنیا کے ان تقاضوں کو خاطر خواہ پورا کر سکے ہمارے عہد کے تقاضے اس اعتبار سے بھی کچھ زیادہ ہی پیچیدہ اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کہ آئے دن نہ صرف سائنسی انکشافات وایجادات نے بنی نوع آدم کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا عزم کر رکھا ہے۔ بلکہ مختلف علوم وفنون کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ صدہا علوم وفنون اور طرح طرح کے فلسفے بھی معرضِ وجُود میں آئے چلے جا رہے ہیں۔ جن سے آج کا انسان اپنے مسائل حل کرنے کے بجائے ان میں خود مزید اُلجھا ہُوا محسوس کر رہا ہے۔ لہٰذا عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق تفسیر لکھنے والے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ ان علوم وفنون اور فلسفوں پہ گہری نظر رکھتا ہو۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہر عہد کی لغت۔ انتخاب الفاظ اور اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا زبان کی ان باریکیوں اور نزاکتوں کو نہیں سمجھتا تو وہ اپنی جگہ لاکھ عالم فاضل ہو قرآن حکیم کی تفسیر اُس عہد کے تقاضوں کے مطابق پھر بھی نہیں لکھ سکے گا۔ زبان و بیان پر اس کا حاوی ہونا بھی ضروری ہے۔ جدید ذہن کو جدید زبان میں ہی سمجھایا جا سکتا ہے۔

الحمد للہ کہ ہمارے پاس ایک ایسی بلند پایہ شخصیت موجُود ہے جو ہمارے اس مثالی مفسر کی جُملہ مذکورہ خصوصیات کی حامل ہے۔ موصوف نہ صرف قرآن حکیم کے عالم، عربی زبان کے فاضل اور جدید علوم و فنون پر حاوی ہیں بلکہ عربی فارسی اور اردُو شعر وادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہماری مراد علامہ طالب جوہری سے ہے ہمیں فخر ہے کہ ہماری نگاہِ انتخاب ایسے ذی وقار فرد پر پڑی جو قرآن وحدیث اور فقہ کے حوالے سے اپنے زمانہ کا یگانۂ روزگار عالمِ بے بدل ہے۔ اور پھر یہ بھی ہماری خوش بختی ہے کہ علامہ نے ہماری درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا اور موصوف نہ صرف تفسیر لکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بلکہ اس وقت بھی مسلسل لکھنے میں مصروف ہیں اور جس کی پہلی جلد فی الحال آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ اس جلد کے مطالعہ سے بخوبی

اندازہ لگا سکیں گے کہ ہم نے جس انداز کی تفسیر کی تمنا کی ہے ۔ہماری وہ تمنا کہاں تک پوری ہوئی ہے اور کس حد تک دورِ حاضر کے تقاضے پورے ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے آپ یقیناً اس کے مطالعے سے خوش اور مطمئن ہوں گے۔ ویسے آپ ہمیں بھی داد دیجئے کہ ہم نے علامہ موصوف ایسے مصروف اور ہمہ وقت مامورِ خدمتِ خلق اور عدیم الفرصت شخص عالی قدر کو کس طرح اس گراں بہا اور وسیع و طویل کام کے لیے رضامند کیا۔ دُعا کیجئے کہ رب العزت علامہ کو عمرِ دراز عطا فرمائے۔ آمین۔ اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس طرح آپکی خدمت میں مکمل قرآنِ حکیم کی تفسیر پیش کرنے میں کامیاب و کامران ہوں۔ ثم آمین۔

اس پاک ذکر کے طفیل قارئین سے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور نوجوانوں نے اس کارِ خیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تعاون فرمایا ہے۔ دُعا فرمائیں کہ پروردگارِ عالمین بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ ان پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور اُن کے بزرگوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ ثم آمین۔

ناشر

حرفِ آغاز

قرآن اس کتاب الٰہی کا نام ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ لفظ قرآن لغت کی رُو سے فرقان اور رجحان کی طرح مصدر ہے۔ اس کا مطلب ہے پڑھنا۔ بعض آیات قرآنی میں اس لفظ کو مصدری معنی میں استعمال کیا گیا ہے "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ"[۱] اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہماری ذمہ داری ہے اور جب ہم اسے پڑھیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ اس کتاب مطہر کا نام قرآن بظاہر اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کا ہر عہد میں پڑھا جانا مطلوب الٰہی ہے۔

قرآن مجید اس کائنات کی وہ واحد کتاب ہے جو زمان و مکان اور عصور و دھور پر محیط ہے اس پر نہ کہنگی اثر انداز ہوئی اور نہ فرسودگی طاری ہوئی اس لیے کہ اس سے استفادہ کرنے والے کسی خاص زمین اور کسی مخصوص زمانے کے لوگ نہیں ہیں۔ وہ ہر زمین اور ہر زمانے کے انسانوں کے لیے شمع ہدایت اور دستور العمل ہے۔ بلکہ پوری انسانیت کے لیے نصاب کی کتاب ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا قرآن مجید کے سلسلے میں ایک مختصر اور جامع بیان اس کتاب کے متعارف ہونے کے لیے کافی ہے۔

"عن ابی عبد اللہ عن آبائہ علیہم السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایہا الناس انکم فی دار ہدنۃ وانتم علی ظہر سفر والسیر بکم سریع وقد رأیتم اللیل والنہار والشمس والقمر یبلیان کل جدید ویقربان کل بعید ویاتیان بکل موعود فاعدوا الجہاز لبعد المجاز قال فقام المقداد بن الاسود فقال یارسول اللہ وما دار الہدنۃ قال دار بلاغ وانقطاع فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہ شافع مشفع وماحل مصدق ومن جعلہ امامہ قادہ الی الجنۃ ومن جعلہ خلفہ ساقہ الی النار وہو الدلیل یدل علی خیر سبیل وہو کتاب فیہ تفصیل

---

[۱] سورۂ قیامت ۷۵/۱۸۔

وبیان وتحصیل وھو الفصل لیس بالھزل ولہ ظھر وبطن فظاھرہ حکم وباطنہ علم ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لہ نجوم وعلی نجومہ نجوم لا تحصی عجائبہ وتبلی غرائبہ فیہ مصابیح الہدی ومنار الحکمۃ ودلیل عَلَی الْمَعْرِفَۃَ لِمَنْ عَرَفَ الصفۃ فلیجل جال بصرہ ولیبلغ الصفۃ نظرہ ینبح من عطب ویتخلص من نشب فاِنَّ التفکر حیاۃ قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور فعلیکم بحسن التخلص وقلۃ التربص [1]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آباءِ گرامی کے حوالے سے رسُولُ اللہ سے روایت فرمائی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اے لوگو! تم ابھی دارِ ہدنہ (راحت کی جگہ) میں ہو۔ تم سفر میں ہو اور تیزی سے تمھیں لے جایا جا رہا ہے اور یہ تو تم نے دیکھا ہی ہے کہ شب و روز اور شمس و قمر (اپنی آمد و رفت سے) ہر نئے کو پرانا کر رہے ہیں اور ہر دُور کو نزدیک کر رہے ہیں اور ہر وعدہ کی ہوئی شے کو سامنے لا رہے ہیں تو تم اپنے سامان کو تیار رکھو اسلیئے کہ گزرگاہ بہت دُور ہے اتنے میں مقداد ابنِ اسود کھڑے ہُوئے اور عرض کی، یا رسُولَ اللہ یہ دارِ ہدنہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ ایسا گھر ہے جو منزل تک پہنچانے والا اور لذتوں سے جدا کرنے والا ہے۔ پس جب تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے تم پر چھا جائیں تو تم قرآن سے تمسک رکھو اس لیے کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے۔ اس کی شفاعت بھی قبول ہے اور شکایت بھی، جس نے قرآن کو اپنے آگے رکھا تو وہ اس انسان کو جنت کی طرف لے جائے گا اور جس نے اسے پس پشت ڈالا تو وہ اسے جہنم کی طرف ہنکا دے گا۔ وہ ایسا رہنما ہے جو بہترین راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ ایسی کتاب ہے جس میں تفصیل ہے، بیان ہے اور معارف کا حصُول ہے، وہ قولِ فیصل ہے۔ غیر سنجیدہ کلام نہیں ہے۔ اس میں ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اس کا ظاہر محکم ہے اور اس کا باطن علم ہے اس کا ظاہر خوشنما ہے اور باطن گہرا ہے۔ اس میں رمُوز ہیں اور ان رمُوز میں بھی رمُوز ہیں۔ اس کے عجائب بے شمار ہیں اور اس کے غرائب فرسُودہ نہیں ہوتے۔ اس میں ہدایت کے چراغ ہیں، حکمت کے منارے ہیں اور معرفت کی دلیلیں ہیں ـــــ ایسے شخص کے لیے جو اس کے اوصاف کی معرفت رکھتا ہو۔ پس لازم ہے کہ رہرو اس کے ذریعے اپنی آنکھ کو جلا بخشے اور اپنے فکر و نظر کو اس کے اوصاف تک پہنچائے تاکہ تباہی سے نجات پائے اور لاعلمی سے چھٹکارا پائے۔ اس لیے کہ ایک بصیرت رکھنے والے کی زندگی ہی غور و فکر ہے جیسے کہ روشنی پسند کرنے والا تاریکیوں میں روشنی لے کر چلتا ہے۔ پس تم پر لازم ہے کہ بہترین چھٹکارا حاصل کرو اور خواہشات کم کر لو۔"

---

[1] الکافی کتاب فضل القرآن باب اوّل دوسری حدیث۔

نزولِ قرآن

نزول کے معنی اُوپر سے نیچے آنے کے ہیں۔ قرآن مجید علم الٰہی سے نازل ہُوا اور عرش کی بلندیوں سے زمین کی طرف نازل ہوا ہے۔ غائر نظروں سے نزولِ قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے چار نزول ہیں۔

① اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ [1]

"رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔ اسے بیان کی تعلیم دی۔"

ان آیات میں دو باتوں کی صراحت ہے۔ پہلی تو یہ کہ اللہ نے براہِ راست کسی کو قرآن تعلیم کیا ہے اور دوسری یہ کہ قرآن کی یہ تعلیم انسان کی تخلیق سے قبل ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم الٰہی سے قرآن کا پہلا نزول نورِ محمدؐ پر ہوا ہے۔

② بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ [2]

"درحقیقت وہ باعزت قرآن لوحِ محفوظ میں ہے۔"

ان آیات کو سورۂ رحمٰن کی آیات سے مربوط کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کا دوسرا نزول نورِ محمدؐ سے لوحِ محفوظ پر ہُوا ہے۔

③ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ [3]

"ہم نے اس کو قدر کی رات میں یک بارگی نازل کیا۔"

انزال دفعۃً اور یک بارگی نزول کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ تیسرا نزول ہے جس میں قرآن لوحِ محفوظ سے پورا کا پورا قلبِ رسولؐ پر نازل ہُوا۔

④ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ [4]

"ہم نے اس قرآن کو رفتہ رفتہ تم پر نازل کیا ہے۔"

یہ چوتھا نزول ہے جس میں قرآن مجید تھما تھما اور تھوڑا تھوڑا موقع اور محل کی مناسبت سے قلبِ رسولؐ پر نازل ہوتا رہا اور اسے پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے سامنے بیان فرماتے رہے۔ آپ نے

---

[1] سورۂ رحمٰن آیت ۱ ۲ ۳ ۴۔
[2] سورۂ بروج آیت ۲۱ ۲۲۔
[3] سورۂ قدر آیت ۱۔
[4] سورۂ دہر آیت ۲۳۔

اس کتاب کو اس عہد کے لوگوں کے سامنے اپنی نبوت کے معجزے کے طور پر چیلنج کی صورت میں پیش فرمایا کہ اگر یہ خدا کا کلام نہیں ہے تو اس کا جواب لاؤ۔

وجودِ خدا کی دو مستقل دلیلیں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کے طول و عرض میں دو اہم ترین دعوے یہ تھے کہ میں خدا کا نبی ہوں اور یہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور میرا معجزہ ہے۔ یہاں یہ اعتراض پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر قرآن نبوت محمدؐ کا معجزہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نبوت موقوف ہے قرآن پر، جب کہ نبی یہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ گویا اس کا کتاب الہی ہونا موقوف ہے۔ قول نبی پر یعنی نبوت موقوف ہے قرآن پر اور قرآن کا کلام خدا ہونا موقوف ہے نبوت پر۔ اسے علمی اصطلاح میں دور کہا جاتا ہے اور یہ عقلاً کی نگاہ میں صریحاً باطل ہے اور اسی پر وہ مصرع صادق آتا ہے کہ "من ترا حاجی بگویم الخ"۔ بادی النظر میں یہ اعتراض کتنا ہی پرکشش اور جاندار سہی لیکن حقیقت میں ایک مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید سے قطع نظر نبوت محمدؐ کی تصدیق کے لیے دو اہم دلیلیں موجود تھیں جن میں پہلی تو یہ تھی کہ پچھلی مقدس کتابوں میں آپ کے شکل و شمائل، اسماء و اوصاف اور کسی قدر حالات بھی بیان کر دیئے گئے تھے اور وہ اتنے کافی تھے کہ رسولِ اکرمؐ پر ایمان لانے کے لیے ان کے علاوہ مزید کسی نص کی ضرورت نہ تھی[1] دوسری دلیل آپ کے وہ معجزات تھے جو اس کثرت سے ظاہر ہوئے کہ لوگوں نے آپ کو (نعوذ باللہ) جادوگر اور کاہن وغیرہ کہنا شروع کیا۔ یہ سارے معجزات انفرادی اور اجتماعی طور پر آپ کی نبوت کے براہین قاطعہ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے مزید کسی اور دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسولِ اکرمؐ کی نبوت قرآن پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ نصوص و معجزات کی روشنی میں ثابت ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا قرآن مجید کا کتاب الہی ہونا فقط قولِ رسولؐ سے ثابت ہے؟ اور کیا اس کے لیے کوئی اور دلیل موجود نہیں ہے؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کے چیلنج کے مقابل کسی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش جواب لانے کی نہیں کی گئی۔ نہ عہد نزول قرآن میں اور نہ اس کے بعد سے اب تک۔ یہ خود دلیل قاطع ہے کہ قرآن مجید ایک الوہی معجزہ اور الہی کتاب ہے۔ جسے کسی تصدیقی قول کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تناظر میں پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور قرآن مجید وجودِ خدا کی دو مستقل بالذات دلیلیں ہیں، یہ دونوں اللہ کی طرف سے ہادی ہیں اور بندوں پر اللہ کا اتمامِ حجت ہیں۔ ایک دوسرے پر موقوف نہیں ہیں۔ یہ خداوند عالم کا لطفِ خاص ہے کہ اپنی کتاب میں پیغمبر اکرمؐ کا بار بار تذکرہ فرما کر ہر تذکرہ کو آپؐ کی نبوت کی ایک مستقل دلیل بنا دیا ہے۔ اور ان سب

---

[1] تحریفات کے باوجود توریت، زبور اور انجیل میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔

تذکروں کی حیثیت تائیدی ادلہ کی ہے۔

ابلاغی حیثیت

یہ قرآن جو ہادی بھی ہے اور اللہ کی حجت بالغہ بھی، کیا اپنے ابلاغ میں مستقل ہے یا سہاروں کا محتاج ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لیے بہتر راستہ یہی ہے کہ ہم خود قرآن ہی کے بیانات کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ خود اپنے متعلق کیا وضاحت فرماتا ہے۔ اس مقام پر فقط چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ ۲)، هُدًى لِّلنَّاسِ (بقرہ ۱۸۵)، هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (اعراف ۵۲)، وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (نحل ۸۹)، كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ہود ۱)، كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (ابراہیم ۱)، الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا (کہف ۱)، تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ (لقمان ۲/۳)، كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (حم سجدہ ۳/۴)، وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (قمر ۱۷)

ان آیات سے جو واضح نتائج برآمد ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ یہ کتاب پوری انسانیت کے لیے ہدایت ہے، مسلمانوں، مومنوں، متقیوں اور احسان کرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہ کتاب اپنے مضامین میں محکم بھی ہے اور مفصل بھی۔ اس کتاب کے ذریعہ انسان تاریکیوں سے نور کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ یہ کتاب نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان رکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے، مفصل ہے اور صاحبانِ علم کے لیے خوش خبری دینے والی بھی ہے اور ڈرانے والی بھی۔ مذکورہ آیات سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ قرآن مجید اپنے ابلاغ اور اپنے معانی و مطالب کے بیان میں بہت صریح اور واضح ہے اور اسے ہر درجہ کا انسان اپنی سطح کے مطابق سمجھ بھی سکتا ہے اور اس سے استفادہ بھی کر سکتا ہے۔ یعنی یہ کوئی ایسی مشکل، مغلق اور گنجلک کتاب نہیں ہے، جسے عقل انسانی نہ سمجھ سکے اور نتائج کا استنباط و استخراج نہ کر سکے۔

قرآن فہمی میں عقل کا کردار

قرآن مجید نے اپنی دعوت کے ضمن میں بہت سے مقامات پر عقل کے استعمال پر گفتگو فرمائی ہے۔ کئی مقامات پر یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان عقل سے کام نہیں لیتے (مائدہ ۵۸/۱۰۳ وغیرہ)۔ کہیں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ (یٰس ۶۸)۔ اور بہت سے مقامات پر اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں (نحل ۲، ۶۷)۔ ان آیات

کے علاوہ عقولِ کردار کو ان آیات سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جن میں انسان کو تدبّر، تفکّر اور تذکّر پر آمادہ کیا گیا ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ (النساء ۸۲)

"کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟"

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ۲۴)

"کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں:"

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ (مومنون ۶۸)

"کیا انہوں نے (ہمارے) قول پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ چیز آگئی ہے جو اُن کے باپ اور داداؤں کے پاس نہیں آئی تھی؟"

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ (ص ۲۹)

"جو کتاب ہم نے تم پر اتاری ہے، مبارک ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔"

ان آیات میں ذہن انسانی کو آیات قرآنی میں تدبّر کے لیے مہمیز کیا گیا ہے۔ تدبر کے معنی ہیں کسی کام کے نتیجے پر نگاہ رکھنا اور اس میں غور و فکر سے کام لینا۔

كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (بقرہ ۲۱۹)

"اللہ تمہارے لیے آیتوں کو اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔"

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (اعراف ۱۷۶)

"پس تم قصہ بیان کرتے رہو تاکہ لوگ فکر کریں۔"

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس ۲۴)

"اس طرح ہم نشانیوں کو مفصل بیان کرتے ہیں فکر کرنے والے لوگوں کے لیے۔"

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (حشر ۲۱)

"اور یہ مثالیں ہم انسانوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر سے کام لیں۔"

ان آیات میں ذہن انسانی کو فکر کے استعمال پر آمادہ کیا گیا ہے۔ فکر درحقیقت کسی چیز میں اپنی قوتِ نظری کو استعمال کرنے کا نام ہے۔ فیومی اور مصنف کی تشریح کے مطابق فکر خود غوض کے ساتھ دل کے تردد کرنے کا نام ہے، جب کہ وہ تردد معانی کے حاصل کرنے کے لیے ہو۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا (بنی اسرائیل ۴۱)

"اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں بہت طریقوں سے سمجھایا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔"

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِیْهَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نور ۱)

"یہ سورہ جسے ہم نے اتارا اور جسے ہم نے فرض کیا اور اس میں واضح آیتیں نازل کیں تاکہ

تم لوگ نصیحت حاصل کرو"

"اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" (یونس ۳)

"کیا تم اب بھی نصیحت نہیں حاصل کرتے"

ان آیات میں تذکر کا مفہوم کسی بات کو مسلسل یاد رکھنا اور دائمی طور پر اس سے نصیحت حاصل کرنا ہے۔ مذکورہ ساری آیات اپنے اس ابلاغ میں صریح ہیں کہ قرآن انسانی ہدایت کی کتاب ہے اور ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اسے پڑھے اور سمجھے اور اس کے مطالب میں غور و فکر اور تعقل و تدبر سے کام لے اور بہ قدرِ استعداد نصیحت حاصل کرے۔ یہ کتاب بھیجی ہی اس لیے گئی ہے کہ اس میں غور و فکر کیا جائے اور اس نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے جس نتیجے تک یہ کتاب پہنچانا چاہتی ہے۔

مطالبِ قرآن میں بعض ایسے مسائل ہیں۔ جن کی حیثیت بنیادی عقائد کی ہے۔ جیسے توحید قیامت، ملائکہ، انزالِ کتب اور نبوت[1] وغیرہ۔ کچھ وہ مطالب ہیں، جن کا تعلق انسان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات سے ہے، کچھ ایسے تذکرے ہیں، جن کا تعلق ماضی کی اقوام و ملل یا شخصیات سے ہے اور جنہیں انسانیت کی عبرت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بشارت ہے، نذارت ہے، زجر و توبیخ ہے اور وعد و وعید ہے۔ یہ مطالب کلِ قرآن کے وہ بعض ہیں جن سے انسان اپنی اپنی سطح پر استفادہ کرتے رہے ہیں۔ خواہ وہ استفادہ ترجمہ ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور ترجمہ اس کی کسی بھی آیت کے پورے مفہوم کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا جو لوگ واقعتاً قرآن فہمی کا ذوق رکھتے ہیں اور اس کے دقیق و لطیف مطالب سے آشنا ہونے کے خواہش مند ہیں وہ عربی زبان و ادب پر کامل عبور حاصل کرتے ہیں اور اس کے قواعد کو تصرف میں لا کر اور اصولِ تفسیر کو سامنے رکھ کر مطالبِ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن فہمی میں اُصول و قواعدِ تفسیر کا وہی کردار ہے جو فلسفہ اور دیگر فکری علوم میں منطق کا ہے۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب سے مطالب کا استنباط ہوتا رہا ہے۔ قرآن فہمی اور تفسیر نویسی کی تاریخ میں یہی طریقہ عمومی طور پر پسندیدہ اور قابلِ تقلید بھی رہا ہے۔

استفادۂ قرآن کے ان مراحل سے قطع نظر قرآن مجید نے آیات کی تقسیم محکم و متشابہ پر کی ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ[2] انسان متشابہات کے مفہوم واقعی تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا سوائے اس کے کہ اللہ اور راسخون فی العلم سے ان کے بارے میں معلوم کرے اس لیے کہ ایسی آیتوں کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرادِ الٰہی کیا ہے؟

---

[1] سورۂ بقرہ ۱۷۷۔

[2] سورۂ آلِ عمران ۷۔

——— اس کتاب کے محکمات ہوں یا متشابہات، ان میں بطون ہیں اور ان کے بطون کے اندر بھی بطون ہیں اور یہ اتنے تہہ دار ہیں کہ ان تک رسائی ممکن نہیں ہے ——— ان کے علاوہ اس کتاب کے بیان شدہ احکام میں بکثرت اجمال ہے۔ نماز روزہ۔ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے تفصیلات ظاہر کتاب سے (بغیر کسی خارجی استمداد کے) حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا قرآن فہمی کے لیے ایسے ذرائع کو تلاش کرنا ہوگا جو احکام کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ قرآن کے حقائق و دقائق سے روشناس کرا سکیں اور جن کے ذریعہ ہمیں حتمی طور پر کسی آیت میں مرادِ الٰہی معلوم ہو سکے۔

بیانِ رسولؐ

ابھی یہ ذکر کیا گیا کہ اس کتابِ مطہر میں آیات متشابہات کا وجود ہے، اس کے اوامر و نواہی میں اجمال ہے اور اس میں تہہ در تہہ بطون در تہہ پائے جاتے ہیں، یہ تینوں باتیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب وارثِ کتاب کے بغیر نہ پوری سمجھی جا سکتی ہے اور نہ اس پر پوری طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب کی توضیح و تشریح کی ذمہ داری اللہ کی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ [1] (پھر یقیناً اس کا کھول کر بیان کرنا ہماری ہی ذمہداری ہے)۔ بیان کی اس ذمہ داری کو پروردگارِ عالم نے پیغمبرِ اکرمؐ کے ذریعہ پورا فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

"وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ [2]

"اور ہم نے اس ذکر کو تم پر نازل کیا تاکہ تم لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دو اسے جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

"وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ [3]

"اور ہم نے یہ کتاب تم پر نہیں اتاری مگر اس لیے کہ تم کھول کر بیان کر دو اس کا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور یہ کتاب مؤمنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔"

یہ دونوں آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کتاب اس وقت تک کافی نہیں ہے۔ جب تک بیانِ رسولؐ

---

[1] سورۂ قیامت، ۱۹۔

[2] سورۂ نحل، ۴۴۔

[3] سورۂ نحل، ۶۴۔

اس کے ساتھ نہ ہو وہ بیان قول، فعل اور تقریر تینوں صورتوں پر مشتمل ہے۔ جسے سنت کہا جاتا ہے سنت رسولؐ وحی الٰہی کی تجسیم[1] اور عصمت مطلقہ کا اظہار ہے جس میں کسی خطا، کسی لغزش، کسی سہو اور کسی نسیان کا گزر نہیں ہے۔ وہ اپنے سارے کلیات و جزئیات سمیت ہر انسان کے لیے حجت بالغہ ہے۔

سنت کو پیغمبر اکرمؐ کی وفات پر ختم ہو جانا تھا اور قرآن کو قیامت تک جانا تھا اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اپنے اپنے دور میں سنت رسولؐ کا آئینہ اور کردار رسولؐ کا مظہر ہوں۔ مقام نفس[2] اور مقام منیت[3] کے رتبہ بلند پر فائز ہوں۔ یہی سبب ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے بہت سے مواقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی ابدا وانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض "میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت جو اہل بیت ہیں، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں ہرگز ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک حوض کوثر پر میرے پاس وارد ہوں گے۔"

حدیث ثقلین

یہ جلیل القدر روایت جسے حدیث ثقلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، متن اور سند کے اختلاف کے ساتھ احادیث کی بے شمار کتابوں میں بکثرت نقل ہوئی ہے اور اس کے متن و سند کے سلسلے میں علماء و محققین نے پوری پوری کتابیں تدوین کی ہیں۔ اس کے چند حوالے درج ذیل ہیں۔

(۱) الحدیث الثامن والستون عن ابی سعید الخدری قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال یا ایھا الناس انی ترکت فیکم الثقلین خلیفتی إن أخذتم بھما لن تضلوا بعدی احدھما اکبر من الآخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی وھم اھل بیتی من یفترقا حتی یردا علی الحوض۔ اوردہ الثعلبی وذکر الامام احمد بن حنبل فی مسندہ[4]

۶۸ویں حدیث۔ ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ

---

[1] سورۂ یونس، ۱۵۔ اور سورۂ نجم، ۳، ۴
[2] سورۂ آل عمران، ۶۱۔ (آیت مباہلہ)
[3] ھم منی وانا منھم (حدیث کساء و شان نزول آیہ تطہیر)

دیا اور ارشاد فرمایا کہ "اے لوگو! میں تم میں دو اہم چیزوں کو اپنا خلیفہ قرار دیکر جا رہا ہوں۔ اگر انھیں تھامے رہے تو ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک۔ دوسری سے بڑی ہے ایک اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک کھینچی ہوئی رسی ہے اور دوسری میری عترت ہے جو میرے اہل بیت ہیں۔ یہ ہرگز ہرگز جدا نہیں ہونگے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔ اس روایت کو ثعلبی نے نقل کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔[1]

(٢) یہی روایت مختلف اسناد و متون کے ساتھ اسی کتاب ینابیع المودہ کے صفحات ۲۰، ۲۱، ۲۲ وغیرہ پر بھی موجود ہے۔

(٣) ملا علی متقی ہندی۔ کنز العمال جلد اول صفحہ ۴۴ طبع حیدر آباد دکن۔

(٤) طبقات ابن سعد جلد دوم صفحہ ۱۹۴ طبع دار المعارف، مصر۔

(٥) المعجم الصغیر حافظ طبرانی صفحہ ۷۳ طبع دہلی۔

(٦) صحیح ترمذی جلد ۱۳ صفحہ ۲۰۰ طبع صاوی مصر۔

(٧) مستدرک ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری جلد سوم صفحہ ۱۴۸ طبع حیدر آباد دکن۔

(٨) تفسیر در منثور سیوطی جلد دوم صفحہ ۶۰ مطبوعہ مصر۔

(٩) سیوطی نے اس روایت کو اپنی دیگر کتابوں میں بھی سند و متن کے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(١٠) الصواعق المحرقہ صفحہ ۱۴۷۔

کتاب و عترت

مذکورہ بالا حدیث صریحی طور پر اُمت کو کتاب خدا اور عترت رسولؐ سے تمسک کا حکم دیتی ہے جس سے چند واضح اور بدیہی نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ خطاب صدر اول کے عظیم المرتبت مسلمانوں سے ہے اور ان کے وسیلے سے پوری اُمت اسلامیہ سے ہے۔

۲۔ رسول اکرمؐ نے عترت کو اُمت میں چھوڑا ہے یعنی جنھیں چھوڑا ہے وہ اور ہیں اور جن میں چھوڑا ہے وہ اور ہیں۔

---

[1] ینابیع المودۃ صفحہ ۲۱ طبع ایران ۱۳۰۸ھ

۳۔ پوری اُمت کو عترت سے متمسک ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امت عترت کی محتاج ہے، عترت امت کی محتاج نہیں ہے۔

۴ اگر اُمتِ اسلامیہ میں عترت کے ہم پایہ کچھ اور لوگ بھی ہوتے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمسک کو فقط اور فقط کتاب و عترت سے مخصوص نہ فرماتے۔

۵ اگر اُمت اسلامیہ میں عترت سے افضل افراد موجود ہوتے تو پیغمبر اکرمؐ عترت کو اُن افراد سے تمسک اختیار کرنے کا حکم دیتے جب کہ ایسا نہیں ہے۔

۶ یہ ارشاد کہ کتاب و عترت جدا نہ ہوں گے اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اُمت محتاج قرآن ہے تو محتاج عترت بھی ہے اور چونکہ عترت قرآن سے جدا نہ ہوگی اس لیے اُمت کی محتاج نہ ہوگی۔

۷ اگر عترت میں خطا کا امکان فرض کیا جائے تو وہ قرآن سے جدا ہو جائے گی اور رسُول اللہ کے قولِ گرامی "لن یفترقا" کی نفی ہو جائے گی۔

۸ اگر عترت میں خطا کا امکان فرض کیا جائے تو عترت کے غیر مشروط تمسک کا حکم غلط ہو جائے گا خطا کی صُورت میں حکم کی شان کچھ یوں ہوتی کہ اگر عترت صحیح حکم دے اور صحیح رہے تو تمسک کرنا بہ صُورت دیگر نہ کرنا۔

۹ اگر عترت قرآن کے کچھ اجزاء کی عالم ہو اور کچھ اجزاء کی عالم نہ ہو تو جن کی عالم نہیں ہوگی اُن سے جُدا ہو جائے گی اور یہ لن یفترقا کے خلاف ہے۔ لہذا عترت کے پاس پورے قرآن کا علم ہے۔

۱۰ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قولِ گرامی کہ یہ حوض کوثر تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کسی زمانے میں کتاب و عترت سے خالی نہیں رہے گی۔

ظواہرِ قرآن

ظواہرِ قرآن کا حجت ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے، کسی معنی یا مراد کی ترسیل کے لیے انسانی معاشرہ میں مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے انسان کل بھی اشاروں سے کام لیتا تھا اور آج بھی لیتا ہے، کل بھی تصویریں بنا کر اپنی مراد کو واضح کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے۔ اسی طرح کل بھی علامتوں کے ذریعے معنی کی ترسیل ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے شاہراہوں کے سنگ ہائے میل اور شہری راستوں کے ہرے لال پیلے اشارے اس کا ثبوت ہیں۔ اگرچہ ترسیلِ معنی کے مختلف طریقے دُنیا میں رائج ہیں، لیکن ان سب کے مقابل لفظوں کے کردار کو مرکزیت حاصل ہے۔ لفظ افہام و تفہیم کا ایسا ذریعہ ہیں جن میں آسانی بھی ہے اور جامعیت بھی۔ ہر لفظ ایک مخصوص معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے اور جب وہ بولا جاتا ہے تو اس سے وہی مخصوص معنی سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی متکلم اور سامع دونوں کے ذہن

میں لفظ کے یکساں معنی موجود ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی انسان زندگی بھر کسی دوسرے کو اپنی آسان ترین بات بھی نہیں سمجھا سکتا۔ یہی پوری دُنیا کا رائج العمل طریقہ ہے اور اسی پر دُنیا کی عام بول چال اور افہام و تفہیم کا دار و مدار ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ عام بول چال میں لفظ کا کوئی خاص معنی متکلم کے ذہن میں ہو اور اس کے برعکس اسی لفظ کا کوئی دوسرا مفہوم سامع کے ذہن میں ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو سارے ذہنی سمجھوتے آن واحد میں ختم ہو جائیں گے اور زمین کا سارا معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قاعدہ کلیہ طے کیا گیا ہے کہ لفظ کا ظاہری مفہوم حجت ہے اور کسی بھی کلام میں لفظ کا وہی مفہوم مراد لیا جائے گا جو معاشرے میں دیگر بولنے والے لوگ مراد لیتے ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے تحت قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس کے الفاظ کا ظاہری مفہوم حجت ہے۔ اس قاعدے میں فقط اس صُورت میں استثناء ہوگا جب کہ قرینوں یا عقلی دلیلوں سے یہ معلوم ہو جائے کہ لفظ اپنے ظاہری مفہوم کے علاوہ کسی اور مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ظواہر قرآن کے حجت ہونے پر اس کے علاوہ بھی بہت سی دلیلیں دی گئی ہیں، جن میں چند دلیلیں یہ ہیں۔

دلیل اوّل

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر تمہارے پاس میری کوئی حدیث آئے تو اسے قرآن سے ملا کر دیکھو اگر وہ قرآن کے موافق ہو تو اسے قبول کر لو اور مخالف ہو تو اسے رد کر دو[1] یہ روایت اس نظریہ پر برہان قاطع ہے کہ قرآن سمجھ میں آنے والی کتاب ہے احادیث کے صحت و سقم کی میزان ہے احادیث اس پر حجت نہیں ہیں بلکہ وہ احادیث پر حجت ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے۔

دلیل دوم

اس کتاب کو عربوں کے سامنے بطور معجزہ چیلنج کی صُورت میں پیش کیا گیا کہ اس کی مثل بنا کر لاؤ۔ اگر اس کتاب کے ظواہر حجت نہ ہوتے تو اسے مشرکین عرب کی عقل و فہم کے لیے حجت قرار دیا جاتا۔

دلیل سوم

اگر اس کتاب کے الفاظ کا ظاہری مفہوم حجت نہ ہوتا تو تعقل، تفکر اور تدبر کی ساری آیات کا مقصد فوت ہو جاتا اور قاری کے لیے سوائے نص معصوم کی تلاش کے فہم قرآن کی اور کوئی صُورت باقی نہ رہتی۔

---

[1] تہذیب الاحکام جلد ہفتم صفحہ ۲۷۵ حدیث ۵۔

دلیل چہارم

ثقلین کی حدیث میں عترت کے ساتھ قرآن مجید سے بھی تمسک کا حکم دیا گیا ہے اگر اس کے ظاہری مفاہیم کو حجت نہ مانا جائے تو قرآن سے تمسک ممکن نہ ہوگا۔

مفسرین کا وہ گروہ جو ظواہر قرآن کو حجت سمجھتا ہے، ان کی اکثریت فہم قرآن کے لیے جن مصادر سے کام لیتی ہے وہ یہ ہیں۔

آیت سے متعلق دیگر آیات

روایات محمدؐ و آل محمدؐ

اقوال صحابہ وتابعین

آرا مفسرین

ذاتی تدبر

یہ لوگ مذکورہ مصادر کے علاوہ زبان وادب کے معروف قواعد کو بھی سامنے رکھتے ہیں، الفاظ کی نشست، جملوں کی ساخت اور محاورات و اصلاحات پر توجہ دیتے ہیں اور پھر کسی آیت پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ ابوالفتوح رازی، طبرسی اور ابوالقاسم لاہوری کی تفاسیر اس گروہ کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک گروہ نے اپنے لیے یہ طریقہ وضع کیا ہے کہ وہ اپنی تفسیروں میں فقط ان روایت کو جمع کرتے ہیں جو آیات کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ علی ابن ابراہیم قمی، ہاشم بحرانی اور عبدالعلی حویزی کی تفاسیر اس کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس گروہ کے خیال میں نص معصومؑ سے ہٹ کر کسی آیت پر اظہار خیال کرنا تفسیر بالرائے ہے۔

تفسیر بالرائے

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا

"انما اتخوف علی امتی بعدی ثلاث خصال أن یاولوا القرآن علی غیر تاویلہ"[1]

"مجھے خوف ہے کہ میرے بعد میری اُمت تین خصلتوں میں مبتلا ہوگی، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ قرآن کی وہ تاویل کریں گے جو خلاف مراد ہوگی۔

رسول اللہ نے ارشاد فرمایا۔

---

[1] خصائل شیخ صدوق قلمی۔

"من تکلم فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطأ"[1]

"جس نے قرآن میں اپنی رائے سے گفتگو کی اگر وہ صحیح نتیجے تک پہنچ جائے جب بھی خطاکار ہے۔"

امیرالمومنین نے ارشاد فرمایا۔

"ایاک ان تفسر القرآن برأیک"[2]

"خبردار اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر نہ کرنا۔"

امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا۔

"برأیہ ان اصاب لم یوجر و ان اخطاء فھو ابعد من السماء"[3]

"جو شخص اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے، اگر وہ واقع در حقیقت تک پہنچ جائے تو اسے اجر نہیں ملے گا اور اگر وہ خطا کرے تو جنت سے اتنی ہی دور ہو گا، جتنا آسمان سے دور ہے۔"

تفسیر بالرائے کے سلسلے میں بکثرت روایات وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو مذکورہ روایات سے زیادہ سخت اور شدید ہیں۔ رائے درحقیقت وہ عقیدہ یا نظریہ ہے۔ جسے انسان کسی گمان غالب کے سبب اپنا لیتا ہے۔ جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں تحریر کیا ہے۔

(۱) اس اعتبار سے اگر انسان پہلے سے ایک عقیدہ یا نظریہ رکھتا ہو اور اسے ثابت کرنے کے لیے آیات قرآن کو کھینچ تان کر مختلف غیر مانوس طریقہ ہائے استدلال کے ذریعے، خلاف قواعد زبان و ادب اور خلاف اصطلاحات اہل شرع اپنے عقیدے کی تائید میں پیش کرے تو یہ تفسیر بالرائے ہے۔

(۲) آیت کی تفسیر کو قواعد کے مطابق قبول کرے مگر اس کے مصداق یا مورد کو اپنے نظریے کے اثبات کے لیے تبدیل کر دے اور کہے۔ یہ آیت فلاں سے نہیں بلکہ فلاں سے متعلق ہے یا یہ فلاں مورد میں نہیں بلکہ فلاں مورد میں نازل ہوئی ہے۔

(۳) ایسی تفسیر کرے جو عقل سلیم اور منطق صحیح کے بالکل خلاف ہو۔

(۴) قرآن فہمی کے اصول و قواعد اور لازمی علوم کے حاصل کیے بغیر آیات قرآنی میں اپنی رائے قائم کرے۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۹۲ صفحہ ۱۱

[2] توحید صدوق باب ۳۶

[3] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۱۹

ان صورتوں میں انسان اپنی رائے کو قرآن کے مطابق نہیں کرنا چاہتا بلکہ آیاتِ قرآنی کو اپنی رائے کے تابع کرنا چاہتا ہے یہ ناپاک عمل ایک ناقابلِ تلافی جسارت ہے ورنہ اگر نحوی، ادبی، عقلی یا دیگر قرائن کے ذریعے آیت کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو یہ تفسیر بالرائے نہیں ہے۔

باعثِ تحریر

لاہور کے موسم سرما کی ایک انتہائی سرد رات تھی اور میں اپنے ایک مہربان بزرگ کے گھر عشائیہ پر مدعو تھا۔ شہر کے معتبر اور علم دوست حضرات کا اجتماع تھا۔ کھانے سے قبل میری ان تقریروں پر گفتگو کی جا رہی تھی جو بعض نشریاتی وسائل ابلاغ کے ذریعہ پاکستان کے علمی حلقوں میں مقبول ہوئی تھیں۔ پھر عمومی طور پر یہ بات بھی زیرِ بحث آئی کہ میری مجلسوں میں اکثر ایسے رموز قرآنی زیرِ بحث آتے ہیں جو آیات کے مختلف ابعاد و جہات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد بھی یہی گفتگو رہی۔ اسی دوران ایک معتبر شخصیت نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ تفسیر کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے اپنے مشاغل اور مجبوریوں کا تذکرہ کیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔ میں مجلسوں کے سلسلے میں کثرت کے ساتھ سفر میں رہتا ہوں۔ مذکورہ گفتگو کے بعد جب بھی لاہور جانا ہوا وہ معتبر بزرگ مجھ سے یہی سوال کرتے رہے کہ میں تفسیر کیوں نہیں لکھتا۔ اس دوران وہ مجھے ذہنی طور پر آمادہ بھی کرتے رہے۔ کم و بیش یہی صورتِ حال ملک کے دیگر شہروں میں بھی رہی اور مجھ سے یہی سوال کیا جاتا رہا۔ اسی دوران میرے گھر پر ڈاکہ پڑا اور بچوں کے اعصابی تناؤ کے سبب مجھے ذاتی گھر چھوڑنا پڑا۔ میں کراچی کے ایک محلہ گلشن اقبال کے ایک چھوٹے سے مکان میں کرایہ پر زندگی گزار رہا تھا جب کہ میرا کتب خانہ میرے ذاتی گھر میں بند پڑا تھا۔ ایک منزل وہ آئی کہ جب میں اصرار شدید کے مقابل سپر انداختہ ہو گیا۔ سلف صالحین کے اتباع میں استخارہ دیکھنے کے بعد میں نے ایک رات اپنے کتب خانے سے چند کتابیں لیں اور مکان پر واپس آگیا اور اسی رات میں نے تفسیر نویسی کا کام شروع کیا۔ وہ رمضان ۱۴۰۹ھ ہجری کی تئیسویں تاریخ کی رات تھی جو کثیر التعداد روایات کی روشنی میں شب قدر ہے ——— اصرار کرنے والوں کے سرخیل معتبر بزرگ جناب ذوالفقار علی شیخ ہیں جو اس کتاب کے ناشر ہیں۔ میں نے ابھی کام کا آغاز کیا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کتنی مدت میں یہ اتمام پذیر ہوگا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

حرفِ آغاز کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ مقدمۂ تفسیر قرآن نہیں ہے۔ بلکہ زیرِ نظر تفسیری کاوش کا ابتدائیہ ہے۔ جس میں سرسری طور سے بنیادی مباحث کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ میں نجفِ اشرف کی طالب علمانہ زندگی کے ابتدائی دور ہی سے قرآن مجید کے فہم سے شغف رکھتا ہوں۔ اس زمانے سے لے کر اب تک میں نے قرآنیات اور تفاسیر کے معتد بہ ذخیرے کا مطالعہ کیا ہے۔ زیرِ نظر تحریر اگرچہ اس علمی میراث سے ماخوذ ہے۔ جو ملت اسلامیہ نے چودہ صدیوں میں جمع کی ہے۔ لیکن اس میں بہت سے

مقامات پر ذاتی تحقیق کا اظہار بھی ہے۔ جو باتیں علم و عقیدہ کی میزان پر پوری اُتریں وہ استفادہ ہیں اور جو کمزور ہوں انہیں میری کم علمی اور جہالت پر محمول کیا جائے اور مجھے مطلع کیا جائے تاکہ میں اپنی اصلاح کرسکوں میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے عمداً کوئی غلط بات تحریر کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے اسے پورے شرح صدر کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی قابلِ گرفت بات ہو تو میں اپنے رب کی بارگاہ میں عفو و مغفرت کا خواستگار ہوں اور قارئین سے چشم پوشی کا خواہاں۔

میں اپنی اس حقیر کوشش کا ثواب اپنے والدین کو ہدیہ کر رہا ہوں۔ میری دینی تربیت میں اگرچہ میرے ان اساتذہ کا بڑا حصہ ہے، جن کی علمی شہرت اور فکری ساکھ بین الاقوامی ہے۔ لیکن قرآن فہمی در طرزِ استدلال میں جتنا استفادہ میں نے اپنے والد ماجد اعلی اللہ مقامہٗ سے کیا ہے وہ ہر استفادہ سے زیادہ ہے۔ میری والدہ ماجدہ بقیدِ حیات ہیں۔ خداوندِ عالم بطفیل محمدؐ و آلِ محمدؐ اُن کے سائے کو میرے سر پر قائم رکھے۔

طالب جوہری

چند مصادر

تفسیر مجمع البیان	طبرسی	وسائل الشیعہ	محمد بن حسن حر عاملی
تفسیر روح الجنان	ابوالفتوح رازی	خصال	شیخ صدوق ابن بابویہ قمی
تفسیر قمی	علی بن ابراہیم	آراء حول القرآن	سید علی فانی
تفسیر لوامع التنزیل	ابوالقاسم لاہوری	رسالۂ علم کلام	محمد مصطفیٰ جوہر
تفسیر صافی	محسن فیض کاشانی	مطالب السؤل	شافعی
تفسیر نور الثقلین	عبد علی حویزی	ارجح المطالب	امرتسری
تفسیر البرہان	سید ہاشم بحرانی	ینابیع المودۃ	قندوزی
تفسیر انوار القرآن	راحت حسین گوپالپوری	اسوۃ الرسول	اولاد حیدر فوق بلگرامی
تفسیر منہج البیان	سید ابن حسن رضوی	مفاتیح الجنان	عباس قمی
تفسیر سورۂ حمد	محمد حسین اصفہانی	اصول کافی	محمد بن یعقوب کلینی
تفسیر المنار	محمد رشید رضا	خدا نمبر	ماہنامہ نگار
تفسیر در منثور	جلال الدین سیوطی	وید اور قرآن	لکشمن
تفسیر البیان	سید ابوالقاسم خوئی	بحار الانوار	محمد باقر مجلسی
تفسیر البصائر	یعقوب الدین رستگاری	مناقب مرتضوی	محمد صالح کشفی
تفسیر المیزان	محمد حسین طباطبائی		

سُورۂ فاتحہ

سُورَةُ الفَاتِحَة مَكِيَّة وَهِيَ سَبعُ آيَات

① سُورہ

سُورہ کا لفظ لغت عرب میں مقام، درجہ، مرتبہ، شرف، علامت، بلند دیوار وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی آیات کے مخصوص مجموعوں کو سورہ کیوں کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں جس میں ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ قرآن کا قاری جیسے جیسے سُورتوں کی تلاوت کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس کے مقام اور مرتبہ میں بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ مجامع احادیث[1] میں فضل القرآن کے نام سے جو ابواب قائم کیے گئے ہیں ان میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرنے والی روایات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ لفظ حصار البلد یعنی تحفظ کے لیے شہر کے چاروں طرف کھینچی جانے والی بلند دیوار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا اس کے یہ معنی بھی بہت مناسب ہیں کہ سُورہ سے مراد قرآن کے وہ ابواب و فصول ہیں جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع ہو کر دوسرے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے قبل ختم ہوتے ہیں۔ اس صُورتِ حال سے فقط سورۂ براءت اپنے آغاز میں مستثنٰی ہے۔

لہٰذا پروردگار نے خود آیات کی ایک وحدت یا آیات کے مخصوص مجموعے کا نام سُورہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مذکور ہے۔

"وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ" البقرہ ۲۳،
"اور ہم نے جو اپنے عبد پر نازل کیا ہے اگر تم اس کے بارے میں شبہ میں ہو تو اس کے مثل ایک سُورہ لے آؤ۔"

---

[1] کافی اور بحار الانوار وغیرہ۔

اسی طرح سورۂ ہود آیت نمبر ۱۳ میں ہے:

"قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ"

"کہہ دو کہ دس سُورے جھوٹے بنا کر اس کے مثل لے آؤ"

اسی طرح سورہ نور کے آغاز میں ہے۔

"سُورَةٌ أَنزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا"

"ہم نے اس سورہ کو نازل کیا اور فرض کیا"

② الفاتحہ

اس سُورہ کا مشہور نام فاتحہ ہے۔ یہ سورہ اپنی بلندی شان اور جامعیت مضامین کے سبب بکثرت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً فاتحۃ الکتاب، سُورۃ الحمد، سُورۃ الشکر، سُورۃ الدُعا، سُورۃ المناجات، سُورۃ الکنز، سُورۃ الشفاء، اُم القرآن، اُم الکتاب، اساس القرآن، سُورۃ تفویض، سُورہ رقیہ، سُورۃ الکافی، سُورۃ الوافی وغیرہ۔ ہم اس کے اسمارِ مبارکہ میں سے چند ناموں کی تشریح سپردِ قلم کرتے ہیں۔

سُورۃ کے مُختلف اسماء

① فاتحۃ الکتاب

اس سُورہ کا یہ نام کثرت سے روایات میں مروی ہوا ہے۔ جیسا کہ مشہور روایت ہے کہ "لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ"۔ "فاتحۃ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی" اس سُورہ سے قرآن کا افتتاح کیا گیا ہے گویا یہ سُورہ پوری کتاب کے لیے دیباچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ پہلا مکمل نازل ہونے والا سُورہ ہے۔

② اُم القرآن، اُم الکتاب

اُم کے معنی اصل کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ سُورۂ مبارکہ پورے قرآن کی اصل ہے، جو مطالب و مفاہیم پورے قرآن میں تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں۔ وہ اس مختصر سے سُورہ میں تلخیص کے ساتھ موجود ہیں۔

③ اساس القرآن

یہ سورہ قرآن مجید کی بنیاد ہے۔ یعنی قرآن کے افکار عالیہ کی پوری عمارت اسی سورہ پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا یہ مفہوم بھی نکل سکتا ہے کہ اگر قرآن سے اس سورہ کو نکال لیا جائے تو پوری عمارت منہدم ہو جائے گی۔

④ سبع المثانی

سات مکرر یا سات دہرائی جانے والی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ: اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (حجر ۸۷) پیغمبرؐ! ہم نے تمھیں سات دہرائی جانے والی آیتیں اور عظیم قرآن دیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ کے شرف کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے کہ اللہ نے پورے قرآن کے مقابلہ میں اس کا الگ تذکرہ کیا ہے۔ اس سورۂ کو مثانی کے لفظ سے کیوں یاد کیا گیا؟ اس کا جواب مختلف اذہان نے مختلف طریقے سے دیا ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس میں بعض الفاظ مکرر استعمال ہوئے ہیں: اللہ، رحمان، رحیم، ایاک، صراط۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سورہ میں دو بالمقابل کیفیات کا تذکرہ ہے: ربوبیت و عبودیت، ہدایت و ضلالت، نعمت و غضب وغیرہ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ چونکہ نمازوں میں مکرر پڑھا جانے والا سورہ ہے۔ اس لیے سبع مثانی کے نام سے یاد کیا گیا۔[1] چوتھا قول ان لوگوں کا ہے جو اس سورے کے دو مرتبہ (مکہ و مدینہ میں) نزول کے قائل ہیں۔

⑤ کافی

یہ سورہ دوسرے سوروں سے کفایت کرتا ہے، لیکن دوسرے سورے اس سے مستغنی نہیں ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

" اُمُّ الْقُرْاٰنِ عِوَضٌ عَنْ غَیْرِھَا وَلَیْسَ غَیْرُھَا عِوَضًا "

"سورۂ فاتحہ دوسرے سوروں کا بدلہ ہے۔ لیکن دوسرے سورے اس کا بدلہ نہیں ہیں"۔[2]

❋

---

[1] اس توجیہ کے لیے تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام کی نص بھی موجود ہے۔ بحوالہ نور الثقلین۔

[2] تفسیر لوامع التنزیل جلد اول۔ تفسیر منہج الصادقین جلد اول۔

⑥ سُورۃ الحمد والشکر

یہ سورہ خدا کی جامع ترین تعریف پر مشتمل ہے اور اس میں شکرِ منعم کے فطری جذبے کو اقرارِ عبادت کے ذریعہ اُجاگر کیا گیا ہے۔

⑦ سُورۃ الدعاء

یہ سُورہ انسان کی دعاؤں کو اللہ کی بارگاہ تک پہنچاتا ہے اور خود ایک ایسی دُعا پر مشتمل ہے جو انسانی صلاح و فلاح کی ضامن ہے۔

سُورہ کی اہمیت

مذکورہ بالا ناموں کی روشنی میں اس سُورہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بعض مفسرین نے جو روایات نقل کی ہیں وہ اس کی اہمیت اور جامعیت پر حرفِ آخر ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں اور ان میں سے چار کتابوں کو منتخب کیا اور بقیہ سو کتابوں کا علم ان چار کتابوں (توریت و انجیل و زبور و قرآن) میں جمع کر دیا اور پھر ان چار میں سے ایک کو منتخب کیا اور باقی کتابوں کے علوم و برکات کو اس ایک کتاب میں جمع کیا اور وہ قرآن ہے اور سارے علوم و برکات اس قرآن کے مفصل سُوروں میں ہیں اور اللہ نے ان سارے سُوروں کے علوم و برکات کو فاتحۃ الکتاب میں جمع کر دیا تو جو شخص بھی فاتحۃ الکتاب کی تلاوت کرے گویا اس نے تمام آسمانی کتابوں کی تلاوت کی۔[1]

اسی سلسلے میں یہ روایت بھی لائقِ تدبر ہے۔

"رُوِیَ عَنْ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَ اِنَّہٗ قَالَ کُلُّمَا فِی الْقُرْاٰنِ فِی الْحَمْدِ وَکُلُّمَا فِی الْحَمْدِ فِی الْبَسْمَلَۃِ وَکُلُّمَا فِی الْبَسْمَلَۃِ فِی الْبَاءِ وَکُلُّمَا فِی الْبَاءِ فِی النُّقْطَۃِ وَاَنَا النُّقْطَۃُ تَحْتَ الْبَاءِ"

"امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سُورہ حمد میں ہے اور جو کچھ سُورہ حمد میں ہے وہ بسملہ میں ہے اور جو کچھ بسملہ میں ہے وہ بے میں ہے اور جو کچھ بے میں ہے وہ نقطہ میں ہے اور میں بے کے نیچے کا نقطہ ہوں"۔[2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل، تفسیر منہج الصادقین جلد اوّل۔

[2] تفسیر سُورہ حمد محمد حسین اصفہانی اور ینابیع المودۃ القندوزی۔

(۳) مکیّہ

اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے سلسلے میں مفسرین کے درمیان تین اقوال پائے جاتے ہیں مجاہد اور عطا کا خیال ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے، جبکہ قتادہ اور عبداللہ ابن عباس کی رائے میں مکی ہے اور علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو بار نازل ہوا۔ پہلی بار مکے میں اور دوسری بار مدینے میں تحویلِ قبلہ کے وقت مسجد ذوالقبلتین میں نازل ہوا۔ اس سورہ کا مکی ہونا اقرب الی الصواب ہے۔ اس لیے کہ اکثر روایات سے اس کا مکی ہونا ثابت ہوتا ہے اور مفسرین کی اکثریت بھی اس کے مکی ہونے کی قائل ہے۔ اس قول کی سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ سورۂ حجر بالاتفاق مکی سورہ ہے اور اس میں پیغمبر اکرم سے کہا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں سبع مثانی اور قرآن عظیم دیا، یعنی سورۂ فاتحہ یقینی طور پر نزولِ سورہ حجر سے قبل پیغمبرؐ کو مل چکا تھا۔ اس کے مکی ہونے کی دوسری مضبوط دلیل یہ ہے کہ حدیث نبوی میں بالصراحت یہ بات کہی گئی ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی[1] اور نماز کا وجود ابتدائے بعثت سے ثابت ہے۔ لہٰذا نہ صرف یہ کہ سورہ مکی ہے بلکہ یہ مکی زندگی کے ابتدائی عہد کا سورہ ہے۔

(۴) سبع

سورہ حمد کی آیتوں کی تعداد سات ہی ہے۔ اگرچہ ایک قول میں اس کی آیتوں کی تعداد چھ اور ایک قول میں آٹھ تبلائی گئی ہے۔ لیکن یہ اقوال شاذ اور متروک ہیں اور اس شہرت عام کے خلاف ہیں جو مسلمانوں میں ان کی تعداد کے متعلق پائی جاتی ہے مزید برآں یہ کہ سبع مثانی کے الفاظ خود اس تعداد کو معیّن کرتے ہیں جو علم خداوندی میں ہے۔

وہ لوگ جن کے نزدیک بسملہ سورۂ حمد کا جزء ہے وہ "صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے آخر تک کو ساتویں آیت میں قرار دیتے ہیں اور جن کے نزدیک بسملہ سورۂ حمد کا جزء نہیں ہے وہ "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کو ساتویں آیت قرار دیتے ہیں۔

(۵) آیات

لغت کی رُو سے آیت کے معنی نشان اور علامت کے ہیں (قاموس اور مفردات وغیرہ) اس کی جمع آیات اور آیُ ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے کہیں معجزہ کے معنی

---

[1] لَاصَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔

ہیں، کہیں نشانی کے معنی میں اور کہیں عبرت کے مفہوم میں۔ لیکن اس مقام پر آیت سے مراد قرآن مجید کے لفظوں کا ایک مخصوص مجموعہ ہے۔ جسے آیت کہا جاتا ہے اور یہی آیات مخصوص مجموعوں کی صورت میں سورہ کہلاتی ہیں، جس طرح سورہ قرآنی اصطلاح ہے۔ اِسی طرح آیت بھی قرآن ہی کی اصطلاح ہے۔ اس کا استعمال قرآن میں بکثرت ہے، مثلاً:

"مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ" (اٰل عمران: ۷)

"اس کتاب میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں۔"

کوفیوں کے قول کے مطابق آیاتِ قرآنی کی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے اور ایک مشہور قول کے مطابق چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲﴾

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳﴾

مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۴﴾

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۵﴾

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۶﴾

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ ۬ۙ

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ﴿۷﴾

ترجمہ

ابتدا اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

ساری تعریف مخصوص ہے اللہ کے لیے جو عالمین کا ربّ ہے۔

وہ رحمان و رحیم ہے۔

روزِ جزاء کا مالک ہے۔

ہم فقط تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور فقط تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے (یہ) ان لوگوں کے غیر ہیں جو (تیرے) غضب کا شکار اور گمراہ ہیں

تفسیر

بسملہ کا مفہوم

عربی زبان و ادب کے قواعد میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ اختصار کی غرض سے دو یا زیادہ الفاظ پر مشتمل مجموعہ سے ایک لفظ بنا لیا جاتا ہے اس کا نام نحت ہے اس لفظ کے معنی پتھر کو تراشنے کے ہیں گویا چند لفظوں کے مجموعہ سے ایک لفظ تراش لینا۔ زبان عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں " لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" سے حَوْقَلَہ اور "حیّ علی الصّلوٰۃ" سے حیعلہ بنایا گیا اب یہ دونوں جملے انھیں ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اسی طرح "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے "بَسْمَلَہ" بنایا گیا ہے۔

الفاظِ بسملہ

اس آیت میں پانچ کلمات ہیں جن میں سے عرب کے قواعد نحویہ کے مطابق باء (ب) حرف ہے اور اسم، اللہ، رحمٰن، رحیم اسم ہیں۔ اس میں لفظ اسم کو چھوڑ کر "اللہ" کے لیے جو اسمار استعمال ہوئے ہیں اس میں اللہ، ذات واجب کا اسم ذات ہے اور رحمان و رحیم اس کے اسمائے صفات میں سے ہیں۔

بائے بسملہ

باء، حروف جارہ میں سے ہے اور علماء لغت کے قول کے مطابق چودہ معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ جن میں سے اہم تعدیہ، تاکید، مصاحبت، ظرفیت اور استعانت وغیرہ ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ میں مصاحبت اور استعانت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اگر "بائے" مصاحبت مراد لی جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا "اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمان و رحیم ہے" اور اگر "بائے" استعانت مراد لی جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا۔ "اللہ کے نام کی مدد سے جو رحمان و رحیم ہے۔"

عربی نحو کے قاعدہ کی رُو سے اس باء سے قبل ایک متعلق (فعل یا شبہ فعل) کی ضرورت ہے۔ لہذا اس جُملہ سے قبل کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ "اللہ کے نام کے ساتھ" تو اس جُملے پر سکوت صحیح نہیں ہوگا بلکہ فوری طور پر سننے والے کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اللہ کے نام کے ساتھ؟ اسی طرح اگر کہا جائے "اللہ کے نام کی مدد سے" تو اس جُملے کے متعلق بھی یہی سوال پیدا ہوگا کہ کیا اللہ کے نام کی مدد سے؟ اس کیا کے جواب میں جو کچھ بھی کہا جائے گا وہ اس جملہ کا متعلق ہوگا مثلاً میں سوتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، میں جاگتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ وغیرہ

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس آیت میں باء سے قبل کون سا فعل محذوف ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کو سُورۂ فاتحہ سے قبل بلافصل تسلیم کیا جائے تو فعل محذوف وہی ہوگا جو سورۂ علق کی پہلی آیت میں مذکور ہے یعنی اِقْرَءْ (پڑھو)۔ یہی پڑھو بسملہ میں یوں محذوف مانا جائے گا کہ اے پیغمبرؐ! پڑھو اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمان و رحیم ہے۔ اور اگر کوئی اس جُملہ کی تلاوت کرے تو محذوف اَقْرَءُ قرار پائے گا۔ یعنی میں پڑھ رہا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، بعض مفسرین نے قرأت کے بجائے قول کو محذوف قرار دیا ہے۔ یعنی خدا کی نسبت سے قُلْ (کہو) اور بندے کی نسبت سے اقول (میں کہہ رہا ہوں) کو محذوف مانا ہے۔ مفسرین کی یہ نکتہ آفرینی بادی النظر میں بہت برمحل اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جُملہ کے مفہوم و مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اگر قرارت یا قول کو محذوف مانا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ میں پڑھتا ہوں / کہتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اور اس جُملے کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ میں یہ جملہ "اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے" پڑھتا ہوں۔ اور اس مفہوم پر پھر وہی اعتراض ہوگا۔ کہ کیا اللہ کے نام سے؟

دوسرا قول جو نسبتاً بہتر ہے وہ یہ ہے کہ "باء" سے قبل "اَسْتَعِیْنُ" کو محذوف مانا جائے۔ یعنی میں مدد چاہتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے اس پر بعض جلیل القدر علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ استعانت اللہ سے ہوتی ہے اللہ کے اسم سے نہیں ہوتی۔ اور اس کی دلیل "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" ہے اس میں استعانت کا حصر اللہ کی ذات میں کیا گیا ہے [1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کے علاوہ بھی اپنے امور میں دوسروں سے استعانت کرتا ہے اور اسی پر معاشرہ کا کاروبار چل رہا ہے اور قرآن مجید میں بھی مختلف مقامات پر اس کی صراحت موجود ہے۔

"وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ"

"استعانت کرو صبر اور صلات کے ساتھ"

(بقرۃ : ۴۵)

---

[1] البیان خوئی دام ظلہ صفحہ ۴۳۲۔

جب کہ صبر اور صلات ، دونوں غیر اللہ ہیں ۔

" وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى " سورۃ المائدۃ ۔۲

" اور نیکی اور تقوے میں تم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو"۔ [۱]

اس آیت میں بڑی صراحت سے یہ فرمایا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان سے استعانت کرسکتا ہے ۔ اب ہم " اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " کے ذیل میں یہ بحث کریں گے ۔ کہ جب غیر اللہ سے استعانت درست ہے تو پھر اس آیت میں حصر کا مفہوم کیا ہے ؟ لیکن اتنا طے ہے کہ غیر اللہ سے استعانت ہوسکتی ہے ۔ لہٰذا اسم خدا سے استعانت بدرجۂ اولیٰ روا ہوگی ۔

تیسرا قول جو بہت بہتر ہے وہ یہ کہ " اَبْتَدِءُ " کو محذوف مانا جائے یعنی میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے ۔ اس لیے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :

" كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرٌ " [۲]

اگر کوئی کام بسم اللہ سے شروع نہ ہو تو وہ اتمام تک نہیں پہنچے گا ۔ [۳]

لہٰذا شروع کو محذوف ماننا قولِ رسولِ خدا کی رُوح کے عین مطابق ہوگا ۔

اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر اللہ اس جُملہ میں متعلق کو محذوف نہ فرماتا اور بیان فرما دیتا تو اس پوری بحث ہی کی ضرورت نہ رہتی اور بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ۔ تو اس مقام پر حذف متعلق کا سبب کیا ہے ؟ بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مذکورہ روایت کے مفہوم کی روایات اسلام کے ذخیرۂ احادیث میں کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ اپنے کام کا آغاز اللہ کے نام کے ساتھ کرنا چاہیے ۔ انسان کے کام متنوع ہیں ۔ رنگا رنگ ہیں اور لا تعداد ہیں اور ہر کام سے پہلے یہ جُملہ ضروری ہے ۔ تو جب تعداد ہی معیّن نہیں ہے تو بسملہ سے پہلے کسی مخصوص فعل کو کیسے محذوف مانا جاسکتا ہے ۔ لہٰذا اس آیۂ مبارکہ کی جامعیت اور ہمہ گیری کا تقاضا ہی یہ تھا کہ فعل کو حذف کیا جائے تاکہ انسان جو بھی کام کر رہا ہو ۔ اُسی کو اُس وقت بسم اللہ کا متعلق قرار دے لے ۔

اس پوری بحث کی تلخیص یہ ہے کہ ہر کام کی ابتدا میں اللہ کا نام ضروری ہے ۔ تو اپنے کام

---

[۱] البیان خوئی دام ظلہٗ صفحہ ۴۷۸ ۔

[۲] تفسیر صافی جلد اوّل صفحہ ۴۲ ۔

[۳] یہ دُنیا عالم اسباب ہے ، دنیا کا ہر عمل بہ فرمان الٰہی علاقۂ تسبیب کے زیر نگیں ہے ۔ اس لیے بسملہ کے بغیر بھی کام ہوجاتے ہیں ۔ اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ بسملہ کے بغیر اللہ کی توفیقات ان کاموں میں شامل حال نہیں ہوں گی ۔

کو اللہ کے کسی بھی نام سے آغاز کیا جائے یا بسملہ ہی مقصود بالذات ہے؟ ہر سورہ کی ابتداء میں بسملہ کا رکھنا خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ نے اپنے ہر سورہ کی ابتدا اس جملے سے فرمائی ہے، تو انسان کو بدرجہ اولیٰ اپنے اقوال و افعال کو اس جملہ سے شروع کرنا چاہیے، اس کی تائید پیغمبر اکرمؐ کی مذکورہ روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے مطلق اسم اللہ کے لیے نہیں فرمایا بلکہ بسم اللہ کے لیے فرمایا ہے۔ اسی بات کو امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی بیان فرمایا ہے۔

"اِنَّ الْبَسْمَلَۃَ کَلِمَۃٌ مُقَدَّسَۃٌ مُخْتَصَّۃٌ بِشِعَارِ الْمُسْلِمِیْنَ یَسْتَفْتِحُوْنَ بِهَا اَقْوَالَهُمْ وَاَعْمَالَهُمْ"[1]

"بسملہ ایک مقدس کلمہ ہے، جو مسلمانوں کے لیے مخصوص شعار ہے وہ اپنے اقوال و افعال کا آغاز اس کلمہ سے کرتے ہیں۔"

حرفِ آخر

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ بسملہ میں اسم ذات کے بعد رحمٰن و رحیم کی صفات رکھی گئی ہیں۔ جب کہ اس قادرِ مطلق کو نہ الفاظ کی کمی ہے اور نہ صفات کی۔ لیکن اس نے اپنے ذاتی نام کے بعد جو پہلی صفات استعمال کیں ان کا تعلق رحمت سے ہے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ اللہ کا اپنی مخلوقات سے جو رشتہ ہے وہ قہاریت و جباریت کا نہیں۔ بلکہ رحمت کا رشتہ ہے اور پھر ہر کام کے آغاز میں اسے پڑھنے کا حکم دے کر یہ بتلایا کہ عمل کرنا انسان کا کام ہے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کام کو انجام تک پہنچائے۔

قول و عمل میں تناسب ضروری ہے۔ اگر کوئی کہے کہ آج میں بہت خوش ہوں اور چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے تو یہ خلافِ عقل ہوگا۔ جشنِ مسرت پر نوحہ پڑھنا اور مجلسِ غم میں خوشی کے شادیانے بجانا عقلاء کی نگاہ میں قابلِ مذمت ہوگا۔ اس فطری اصول کی روشنی میں انسان اگر کسی برے عمل کا آغاز "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے کرے تو یہ خدا اور خلقِ خدا دونوں کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ عمل قرار پائے گا۔ اسی لیے ہر کام کے آغاز میں بسملہ کا حکم دیا کہ اگر بسملہ کہنے کی عادت پڑ گئی تو انسان عملِ بد سے خود بخود بچتا چلا جائے گا۔

❁

---

[1] البصائر جلد اول صفحہ ۲۲۵

اِسم

اسم کے معنی نام یا صفت کے ہیں (قاموس)۔ نام سے کبھی ذات مراد ہوتی ہے اور کبھی لفظ مراد ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت دو جملوں سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

(الف) زید آیا تھا۔

(ب) زید ایک خوبصورت نام ہے۔

پہلے جملے میں زید کی ذات مراد ہے اور دوسرے جملے میں زید کا لفظ مراد ہے۔ اب بسم اللہ میں یہ طے کرنا ہے کہ یہاں نام سے مراد لفظ اللہ ہے یا ذاتِ خداوندی ہے؟ نام وسیلہ ہے ذات کی پہچان کا۔ اگر کسی کو پکارا جائے یا کسی کا تذکرہ کیا جائے تو نام ہی اس کا وسیلہ ہوگا جب کہ ذات مراد ہوگی۔ لہٰذا یہاں اللہ کے نام سے اس کی ذات مراد لی گئی ہے۔ لیکن اس مقام پر تفصیل بہت مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر جملہ میں محذوف یہ ہو کہ میں شروع کرتا ہوں تو پھر یہاں خدا کا نام ہی مراد ہوگا اور جملہ یوں مکمل ہوگا کہ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اگر یہ مراد لیا جائے کہ "میں شروع کرتا ہوں اللہ کی ذات سے" تو اللہ کی ذات سے شروع کرنے کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور اگر جملے میں یہ محذوف ہو کہ "میں مدد چاہتا ہوں" تو پھر جملہ یوں ہوگا کہ میں مدد چاہتا ہوں اللہ کی ذات سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اگرچہ اس جملۂ ثانی میں بھی مجازاً اللہ کے نام سے استعانت اور استمداد کا مفہوم بعید از فہم نہیں ہے اس لیے کہ اسماء الٰہی کی جلالتِ قدر اور ان سے توسّل کی اہمیت اپنے مقام پر ثابت ہے۔

اسی لیے اقوالِ ائمہ معصومینؑ میں کہیں اللہ کی ذات اور کہیں اللہ کا نام مراد لیا گیا ہے۔ توحید صدوق کی ایک طویل روایت کے آغاز میں امام حسن عسکری علیہ السلام کا قول موجود ہے:

"اَیْ اَسْتَعِیْنُ عَلٰی اُمُوْرِیْ کُلِّهَا بِاللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَحِقُّ الْعِبَادَةَ اِلَّا لَهٗ"

"میں اپنے سارے امور میں اللہ کی مدد چاہتا ہوں۔ جس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔

اسی روایت میں آگے چل کر امیر المومنینؑ کا قول نقل ہوا ہے:

"اَیْ اَسْتَعِیْنُ عَلٰی هٰذَا الْاَمْرِ بِاللّٰهِ الَّذِیْ لَا تَحِقُّ الْعِبَادَةُ لِغَیْرِهٖ"[1]

"میں اپنے اس کام میں مدد چاہتا ہوں اللہ سے کہ اس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔"

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۱۲۔

لیکن امیرالمومنینؑ کی ایک دوسری روایت میں ذات کی جگہ اسم کا تذکرہ ہے :

عَنْ عَلِيٍّ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَقْرَءَ اَوْ يَعْمَلَ عَمَلاً فَيَقُولُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَیْ بِهٰذَا الْاِسْمِ اَعْمَلُ هٰذَا الْعَمَلَ فَكُلُّ عَمَلٍ يَعْمَلُ يَبْدَءُ فِيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَاِنَّهٗ مُبَارَكٌ لَهٗ فِيْهِ۔[1]"

"امیرالمومنینؑ نے فرمایا جب بندہ پڑھنے یا کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے تو بسملہ کہے یعنی میں یہ کام اس نام کی مدد سے کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ ہر وہ عمل جس کی ابتدا بسملہ سے ہو وہ مبارک ہوگا۔"

اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں ذات نہیں۔ بلکہ بسملہ کا اللہ خود مقصود بالذات ہے یہ روایت اسمائے الٰہی کی اہمیت پر روشن ترین دلیل ہے۔

اسمائے الٰہی کی اہمیّت

کہا جاتا ہے کہ سارے نام برابر ہیں، ان میں اچھا اور بُرا نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذات کا اثر نام پر بھی پڑتا ہے۔ محمدؐ اس لیے پسندیدہ نام ہے کہ اس کے پس منظر میں ایک پسندیدہ اور محبوب ذات ہے اور ابولہب اس لیے ناپسندیدہ نام ہے کہ اس کے پس منظر میں ایک ناپسندیدہ اور ملعون ذات ہے یعنی نام ذات سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ اللہ کے ناموں نے اس ذاتِ اقدس و گرامی سے کسبِ فیض کیا اور وہ اتنے طاہر ہوگئے کہ نجس ہاتھ انھیں چھو نہیں سکتے، اور ان کی بلندیٔ شان کا عالم یہ ہے کہ دُعائے مشلول کا آغاز اس جملے سے ہے۔

" اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاِسْمِكَ "

"بارِ الہا! میں تیرے نام کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں"

اسی طرح دُعائے سِمات کا آغاز ان جملوں سے ہوا ہے۔

" اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاِسْمِكَ الْعَظِيْمِ الْاَعْظَمِ الْاَعَزِّ الْاَجَلِّ الْاَكْرَمِ الَّذِیْ اِذَا دُعِيْتَ بِهٖ عَلٰی مَغَالِقِ اَبْوَابِ السَّمَاءِ لِلْفَتْحِ بِالرَّحْمَةِ انْفَتَحَتْ وَاِذَا دُعِيْتَ بِهٖ عَلٰی مَضَائِقِ اَبْوَابِ الْاَرْضِ لِلْفَرَجِ انْفَرَجَتْ وَاِذَا دُعِيْتَ بِهٖ عَلَی الْعُسْرِ لِلْيُسْرِ

---

[1] تفسیر برہان۔

تَيَسَّرَتْ وَاِذَا دُعِيْتَ بِهٖ عَلَى الْاَمْوَاتِ لِلنُّشُوْرِ انْتَشَرَتْ وَاِذَا دُعِيْتَ بِهٖ عَلٰى كَشْفِ الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ انْكَشَفَتْ"۔[1]

"پروردگارا تیرے عظیم نام کا واسطہ جو اعظم ہے عزت والا ہے جلالت والا ہے۔ کرم والا ہے اگر اس کے ذریعے تجھے پکارا جائے کہ آسمانوں کے بند دروازے کھول دے تو تیری رحمت سے کھل جائیں گے اور اگر اس کے ذریعے تجھے پکارا جائے کہ زمین کی تنگی کو کشادہ کر دے تو کشادہ ہو جائے گی اور اگر اسکے ذریعے تجھے پکارا جائے تو دشواری آسان ہو جائے گی اور اگر اسکے ذریعے سے تجھے پکارا جائے کہ مردوں کو زندہ کر دے تو مردے زندہ ہو جائیں گے اور اسکے ذریعے سے تجھے پکارا جائے کہ مصائب و شدائد ختم کر دے تو مصائب و شدائد ختم ہو جائیں گے۔

ان اسمائے گرامی کی اہمیت اس لیے ہے کہ ذاتِ خداوندی اتنی مجرد ہے کہ اُسے اسمار کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے شناخت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان دعائیہ جملوں میں اسی بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ خود ان ناموں میں اتنی طہارت اور برکت ہے کہ انسان کے سارے بگڑے کام ان کے وسیلے سے انجام پا سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

" تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ"۔[2]

اسم و مسمّٰی

اسلامی عقائد کی تاریخ میں فکر کی بعض نو آبادیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے اسم کو عین مسمّٰی قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نام ہی ذات ہے۔ اسم اور مسمّٰی یعنی نام اور ذات میں مغایرت نہیں ہے یہ نظریہ اتنا غیر منطقی ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا تجربہ ہے کہ ایسے نام ہوتے ہیں، جن کے مقابل کوئی ذات نہیں ہوتی اور ایسی ذات ہوتی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا بعد کو رکھا جاتا ہے۔ اللہ کے نام اور اس کی ذات کے بارے میں یہ حدیث قول فیصل ہے۔

عَنْ هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ اِنَّهٗ سَأَلَ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ وَ اِشْتِقَاقِهَا اَللّٰهُ مِمَّا هُوَ مُشْتَقٌّ فَقَالَ يَا هِشَامُ اَللّٰهُ مُشْتَقٌّ مِنْ اَلَهَ وَاَلَهُ يَقْتَضِیْ مَالُوْهًا وَالْاِسْمُ غَيْرُ الْمُسَمّٰى فَمَنْ عَبَدَ الْاِسْمَ دُوْنَ الْمَعْنٰى فَقَدْ كَفَرَ وَلَمْ يَعْبُدْ شَيْئًا وَمَنْ عَبَدَ الْاِسْمَ

---

[1] مفاتیح الجنان۔

[2] سورہ رحمان ۷۸۔

وَالْمَعْنٰی فَقَدْ اَشْرَكَ وَعَبَدَ اثْنَيْنِ وَمَنْ عَبَدَ الْمَعْنٰی دُوْنَ الْاِسْمِ فَذَاكَ التَّوْحِيْدُ اَفَهِمْتَ يَا هِشَامُ قَالَ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ لِلّٰهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ اِسْمًا فَلَوْ كَانَ الْاِسْمُ هُوَ الْمُسَمّٰى لَكَانَ كُلُّ اِسْمٍ مِنْهَا اِلٰهًا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ مَعْنًی يَدُلُّ عَلَيْهِ بِهٰذِهِ الْاَسْمَاءِ وَكُلُّهَا غَيْرُهٗ يَا هِشَامُ الْخُبْزُ اِسْمٌ لِلْمَاْكُوْلِ وَالْمَاءُ اِسْمٌ لِلْمَشْرُوْبِ وَالثَّوْبُ اِسْمٌ لِلْمَلْبُوْسِ وَالنَّارُ اِسْمٌ لِلْمُحْرِقِ ۔[1]

"ہشام ابن حکم نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ اللہ کس سے مشتق ہوا؟ فرمایا اے ہشام اللہ مشتق ہے "آلَہَ" سے اور آلَہَ (عبادت) کے لیے لازم ہے کہ مالوہ (معبود) بھی ہو اور نام ذات کا غیر ہوتا ہے تو جس نے ذات کو چھوڑ کر نام کی عبادت کی تو اس نے کفر کیا اور کچھ بھی عبادت نہ کی اور جس نے نام اور ذات دونوں کی عبادت کی اس نے شرک کیا اور دو کی عبادت کی۔ اور جس نے نام کو چھوڑ کر ذات کی عبادت کی تو یہ توحید ہے۔ اے ہشام سمجھ گئے؟ ہشام نے کہا۔ میں نے عرض کی کچھ اور فرمایئے تو فرمایا کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں تو اگر نام ہی ذات ہے تو ہر نام ایک معبود ہوگا، لیکن اللہ ایک ذات ہے جس پر یہ نام دلالت کرتے ہیں اور وہ سب نام ذات کے غیر ہیں۔ اے ہشام روٹی کھانے کی ایک چیز کا نام ہے پانی ایک مشروب کا نام ہے۔ کپڑا ایک ملبوس کا نام ہے اور آگ ایک جلانے والی شے کا نام ہے۔

اللہ

اللہ کائنات کا عظیم ترین لفظ ہے جو کائنات کے عظیم ترین وجود کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ خدا کا ذاتی نام ہے اور اس کے معنی ہیں وہ ذات واجب الوجود جو تمام صفات کمال کی جامع ہے۔

یہ لفظ قرآن مجید میں دو ہزار سات سو دو مقامات پر استعمال ہوا ہے[2]

اس لفظ سے براہ راست خداوند عالم کی کسی خاص صفت کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا، لیکن چونکہ یہ اس کا نام ہے اس لیے بہ دلالت التزامی اس کی ساری صفتوں پر دلالت کرتا ہے۔

مفسرین اور ماہرین لغت کے درمیان اس لفظ کے سلسلے میں یہ بحث بھی دلچسپی کا سبب رہی ہے

---

[1] اصول کافی کتاب التوحید باب معانی الاسماء و اشتقاقہا حدیث دوم۔ [2] المعجم المفہرس۔

کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ کیا یہ لفظ کسی دوسرے لفظ سے مشتق ہوا ہے (یعنی نکالا گیا ہے) یا علمِ غیر مشتق ہے (یعنی ایسا نام ہے جو کسی لفظ سے نہیں نکالا گیا) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی اصل الٰہ ہے اور الٰہ ایسا اسمِ نکرہ ہے جو ہر معبود کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے معرفہ بنانے کے لیے اس پر الف ولام کا اضافہ کیا گیا اور یہ "اَلْاِلٰہ" بنا۔ الٰہ کا ہمزہ (الف) حذف ہوا اور لامِ تخصیص کا لام الٰہ میں ادغام ہوا اور یوں اللہ بنا۔ صاحب قاموس کی نگاہ میں صحیح تر یہ ہے کہ یہ علَمِ غیر مُشتق ہے۔ ایک جرمن دانشور کا خیال ہے کہ عربی کا الٰہ اور عبرانی کا ایل دونوں بہت قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ ایک مغربی محقق کا خیال ہے کہ "اللہ" وید کے لفظ ارہت سے بنا ہے۔

عہدِ جاہلیت کے بُت پرست معاشرے میں بھی یہ لفظ عربوں میں خدا کے لیے رائج تھا۔ عرب اپنی دستاویزوں کا آغاز "بسمك اللّٰھم" سے کرتے تھے۔ [1]

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب پیغمبر اکرمؐ نے صلحنامہ لکھواتے ہُوئے علیؑ ابن ابی طالب سے کہا کہ بسملہ لکھو تو مشرکین کے نمائندے سہیل نے کہا کہ ہم اس جُملہ کو نہیں جانتے تم "بسمك اللّٰھم" لکھو۔ [2] "اللّٰھم" درحقیقت "یا اللہ" ہے لبید ابن ربیعہ معلقات کا ایک شاعر ہے۔ اس نے اپنے ایک قصیدے میں کہا ؎

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہِ بَاطِلٌ وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَامَحَالَۃَ زَائِلٌ

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے علاوہ ہر شے باطل ہے اور ہر نعمت کو یقیناً فنا ہو جانا ہے

اس شعر کے متعلق پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اگر کسی شاعر نے صحیح ترین بات کہی ہے تو وہ یہی لبید کی بات ہے اس کے علاوہ قرآن نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشرکین خدا کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے تھے "اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کو کس نے خلق کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے"

(سورۂ روم: ۲۵)

جن لوگوں نے لفظ اللہ کو غیر مشتق، جامد اور مُرتجَل قرار دیا ہے۔ ان کے پاس قابلِ ذکر دلیلیں موجود ہیں۔ لیکن ان اقوال کے مقابل ایک ایسی نصِ صریح موجود ہے جو اس لفظ کے مشتق ہونے کو بیان کرتی ہے۔

"عَنْ هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ اِنَّهٗ سَأَلَ اَبَا عَبْدِاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ
عَنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ وَاشْتِقَاقِهَا اللّٰهُ مِمَّا هُوَمُشْتَقٌّ؟ فَقَالَ يَا هِشَامُ

---

[1] تفسیر ابو الفتوح رازی جلد اول صفحہ ۳۶۔

[2] اسوۃ الرسول جلد سوم صفحہ ۱۶ بحوالۂ ابن اثیر۔

اللہُ مُشْتَقٌّ مِنْ اَلَہَ وَاَلَہَ یَقْتَضِیْ مَالُوْھًا[۱]

"ہشام نے امام صادقؑ سے خدا کے اسماء و اشتقاق کے بارے میں سوال کیا پوچھا کہ اللہ کس سے نکالا گیا؟ فرمایا اے ہشام اَلَہَ (عبادت کیا) سے نکالا گیا اور اَلَہَ (عبادت) کا مقتضا یہ ہے کہ کوئی معبود ہو۔

ماضی بعید میں

محققین کا خیال ہے، کہ ارامی اور کنعانی زبانوں میں خدا کو ایل کہا جاتا تھا، ایل کا لفظ تاریخ انسانیت میں پہلی بار حضرت آدم علیہ السلام کے عہد میں نظر آتا ہے کہ یہ لفظ قابیل و ہابیل دونوں کے ناموں کا آخری جز ہے۔ پھر یہ نام چلتا ہوا حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچا کہ ان کا ایک نام اسرائیل بھی ہے، جن کی نسل آج تک بنی اسرائیل کہلاتی ہے، پھر یہ لفظ سفر کرتا ہوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں داخل ہوا۔ جب عیسائیوں کے خیال کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو دار کی بلندیوں تک پہنچا یا گیا۔ تو اس وقت کی کیفیت تحریر کرتے ہوئے انجیل متّی باب ۲۷ فقرات ۴۶۔۴۷ میں یہ تحریر کیا گیا "اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا" ایلی ایلی لِمَا شَبَقْتَنِیْ؟ جس کا ترجمہ ہے "اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟"

اسی جملے کو انجیل مرقس باب ۱۵ فقرہ ۳۴ میں یوں نقل کیا گیا۔" اور تیسرے پہر یسوع بڑی آواز سے چلایا کہ اُلوہی اُلوہی لِمَا شَبَقْتَنِیْ؟ جس کا ترجمہ ہے، "اے میرے خدا اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ اگر مذکورہ بالا دونوں جملوں سے یائے متکلم نکال لی جائے تو خدا کے اسماء گرامی ایل اور الوہ باقی بچیں گے۔ عہد ماضی کا بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ شہر بابل (جس کے کھنڈر عراق میں شہر حلّہ کے قریب پائے جاتے ہیں) درحقیقت باب ایل تھا، جس کا مطلب ہے خدا کا دروازہ، یہ لفظ آج تک فرشتوں کے ناموں کے آخری جز کے طور پر موجود ہے۔ مثلاً جبرئیل اور میکائیل ......

محققین ہی کے خیال میں خدا کو عبرانی میں ایلوہ یا الوہ کہا جاتا تھا جس کی جمع ایلوہم یا الوہیم ہے۔ اور یہ جمع کثرت آلہہ پر نہیں بلکہ عظمت اللہ پر دلیل ہے۔ کلدانی زبان میں اسے الاہا کہا جاتا تھا۔ سریانی زبان میں لاہا یا الوہو کہا جاتا تھا۔ اشوریوں کی زبان میں اسے الہ کہا جاتا تھا۔

محققین کے تبلائے ہوئے ناموں کے علاوہ خدا کا ایک نام یہوواہ یا یہوہ ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک رائج رہا ہے۔ جیسا کہ توریت کے مندرجہ ذیل دو

---

[۱] اصول کافی کتاب التوحید باب معانی الاسماء و اشتقاقہا حدیث دوم۔

حوالوں سے واضح ہوتا ہے۔

(۱) کتاب پیدائش باب ۲۲ فقرہ ۱۴ اور ابراہیم نے اس مقام کا نام یہوداہ یری رکھا۔ چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا۔

(۲) کتاب خروج باب ۱۶ فقرات ۲،۳ پھر خدا نے موسیٰ سے کہا، میں خداوند ہوں اور میں ابرہام اور اصحاق اور یعقوب کو خدائے قادر مطلق طور پر دکھائی دیا۔ لیکن اپنے یہوداہ نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔ توریت ہی میں خدا کا ایک نام ہو نظر آتا ہے۔ کتاب گنتی باب ۳ فقرات ۲،۴ میں ہارون کے بیٹوں میں ایک کا نام ابیہو ہے۔ علماء نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ خدا میرا باپ ہے۔ اس نام میں ابی کا مطلب ہے میرا باپ ہے۔ اس لیے ہُو، خدا کے معنی میں ہے۔ اسی توریت کے عربی ترجمہ میں خدا کا ایک نام "اہیہ" بھی ہے (کتاب خروج) اس کے علاوہ زبور باب ۶۸ فقرہ چار میں یوں تحریر ہے کہ خدا کے لیے گاؤ۔ اس کے نام کی مدح سرائی کرو۔ صحرا کے سوار کے لیے شاہراہ تیار کرو اس کا نام "یاہ" ہے۔

رگ وید میں ایشور کے ناموں میں سے ایک نام "الا" ہے۔ جو سنسکرت میں ال دہاتو سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں پوجا کرنا۔ رگ وید میں ایک پورا سوکت الا کے نام پر ہے [۱] جینیوں کے معبود کا نام ارہنت دیو ہے اور وہ ارہہ لفظ سے بنا ہے۔ [۲]

ایرانیوں کی قدیم زبان میں خدا کو آہورا اور مزدا کہتے تھے جو ساسانیوں کے عہد تک آکر آہرمزد بن گیا۔ اسی عہد میں خدا کے لفظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے یہ لفظ ختو سے تبدیل ہو کر بنا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں خود بخود۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ایرانیوں کی زبان میں لفظ اللہ کے ترجمہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

یہ ایک انتہائی سرسری جائزہ تھا۔ ان ناموں کا جو مختلف عہدوں میں خدا کے لیے (غالبًا بہ طور اسم ذات) استعمال ہوتے رہے۔ ان ناموں میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے سات ناموں میں الف اور لام مشترک ہیں۔ اور پانچ ناموں میں الف، لام اور ہائے ہوز مشترک ہیں اور کچھ نام الف ہائے ہوز، واؤ اور یار کے مرکبات پر مشتمل ہیں، مثلاً یہوہ، ہُو، اہیہ اور یاہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سامی زبانوں میں بنیادی طور پر اللہ کے نام کے دو مادے پائے جاتے ہیں ایک "ا-ل+ہ سے مرکب ہے اور دوسرے کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ا+ہ+و+ی میں سے کن تین سے

---

[۱] گیتا اور قرآن پنڈت سندرلال صفحہ ۱۰۹ بحوالہ خدا نمبر نگار صفحہ ۱۴۹۔

[۲] وید اور قرآن لکھشمن حصہ دوم صفحہ ۴۔

مرکب ہے۔ البتہ اگر ھُو، کا اسم خدا ہونا حتمی طور پر ثابت ہو جائے تو باقی ناموں کو اسی ھُوَ کی مختلف شکلیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ عربی میں بھی اللہ کا ایک نام ھُوَ ہے۔ جیسا کہ دُعائے مشلول میں مذکور ہے۔ یہ نام ذاتِ باری کے مجرد محض ہونے کی علامت ہے۔

اس بحث سے یہ بات بہ خوبی سمجھ میں آتی ہے کہ ہر عہد میں دیوی دیوتاؤں اور بتوں سے ہٹ کر ایک خدا کا تصور ذہنِ انسانی میں موجود رہا، اور انسان کے ذہنی سفر کے کسی موڑ پر وہ اس سے الگ نہیں ہوا۔ مزید براں اگر لفظ ایل کو آدم علیہ السلام کے زمانے سے تسلیم کیا جائے تو پھر اس لفظ کو کسی خاص زبان سے منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ درست بات یہ ہوگی کہ نسلِ آدم جب زمین پر پھیلی اور قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہوئی تو بہ طور میراثِ آدم یہ لفظ بھی ہر قوم اور ہر قبیلے میں موجود رہا البتہ اقوام و قبائل کی مخصوص ضروریات اور جغرافیائی حالات کے فطری جبر کے طور پر جب آدمؑ کی زبان مختلف زبانوں کی شکل میں ڈھلنے لگی تو اس لفظ میں بھی مقامی طور پر تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں۔

مذکورہ بالا پوری فہرست میں لفظ اللہ کے مادہ (ا + ل + لا) میں مشترک بہت سے الفاظ ہیں۔ لیکن خود لفظ "اللّٰہ" نہیں ہے۔ یہ لفظ اسلام محمدی سے قبل پہلی مرتبہ حضرت نوحؑ کی زبان مبارک سے سنا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے:-

"وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (ھود - ۴۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ نوحؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس کا چلنا اور رُکنا اللہ کے نام سے ہے۔"

اور دوسری مرتبہ اس وقت نظر آیا، جب سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو خط لکھا اور اس میں تحریر فرمایا کہ:

"بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۙ أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ۔

(نمل - ۳۰ - ۳۱)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مجھ سے سرکشی نہ کرو اور تابعدار بن کر میرے پاس آ جاؤ۔"

عہدِ آدم میں پیدا ہونے والی زبان جب اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر عہد نوح میں بھرپور جوان ہوئی تو لفظ ایل کی طفولیت لفظِ اللہ کی جوانی میں تبدیل ہو گئی اور اب اس لفظ کی جوانی ابدالآباد تک یونہی قائم و دائم رہے گی۔

یہ بحث اس نام کے سلسلے میں تھی جو سامی زبانوں یعنی عربی، سریانی، عبرانی، فنیقی، آشوری اور بابلی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ لیکن آریائی زبانوں کے مذکورہ ناموں میں نہ کوئی مشابہت نظر آتی ہے

اور نہ مادے کا اشتراک نظر آتا ہے۔

اللہ کا مفہوم

پچھلے صفحات میں اللہ کا مفہوم یہ بتلایا گیا کہ یہ اس وجود مقدس کا ذاتی نام ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی واجب الوجود ذات ہے جو تمام صفات کمال کی جامع ہے۔ اس جملے کی تشریح یہ ہے کہ اس ذات مقدسہ کے اوصاف جلیلہ و جمیلہ کے لاتعداد مظاہر ہیں اس نے کبھی خلاقیت کا اظہار کیا کبھی رزاقیت کا اظہار کیا، کبھی اس کی صفت رحمانیت کا ظہور ہوا اور کبھی قہاریت کا، وہ کبھی غضب کو ظاہر کرتا ہے کبھی احسان کو، مخلوقات کے مختلف حالات کے سبب اُس کے اوصاف کے مختلف مظاہر سامنے آتے رہے۔ اب اگر اس کی قدرت کے رُخ سے اس کا ذکر ہوگا۔ تو اسے قادر کہا جائے گا۔ رحمت کے پہلو سے ذکر ہوگا تو وہ رحمان کہلائے گا۔ اس کے غضب کا تذکرہ ہوگا تو اسے قہار کہا جائے گا۔ اب اگر اس کے اوصاف کے سارے رُخ ایک ہی لفظ سے بیان کرنا مقصود ہوں تو اسے اللہ کہا جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ہر نام سے ایک صفت کا اظہار ہوتا ہے اور لفظ "اللہ" کسی مخصوص صفت کے بجائے ساری کی ساری صفات کا اظہار کرتا ہے۔ [1]

اس اسم گرامی کی یہی وہ آفاقیت ہے۔ جس کے سبب امیرالمومنینؑ نے اسے اسم اعظم قرار دیا۔ توحید صدوق کی ایک طویل حدیث میں آپ نے کسی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

"اِنَّ قَوْلَكَ اللّٰهُ اَعْظَمُ اِسْمٍ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ الْاِسْمُ الَّذِيْ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُسَمّٰى بِهٖ غَيْرُ اللّٰهِ وَلَمْ يَتَسَمَّ بِهٖ مَخْلُوْقٌ فَقَالَ الرَّجُلُ فَمَا تَفْسِيْرُ قَوْلِ اللّٰهِ قَالَ هُوَ الَّذِيْ يَتَأَلَّهُ اِلَيْهِ عِنْدَ الْحَوَائِجِ وَالشَّدَائِدِ كُلُّ مَخْلُوْقٍ عِنْدَ انْقِطَاعِ الرَّجَاءِ مِنْ جَمِيْعِ مَنْ دُوْنِهٖ وَتَقَطُّعِ الْاَسْبَابِ مِنْ كُلِّ مَنْ سِوَاهُ ــــــــــــــ

فَقُوْلُوْا عِنْدَ افْتِتَاحِ كُلِّ اَمْرٍ صَغِيْرٍ اَوْ عَظِيْمٍ

---

[1] یہ مفہوم اس آیۂ مبارکہ سے ماخوذ ہے (وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا
"اور سارے اسمائے حسنیٰ (اچھی صفات) اللہ کے لیے ہیں تو تم اسے انھیں صفات کے ساتھ پکارو"
(اعراف - ۱۸۰)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَيْ اَسْتَعِيْنُ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَا تَحِقُّ الْعِبَادَةُ لِغَيْرِهِ الْمُغِيْثِ اِذَا اسْتُغِيْثَ وَالْمُجِيْبِ اِذَا دُعِيَ اَلرَّحْمٰنِ الَّذِيْ يَرْحَمُ بِبَسْطِ الرِّزْقِ عَلَيْنَا الرَّحِيْمُ بِنَا فِيْ اَدْيَانِنَا وَدُنْيَانَا وَآخِرَتِنَا۔ [1]

تمہارا قول "اللہ" تو یہ اس کے اسماء میں اسم اعظم ہے اور اس نام سے غیر خدا کو موسوم نہیں کیا جاتا اور نہ پہلے کسی مخلوق کے لیے یہ استعمال ہوا۔ اس شخص نے پوچھا کہ اللہ کی تفسیر کیا ہے؟ فرمایا یہ وہ ذات ہے کہ انسان حاجتوں اور پریشانیوں کے وقت اس عالم میں اس کی پناہ لیتا ہے۔ جب کہ ماسوی اللہ سے ساری امیدیں ٹوٹ جائیں اور اسباب وعلل کے سارے سلسلے ختم ہو جائیں۔

تو تم لوگ ہر چھوٹے بڑے کام کے آغاز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہا کرو یعنی میں اپنے اس کام میں مدد چاہتا ہوں اللہ سے کہ اس کے علاوہ کوئی اور مستحق عبادت نہیں ہے۔ اگر فریاد کی جائے تو دادرس ہے اگر دعا مانگی جائے تو وہ قبول کرتا ہے، وہ رحمٰن ہے۔ ہم پر رزق کو کشادہ کرتا ہے اور وہ ہمارے دین، دنیا اور آخرت میں رحیم ہے

ایک حقیقت

دین کے الہامی تصور کی رُو سے یہ کائنات اللہ کی ایسی تخلیق ہے جو مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ منصۂ شہود پر آئی ہے اور اس کے خالق نے تخلیق سے قبل ہی اس کائنات کی ایک ایک شے کے لیے ایک غرضِ خلقت معین فرمائی ہوئی ہے۔ وہ نیلگوں آسمان ہوں یا گھومتی ہوئی زمین، ٹمٹماتے ہوئے ستارے ہوں یا سر بفلک پہاڑ، سنکتی ہوئی نسیم ہو یا برستے ہوئے بادل، جمادات ہوں یا نباتات حیوانات ہوں یا انسان یہ سب کے سب اس کائنات کے پورے نظام کے پُرزے ہیں ہر ایک کے لیے کام بھی معین ہے اور ان کے کام کی مدت بھی معین ہے (قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام تقدیر ہے۔)

اس کائنات میں انسان کی غرضِ خلقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے اور اس کی

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۲۔

مرضی کے مطابق زندگی گزارے (قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام عبادت و عقائد ہے) اور پھر اس اللہ کی بارگاہ میں اس دن حاضر ہو جائے جس کا نام "یوم الدین" (روزِ جزاء) ہے اور اپنے اعمال کی جزاء یا سزا پائے، چونکہ اس کی مرضی اس وقت تک نہیں معلوم ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اس کا اظہار نہ کرے۔ لہٰذا اس نے اپنی مرضی کے اظہار کے لیے اس کائنات میں نظامِ ہدایت کو جاری کیا۔

یہ نظامِ ہدایت خود اس کی اپنی صفتِ عدل کا تقاضا تھا۔ اس نظامِ ہدایت کی تکمیل کے لیے اس نے ہادی بھیجے جو انسانوں کے قدم بقدم ہر عقلی گزرگاہ پر اور تاریخِ انسانی کے ہر موڑ پر عقلِ انسانی کی ہدایت کے فریضے کو انجام دیتے رہے۔

ان ہادیوں کا وجود تاریخِ انسانی کے آغاز ہی سے ضروری ہے اور تاریخِ انسانی کے اختتام تک مسلسل ہے ورنہ بصورتِ دیگر ماقبلِ ہدایت اور مابعدِ ہدایت کا انسان قیامت کے دن یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا، کہ ہمارے پاس ہادی نہیں آئے تھے۔ اس لیے ہم پر جزاء و سزا کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا نقطۂ نظر کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ عرصۂ وجود میں قدم رکھنے والا پہلا انسان خود ہدایت یافتہ ہو اور آنے والے دوسرے انسانوں کے لیے ہادی ہو۔ لہٰذا دین کے الہامی تصور کی رُو سے خدا کا تصور اپنی پوری معنویت کے ساتھ اس انسان کے ذہن میں موجود تھا جو اس زمین کا انسانِ اوّل تھا۔ اس نے آیندہ نسلوں میں اس تصور کی میراث چھوڑی اور زمانہ کی چیرہ دستیوں نے مختلف قبیلوں اور قوموں میں مقامی جغرافیائی حالات کے تحت اس تصور کی شکل بگاڑی اور نت نئے دیوی دیوتا اور گوناگوں طریقہ ہائے عبادت کو رائج کیا۔ یہی سبب ہے کہ ویران جزیروں میں سنسان اور ناقابلِ عبور صحراؤں میں اور غیر آباد گھنے جنگلوں کے حاشیوں پر بسنے والی قومیں بھی تہذیب و تمدن اور علم و آگہی سے دُور رہنے کے باوجود خدا کا ایک نامکمل اور غیر جامع تصور رکھتی ہیں۔

ایک افسانوی کردار

نظریۂ ارتقاء کے لازمی نتیجے کے طور پر بعض اربابِ فہم و دانش کا یہ خیال ہے کہ دین انسان کی اپنی ایجاد ہے اور خدا ایک ایسا افسانوی کردار ہے۔ جسے انسان کی اپنی ضرورتوں نے تخلیق کیا ہے۔ انسان اپنے عہدِ طفولیت میں دین اور خدا کے تصور سے یکسر عاری تھا، لیکن آہستہ آہستہ تجربات و حوادث نے اسے یہ سبق سکھلایا کہ ان چیزوں کی عبادت کرنی چاہیئے جن سے اسے نفع یا نقصان پہنچ سکتا ہے اور یہ سبق دفعِ ضرر اور جلبِ منفعت کے فطری قاعدے پر مبنی تھا۔ اس لیے کہ ہر انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ نقصانات

سے بچنا چاہتا ہے اور منفعتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اسی قاعدے نے سب سے پہلے انسان سے عناصر کی عبادت کروائی، پھر اسلاف پرستی ارواح پرستی اور حیوان پرستی وغیرہ کے راستوں سے گزرتا ہوا انسان ایک ان دیکھے خدا کے تصور تک پہنچا اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گیا گویا یہ توحید پرستی انسان کے اسی قدیم جذبۂ پرستش کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

اس نظریہ کا پوری دیانت داری کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پوری عمارت کی بنیاد ظن وتخمین اور گمان وقیاس پر قائم ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں ذہنِ انسانی کا سفر شرک سے توحید کی طرف ہوا ہے جب کہ دین کے الہامی تصور کا خیال یہ ہے کہ انسانیت کا یہ سفر توحید کی صراطِ مستقیم سے شروع ہوا تھا اور پھر گم گشتگی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر شرک کے میدانوں کی طرف نکل گیا۔

نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں کے قیاس کے مطابق جب انسان درختوں اور غاروں میں بسا کرتا تھا اور شکار کے گوشت سے اپنے شکم کی آگ بجھایا کرتا تھا۔ اس وقت انسان کے ذہن میں کسی ایسی ذات کا تصور نہیں تھا۔ جس کی عبادت کی جا سکے۔ وہ خالص غیر دینی مخلوق تھا۔ لیکن جیسے ہی دو بڑے خطرات سے دوچار ہوا یعنی

"موسموں کا بے قابو ہونا"

"ناگہانی آفات"

اور جب یہ دونوں خطرے مجسم ہو کر اس کے سامنے آئے تو اس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ ان سے بچاؤ کا طریقہ کیا ہے اور یہیں اسے یہ خیال آیا کہ وہ چیزیں جو اسے نقصان پہنچا رہی ہیں انھیں عبادت کے ذریعے اپنے آپ سے راضی رکھا جائے اور یوں پہاڑ، دریا وغیرہ پوجے جانے لگے[1] اس سے قبل یا فوری بعد کے عہد میں مرنے والوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور انسان یہ سوچنے لگا کہ یہ مر کر کہاں جاتے ہیں اور پھر جب مرنے والے خوابوں میں نظر آنے لگے اور ان سے گفتگو ہونے لگی تو حیات بعد الموت کا تصور پیدا ہوا اور آباء پرستی کی بنیاد پڑی۔ پھر انسانی توہمات نے اپنے جذبۂ پرستش کی تسکین کے لیے عبادت کے نئے نئے آہنگ وضع کرنے شروع کیے اور جبین نیاز مختلف آستانے تشکیل دیتی رہی۔ مظاہر طبیعت شمس وقمر، آب و آتش، باد و خاک، کوہ و درخت، حیوانات اور یہاں تک کہ جنسی

---

[1] بعض مفکرین نے پرستش کا سبب ملکیت زمین کو قرار دیا ہے اور بعض کی نگاہ میں مذہب اور پرستش کا سبب طبیعی حوادث سے لاعلمی ہے۔

اعضا بھی پوجے جانے لگے، تمدن بنتے اور بگڑتے رہے، جبینوں کے سنگ در بدلتے رہے۔ لیکن جذبۂ پرستش خوب سے خوب تر کی تلاش میں آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ توحید کے حرم تک پہنچ گیا اور وہیں تھک کر بیٹھ گیا۔ اور اب تازہ دم ہو کر اپنی ابتدائی حالت یعنی غیر دینی سماج کی طرف واپس جا رہا ہے۔

یہ ایک انتہائی مختصر سا خاکہ ہے اس نظریہ کا جسے ادیان عالم کی تاریخ مرتب کرنے والوں اور تقابلی مطالعہ کرنے والوں نے ہزارہا صفحات پر اپنے اپنے زاویہ ہائے فکر اور نقطہ ہائے نظر سے تحریر کیا ہے۔ اس نظریہ کے مآخذ مندرجہ ذیل ہیں؛

(۱) ماقبل طبیعت اور ماورائے طبیعت: یہ دونوں موضوعات اس عہد سے انسان کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ جب سے انسان نے سوچنے کا عمل باقاعدگی سے شروع کیا۔ کبھی اس سوچ کے لیے انسان کو حقائق کا خام مواد ملتا رہا اور کبھی اسے فقط اپنے اشہب خیال پر تکیہ کرنا پڑا۔ اس سوچ کے نتیجے میں جو مختلف ردعمل پیدا ہوئے اور ان کے مختلف نتائج سامنے آئے وہ نظریات کی صورت میں مرتب ہوتے رہے۔ اس نظریہ کا پہلا ماخذ یہی سوچ ہے۔

(۲) تبلیغ، سیاحت اور انسانیات کے مطالعہ کے شوقین جب اُن متروک اور نظر انداز زمینوں تک پہنچے جہاں ابھی تہذیب و تمدن کے قدم نہیں پہنچ پائے تھے تو وہاں انھوں نے چراگاہوں کی تلاش میں پھرنے والے قبائل کو دیکھا، صحراؤں اور ریگستانوں کے درمیان آباد اقوام کا مشاہدہ کیا وحشی اور نیم وحشی نسلوں کے رسم و رواج اور عادات و اطوار کا مطالعہ کیا اسی ضمن میں ان کے مذاہب اور معتقدات بھی سامنے آئے اور یوں قدیم نسلوں کی باقیات نے قدیم نظریات کی تاریخ مرتب کروا دی یہ اس نظریہ کا دوسرا ماخذ ہے

(۳) اس نظریہ کا تیسرا اور آخری ماخذ آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے نکلے ہوئے کتبے، دیواروں اور غاروں کی تصویریں، مٹی کی تختیاں، مُردہ زبانوں کی نامانوس تحریریں اور ظروف وغیرہ ہیں، جن پر قیاسات کی دیواریں اُٹھائی گئیں اور اپنے ذہنی مناظر میں رنگ بھرے گئے۔

اس نظریہ کا پہلا ماخذ انسان کی سوچ ہے۔ سوچ کی سرعتِ سیر اور جادو نمائی سے انکار ممکن نہیں وہ صدیوں کی راہ ثانیوں میں طے کرتی ہے۔ ان تاریک وادیوں میں اُتر جاتی ہے جہاں جاتے ہوئے جذبوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن ان سارے فضائل کے باوجود زیر نظر مسئلے میں سوچ کا کردار یہ رہا ہے ہے کہ اس نے وہم و گمان کی پتنگیں اڑائی ہیں۔ اور اس کا طرز بیان کچھ یوں رہا کہ جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں ہوگا تو اس نے یوں سوچا ہوگا۔ اور پھر یہ عمل کیا ہوگا۔ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے یہ بات آئی ہوگی تو اس کا ردعمل یہ ہوا ہوگا۔ یعنی اس نظریہ کی ایک تمامی عمارت "ہوگا" (احتمال)

کی ریت پر کھڑی ہے۔ اس کے پاس اپنے دعاوی کے لیے نہ کوئی حتمی یا غیر حتمی دلیل ہے نہ کوئی یقینی یا غیر یقینی دستاویز۔

اب ہم دوسرے ماخذ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحشی اور غیر متمدن اقوام و قبائل کے جو بھی مذہبی معتقدات یا رسوم عبادت ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ فی الوقت ایسا ہو رہا ہے اور ماضی سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے لیکن کس ماضی سے؟ ماضیٔ قریب سے یا ماضیٔ بعید سے؟ اس کا جواب نہیں معلوم اور ان اقوام و قبائل میں جو شرک و توہمات پائے جاتے ہیں۔ وہ غیر مذہبی ذہن کو تبدیل کرکے آئے ہیں؟ یا عقیدۂ توحید کو مسخ کرکے آئے ہیں؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ نہیں معلوم۔

اب جہاں تک آثارِ قدیمہ کا مسئلہ ہے تو یہ حقیقت ہے کہ یہ آثارِ قدیم اور مٹے ہوئے تمدنوں کی تاریخ ہیں۔ یہ آثار اپنے عہد کے قومی اور شخصی مزاج، عادات و اطوار، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، مذہبی معتقدات مذہبی اور سماجی تہواروں اور زندگی کو برتنے کے گوناگوں طریقوں کی مکمل یا نیم مکمل عکاسی کرتے ہیں، لیکن ان کے مطالعہ کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ جس عہد اور جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عہد میں اس قوم کے مذہب کی ساخت یہ تھی اور عبادت کا ڈھب ایسا تھا۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ:

کیا اس بات کا امکان نہیں کہ اُس عہد سے قبل وہی قوم اس ڈھب سے عبادت نہ کرتی ہو اور ان چیزوں کو قابلِ پرستش نہ سمجھتی ہو جنھیں اس مخصوص عہد میں قابلِ پرستش سمجھ رہی ہے؟

کیا حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی آثارِ قدیمہ میں دریافت ہونے والی تہذیب ہی اس قوم کی اوّلین تہذیب ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس سے قبل کوئی اور تہذیب رہی ہو جو صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئی ہو یا مٹی کے تودوں کے نیچے پڑی ہوئی انتظار کر رہی ہو کہ کوئی مہم جو اسے کھود کر نکالے اور تاریخ کی لڑی میں پرو دے؟

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ پائے جانے والے قدیم ترین آثار سے بھی زیادہ قدیم آثار خانہ بدوشانہ زندگی اور غیر مستقل طرزِ سکونت کے سبب محفوظ ہی نہ رہے ہوں؟ —— یہ اور ایسے ہی بہت سے سوال تشنۂ جواب ہیں۔

ان سارے سوالات و تنقیحات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اگر ہم مذکورہ دعاوی پر دوبارہ نگاہ ڈالیں تو اُن کی تصدیق یا تردید کے لیے دو مرحلوں میں بحث کی جاسکتی ہے۔

(۱) ابتدائی تہذیبوں میں توحید کا تصور تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو شرک سے قبل تھا۔ یا شرک کے بعد پیدا ہوا؟ اس بحث سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر ابتدائی تہذیبوں میں تصورِ توحید مل جائے تو اس

نظریہ کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ عمارت استوار ہی اس بنیاد پر ہے کہ انسان شرک سے توحید کی طرف آیا ہے نہ کہ توحید سے شرک کی طرف۔

(۲) کوئی خدا واقعتاً ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو پھر اس نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام اور اپنی توحید پہنچانے کا بندوبست کیا یا نہیں؟

مرحلہ اوّل

قدیم نسلوں اور قدیم تہذیبوں کا جو مطالعہ کیا گیا ہے ان میں مقامی دیویوں اور دیوتاؤں کے علاوہ ایک اعلیٰ تر، غیر مادی اور خلاق کل ہستی کا تصور ملتا ہے۔

میکسیکو کے قدیم باشندے قدیم ترین انسانوں کی باقیات ہیں۔ ان کے بہت سے دیوتاؤں میں ایک خدا ایوونا ویلونا ہے جو سب کا خالق ہے اور سب پر محیط ہے اور سب باپوں کا باپ ہے [1]

ابتدا میں جب کچھ نہ تھا ویلونا نے خیال کیا اور اس کے خیال کرنے کے بعد اس خیال سے نمو کی طاقت پیدا ہوئی اور وہ طاقت بڑھتے بڑھتے وسیع فضا کی صورت میں تبدیل ہو گئی، اور اس سے خدا کی روشنی جلوہ گر ہوئی اور فضا سکڑنے لگی جس سے چاند سورج اور ستارے خلق ہوئے۔

آسٹریلیا کے جنگلی باشندے ایک ایسی اعلیٰ ہستی کے قائل ہیں جسے سب کا باپ کہتے ہیں مختلف قبیلوں میں وہ ہستی مختلف ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔ اس کا ایک نام بائی بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں بنانے والا۔ اس نے آسمان، زمین، انسان جانور اور درخت وغیرہ پیدا کیے اور انسانوں کو مختلف صنعتیں سکھلائیں۔ وہی انسانوں کی پرورش کرتا ہے۔[2]

میلانیشیا کے لوگ ایک خاص ہستی کے قائل ہیں جسے مانا کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی پُر اسرار قوت ہے جو انسانوں حیوانوں درختوں بلکہ کائنات میں ہر جگہ مخفی ہے اور ساری کامیابیاں وغیرہ اس غیر مرئی قوت کے سبب ہوتی ہیں۔

گولڈ کوسٹ کے لوگوں میں بہت ہی قدیم زمانے سے "نیونگ مو" کو خدائے بزرگ و برتر مانا جاتا ہے جس نے دُنیا کو بنایا اور اس پر حکومت کرتا ہے۔ جو قدیم ہے جو سب کو دیکھتا ہے۔ ہر

---

[1]، [2] بعض محققین کا خیال ہے کہ اللہ کے لیے باپ کا تصور قبیلے کے بزرگ سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ اس لیے بے اصل ہے کہ توالد و تناسل کا عمل انسان کے علاوہ دوسرے جانوروں میں بھی ہے لیکن ان کے درمیان کسی بزرگ کا تصور نہیں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں میں قبیلے کے بزرگ کا تصور اللہ کے تصور ربوبیت سے اخذ کیا گیا ہے۔

ایک اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

ابو (IBO) دُنیا کی بنانے والی ایک ہستی کے قائل ہیں جس کا نام تشو کو (TSHAKO) ہے وہ غیر مرئی ہے اور کبھی نہیں سوتا وہ سب کچھ سُنتا ہے لیکن انھیں کے قریب جاتا ہے جو اس کے پاس آتے ہیں۔

افریقہ کا ایک مشہور وحشی قبیلہ زولو ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ایک غیر مرئی خدا ہے جو ساری دُنیا کا باپ ہے۔ اور اس کا نام "اُنکو لُنکلو" ہے۔ افریقہ ہی کا ایک دوسرا مشہور قبیلہ بنٹو خدا کو تمام دُنیا کا پیدا کرنے والا اور نسلِ انسانی کا باپ قرار دیتا ہے۔ اس کی زبان میں خدا کا نام "نزامبی" ہے۔

بابل کے آثار قدیمہ کے ایک کتبے پر تحریر ہے، "اے دائمی بادشاہ، تمام مخلوق کے مالک، تو میرا خالق ہے۔ اے بادشاہ تیرے رحم کے مطابق اے آقا جو تو سب پر رحم کرنے والا ہے، تیری وسیع بادشاہت رحم کرنے والی رحم والی ہو۔ اپنی الوہیت کی عبادت کی محبت میرے دل میں گاڑ دے اور جو کچھ تجھے اچھا معلوم دیتا ہے وہ مجھے دے، کیونکہ تو ہی ہے جس نے میری زندگی کو اس رنگ میں ڈھالا ہے۔"

سامی نسل کی ایک شاخ فنیقی کہلاتی ہے۔ یہ فنیقی لوگ تقریباً بائیس سو سال قبل مسیح سواحل بحرین سے ہجرت کر کے بحر متوسط کے مشرقی ساحل پر کوہ لبنان کے دامن میں آباد ہوئے۔ یہ لوگ موحد تھے۔ ایک ایسی اعلیٰ تر طاقت کے قائل تھے جو سب کی خالق ہے وہ اسے مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ ایل (اعلیٰ) رمن (بلند) بعل (آقا) ایلیون (انتہائی بلند) بیل سامن (آسمان کا مالک) وغیرہ وہ اس طاقت کو ماورائے مادہ مانتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ساری مادی اشیاء کا خالق وہی ہے۔ بعد کو ان کے اس عقیدے میں دیوی دیوتا بھی داخل ہو گئے۔

جارج والی سن نے اپنی کتاب مصر قدیم میں مصری شاعروں کی بعض عبارتوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل مصر ایک علیم کل ہستی کے قائل تھے۔ ایسی ہستی جس کی کوئی مورتی نہیں بنائی جا سکتی وہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا وہ لامکان ہے۔ کسی مندر میں اس کی شکل نہیں اتاری جا سکتی وہ کسی خاص مکان میں محدود نہیں کیا جا سکتا، وہ بے نام ہے وہ اوتار کا تجسم اختیار نہیں کرتا اس کی مورتی بنانا حماقت ہے۔ وہ ازل سے ہے، وہ لازوال ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا دیوتا نہیں ہے، کسی ماں نے اس کو جنا نہیں ہے کسی باپ نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ وہی وحدہٗ لاشریک ہے وہ قائم بالذات ہے تمام دیوی اور

دیوتاؤں کا پیدا کنندہ وہی ہے۔ [1]

یہ اور ایسی ہی بہت سی مثالوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وحشی، نیم وحشی اور غیر متمدن اقوام دنیا میں اور قدیم تہذیبوں میں دیویوں اور دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ایک ایسے انتہائی طاقتور خدا کا تصور بھی رہا ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے۔ جس کی قدرت ساری کائنات پر محیط ہے اور اُسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔

اب اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ان سارے مقامات پر لوگ دیوتاؤں سے ہو کر خدا تک پہنچے ہیں۔ یا خدا کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور پھر بعد میں دیوتا تراشنے لگے؟ بظاہر اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن ایک طریقہ ہے جو اس سوال کا جواب بآسانی دے سکتا ہے اور اس طریقے کا نام ہے زمانے کا عمل۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر ماضی پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر زمانے میں نئے نئے شہر آباد ہوتے رہے۔ پرشکوہ اور بلند و بالا عمارات، عالی شان محلات اور حویلیاں کشادہ اور فراخ قلعے بنائے جاتے رہے، جن میں لوگ رہتے بستے تھے اور جن کے دَر و دیوار انسانی سانسوں کی خوشبو سے معمور رہتے تھے۔ پھر جب نسلوں پر نسلیں گزریں اور صدیاں بیت گئیں تو وہ عمارتیں وہ حویلیاں زمیں بوس ہوگئیں وہ قلعے وہ محلات کھنڈر بن گئے اور جو تعمیرات ان میں سے باقی بچیں وہ بھی کسی مصرف میں نہیں لائی گئیں، بلکہ بطور آثار قدیمہ محفوظ کرلی گئیں اور آنے والی نسلوں نے اپنے استعمال کے لیے ان کی جگہ دوسری عمارتیں بنالیں یہ ہے زمانے کا عمل۔

کسی بھی عہد کی کسی زبان کا شاعر یا خطیب، یا نثر نگار اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بہترین جدید الفاظ اور جدید ترکیبوں کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن گزرتے ہوئے زمانے کا عمل کچھ دنوں بعد ان الفاظ اور ان ترکیبوں کو متروک قرار دے دیتا ہے اور وہ لغت کی کتابوں میں بطور آثار قدیمہ محفوظ ہوجاتے ہیں اور نئے الفاظ و تراکیب ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

روزمرہ کی زندگی کا تجربہ ہے کہ معاشرہ میں متعارف ہونے والی ہر نئی شے بڑی جاذب اور پرکشش ہوتی ہے اور لوگ پورے ذوق و شوق کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جبکہ پرانی شے متروک ہوجاتی ہے اور فرسودہ قرار پاتی ہے۔

---

[1] سلّم الاسلام حصہ ہفتم صفحہ ۴۹۵۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر اقوام و قبائل کی بھیڑ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر علاقوں میں دیوتاؤں کے نام کے سکّے چل رہے ہیں، ان کی پوجا ہو رہی ہے ان کی فضیلتوں کے گیت گائے جا رہے ہیں اور ایک خلقت ہے جو ان کی طرف امڈی چلی جا رہی ہے۔ دوسری طرف اللہ ایک فرسودہ خالق کُل اور ایک متروک اعلیٰ تر طاقت ہے جسے بطور آثارِ قدیمہ اپنے شہرِ عقائد میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان خدا سے دیوتاؤں کی طرف آیا ہے۔ دیوتاؤں سے خدا کی طرف نہیں گیا۔

مرحلہ دوم

کیا اس کائنات میں واقعاً کوئی خدا پایا جاتا ہے؟ وہ لوگ جو خدا کے وجُود کے قائل ہیں وہ اس کے وجود کے لیے مختلف طریقوں سے دلیلیں قائم کرتے ہیں، جو علم کلام اور الٰہیات و فلسفہ کی کتابوں میں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں وہ دلیلیں اصطلاحات کی پیچیدگیوں میں اس طرح جکڑی ہوئی ہیں کہ انھیں غیر فنی طریقے سے بیان کرنا چنداں آسان بھی نہیں ہے۔ اس لیے فلاسفہ و متکلمین کی اصطلاحات سے بچتے ہُوئے ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خُدا کے وجود پر کوئی حتمی دلیل ہے یا نہیں؟

دلیل نظم

سنسان اور غیر آباد پہاڑی علاقوں میں پتھروں اور چٹانوں کا ناہموار سلسلہ پھیلا ہُوا ملتا ہے۔ جو لاکھوں سال سے اپنی اسی ساخت پر قائم ہے اس میں انسانی محنت اور کاوش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی سنسان علاقے میں کچھ پتھر انتہائی ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے پر چنے ہُوئے رکھے ہوں اور بہ ظاہر اُن کا ایک مقصد بھی سمجھ میں آتا ہو۔ مثلاً کسی مخصوص راستے کی نشاندہی کرنا۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خود بخود اس طرح مرتب ہو گئے ہیں اور یہی ان کی فطری اور خلقی ترتیب ہے؟ لاکھوں افراد مل کر بھی اس بات کو باور کرانے کی کوشش کریں تو ذہن انسانی اور عقل عام اسے قبول نہیں کریں گے۔

اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ کار کے پرزوں کا مادہ ازلی ہے اور وہ اس ازلی مادہ سے خود بخود بن گئے ہیں پھر خود بخود اپنے معین مقامات پر لگ گئے ہیں اور اس کی ٹنکی میں پٹرول خود بخود ذخیرہ ہو گیا ہے۔ یعنی یہ کار خود بخود انسانی استعمال کے قابل بن گئی ہے اور اس میں کسی انسان کی محنت یا کاوش کا کوئی دخل نہیں ہے تو احمق سے احمق انسان بھی اس بات کا مذاق اڑائے گا۔ اس لیے کہ اس کی فطرت اس سے پکار پکار کہتی رہتی ہے کہ کوئی شے کسی سبب یا علت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود ایک فلسفیانہ مکتب فکر انسانوں کو یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ سُورج چاند ستارے نظام شمسی نظام کہکشانی وغیرہ خود بخود اور یک بیک وجود میں آ گئے ہیں۔

اس بحث کا نتیجہ یہی ہے کہ اگر کسی شے میں ترتیب اور مقصدیت پائی جائے، نظم اور ضبط پایا جائے تو یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ کوئی اس کا خالق ہے اور اس نے کسی مقصد اور منصوبہ کے تحت یہ تخلیق کی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ریاضی کے دقیق ترین نظام کی بنیاد پر قائم ہے، ہر شے کمیت اور مقدار کے منطقی دائرے کے اندر ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ کی ہر حرکت اپنے دامن میں توازن اور مقصد لیے ہوئے ہے اور یہ باتیں سائنس کے مسلّمہ قوانین کی حیثیت سے سامنے آچکی ہیں، تو کائنات کا منظم اور بامقصد ہونا بتلاتا ہے کہ اس کی تخلیق و بقاء کے پس منظر میں کوئی وجود ہے، اور وہ وجود اندھا، بہرا اور اپاہج نہیں ہے بلکہ قدرت اور علم بھی رکھتا ہے ورنہ وہ نہ خلق پر قادر ہوتا اور نہ منصوبہ سازی اس کے بس کی بات ہوتی اور وہی وجود خدا ہے۔

قرآن کا طریقہ استدلال

یہ کتاب کسی خاص سطحِ فکر کے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ [۱] اور پوری انسانیت میں ہر سطحِ فکر کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر قرآن فقط دقیق فلسفیانہ مباحث کے ذریعے وجودِ خدا پر دلیلیں قائم کرتا تو اس کی افادیت ایک مخصوص طبقہ کے لیے محدود ہو کر رہ جاتی۔ جس کے دو غلط نتیجے برآمد ہوتے۔ پہلا تو یہ کہ اس کا دعوائے ہدایتِ عام غلط ہو جاتا اور دوسرا یہ کہ انسانوں کی اکثریت نہ سمجھنے کی بنا پر ہدایت سے عاری رہ جاتی۔ لہٰذا اس مسئلے کی وضاحت کے لیے قرآن نے وہ طریقہ اپنایا ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق اور ہر انسان کی سطحِ فکر سے قریب تر ہے۔ ان آیات میں نظم اور مقصدیت کے بیان کی بڑی دل کش تصویر کھینچی گئی ہے۔

"هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾"

"يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا

---

[۱] هدى للناس بقره ۱۸۵۔

"وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٤﴾

"وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" ﴿١٥﴾ [1]

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا جس میں سے تم پیتے اور درخت کی آبیاری کرتے ہو اور اس میں مولیشیوں کو چراتے ہو۔"

"اللہ اسی سے تمہارے لیے کھیت، زیتون، کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، اس میں نشانی ہے صاحبانِ فکر کے لیے۔"

"اللہ نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا، اور ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں اس میں نشانیاں ہیں صاحبانِ عقل کے لیے۔"

"اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لیے خلق کیا ہے اس کے رنگ مختلف ہیں اور اس میں نشانی ہے صاحبانِ تذکر کے لیے۔"

"وہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے زیور (کی چیز) نکالو جسے پہنتے ہو اور تم کشتی کو دیکھتے ہو جو سمندر کو پھاڑ کر چلتی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس کا فضل تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔"

"اور اسی نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔ تاکہ تمھیں لے کر کسی طرف جھک نہ جائے اور نہریں اور راستے بنائے تاکہ تم راہ پا جاؤ۔"

ان آیات کی تحریر کا مقصد خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ منطق و فلسفہ کی اصطلاح میں مصادرہ علی المطلوب ہوگا۔ یعنی جو چیز موردِ نزاع میں ہو اسی کو دلیل قرار دیا جائے۔ ایسا استدلال عقلاء کی نگاہ میں مستحسن نہیں ہوتا۔ بلکہ ان آیات کو اس لیے پیش کیا گیا کہ دلیل نظم کے عنوان سے جو عقلی اور فطری دلیل خدا کے وجود پر تحریر کی گئی ہے۔ اسے قرآن کی بھی تائید حاصل ہے۔

دلیل علیّت

اس دلیل کے ذیل میں زیرِ بحث آنے والے فلسفیانہ مسائل کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے

---

[1] نحل: ۱۰ تا ۱۵۔

خود بخود نہیں بنتی۔ ہر شے کی تخلیق کسی دوسری شے کی مرہونِ منت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ شے وجود پذیر ہوتی ہے وہ دوسری شے علّت کہلاتی ہے اور بننے والی شے معلول کہلاتی ہے۔ دُنیا کے کسی بھی انسان کے سامنے کسی بھی شے کو پیش کر کے اگر یہ کہا جائے کہ یہ خود بخود بن گئی ہے تو یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ فطرتِ انسانی اس بات کو بخوبی جانتی ہے کہ اگر کوئی شے بنی ہے تو کوئی اس کا بنانے والا ہے۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر اگر چیزوں کی علّتوں کی تلاش کرنا شروع کیا جائے تو ہر علّت کسی دوسری علّت کی معلول نظر آئے گی یعنی "الف" نے "بے" کو خلق کیا، "بے" نے "جیم" کو خلق کیا، "جیم" نے دال کو خلق کیا اور دال نے ـــــ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک ایسے مقام پر جا رُکے گا۔ جسے علّت اولیٰ یا علّت العلل کہا جاتا ہے۔ اس علّت اولیٰ کے لیے قدیم اور ازلی ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس علّت اولیٰ کو بھی اپنے وجود کے لیے ایک علّت کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ کسی مقام پر ختم نہیں ہو گا۔ اسے فلسفہ کی اصطلاح میں تسلسل کہا جاتا ہے اور مسلمان فلسفیوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس کے ابطال پر دلیلیں قائم کی ہیں۔

تسلسل کا باطل ہونا عقلِ سلیم کی رُو سے ثابت ہے۔ یہی سبب ہے کہ خدا پرست ہوں یا مادہ پرست دونوں ہی اس کائنات کی ایک علّت اولیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔ خدا پرستوں کی نگاہ میں علّتِ اُولیٰ خدا ہے اور مادہ پرستوں کی نگاہ میں مادّہ ہے۔ اگر مادّے کو کائنات کی علّت اولیٰ تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہی قدیم اور ازلی ہے تو پھر سوال یہ ہوگا کہ اگر انسان کا خالق بھی مادہ ہے تو انسان میں عقل و شعور اور ادراک وارادہ وغیرہ کہاں سے آئے اس لیے کہ یہ مادّے میں نہیں پائے جاتے اگر یہ مادّے میں پائے جاتے تو ان کا وجود مادہ کی تخلیقات کے ہر درجہ میں نظر آتا اور جمادات و نباتات وغیرہ ان سے عاری نہ ہوتے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں ایسی اضافی شے پائی جاتی ہے جو خود مادّے میں نہیں پائی جاتی۔ تو مادہ جس چیز سے تہی دست ہو وہ چیز دوسروں کو کیسے عطا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ " فَاقِدُ الشَّیْءِ لَا یُعْطِیْہِ " تہی دست دوسرے کو کچھ نہیں دے سکتا نہ جاہل کسی کو علم عطا کر سکتا ہے اور نہ مُردہ کسی کو زندگی بخش سکتا ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا، کہ وجود بخشنے والی علّت اولیٰ وہ ذات ہے جو قدیم و ازلی بھی ہے اور صاحبِ علم و قدرت بھی ہے اور وہی خدا ہے۔

حرفِ آخر

ہم اثباتِ واجب الوجود اور حدوثِ مادہ پر اگلے صفحات میں کسی مناسب موقع پر گفتگو کریں گے۔ لیکن سرِدست اس گفتگو کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو ذہنوں کے

لیے فکری غذا کا کام دے گی۔

پانی، دودھ، چائے کی پتی اور شکر ملا کر جو چائے تیار کی گئی اس کے متعلق اگر کوئی سوال کرے کہ اس چائے میں مٹھاس کہاں سے آئی؟ تو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ چائے میں شکر ملائی گئی ہے۔ اب اگر دوبارہ سوال ہو کہ شکر میں مٹھاس کہاں سے آئی؟ تو اس کے جواب کی نوعیت پہلے جواب کی نوعیت سے مختلف ہوگی۔ اور یہ کہا جائے گا کہ شکر کی مٹھاس ذاتی ہے۔

اب فرق دیکھیں کہ چائے بھی میٹھی ہے اور شکر بھی میٹھی ہے۔ لیکن چائے کی مٹھاس عرضی ہے یعنی شکر کی وجہ سے ہے اور شکر کی مٹھاس ذاتی ہے۔ یعنی کسی کیمیاوی عمل کے ذریعہ چائے سے مٹھاس نکالی جاسکتی ہے اور اس کے نکالنے کے باوجود چائے چائے ہی کہلائے گی۔ لیکن اگر شکر سے مٹھاس کو نکال لینے کی کوشش کی جائے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مٹھاس شکر کی ذاتی صفت ہے اور وہ شکر کی تعریف میں داخل ہے اور وہی مٹھاس چائے کی عرضی صفت ہے اور اسے چائے سے نکالا جاسکتا ہے وہ اس کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔

اس مثال سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ کسی بھی ذات میں اگر کوئی عرضی صفت پائی جارہی ہے تو اس کے متعلق یہ سوال ہوسکتا ہے کہ وہ اس میں کہاں سے آئی؟ اور یہ سوالات چلتے چلتے اس منزل پر رُک جائیں گے۔ جہاں صفت عرضی نہیں بلکہ ذاتی ہوگی۔ اب موجوداتِ عالم میں سے فقط انسان کو بہ طور مثال دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے نہیں تھا پھر موجود ہوا اور پھر نہیں ہوگا۔ یعنی اسے دونوں طرف سے عدم نے گھیرا ہوا ہے اور اس کے لیے وجود و عدم دونوں مساوی ہیں تو جب یہ دونوں مساوی ہیں تو پھر اس میں وجود کہاں سے آیا؟ تو اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اُسے الف نے وجود دیا تو پھر سوال ہوگا کہ الف میں وجود کہاں سے آیا؟ یہ سوال وجواب چلتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسی ہستی پر رُک جائے گا۔ جس کا وجود ذاتی ہو اسی کا نام واجب الوجود ہے اور کائنات کے سارے وجود اُسی کے فیض سے موجود ہیں اور اُسی واجب الوجود کا اسم ذات اللہ ہے۔

جب یہ طے ہوگیا کہ وجود اس کی ذاتی صفت ہے اور اس کی ذات سے وجود کو منفی نہیں کیا جا سکتا تو اب اس کے متعلق یہ سوال نہیں ہوگا کہ وہ خود کیسے آیا؟ اُسے کس نے وجود بخشا؟ اس لیے کہ جس کی ذاتی صفت وجود ہو اس کے متعلق ایسے سوالات بے معنی ہوں گے۔

رحمٰن

یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یہ نام ۱۶۹ مرتبہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے ایک سو تیرہ مرتبہ سورتوں کے بسملہ میں اور ۵۶ مرتبہ آیتوں کے درمیان۔ مفسرین اور ماہرین لغت نے اسے رحمت سے مشتق قرار دیا ہے اور اس کا معنی نعمت دینے والا اور احسان کرنے والا بیان کیا ہے۔ رحمان فعلان کے وزن پر ہے مبالغہ ہونے کے سبب اس میں وصف رحمت کی شدت پائی جاتی ہے یعنی رحمان وہ رحم کرنے والا ہے کہ جس کا رحم ایسے منتہائے کمال پر ہو جس کے بعد مزید کسی اور رحم کی گنجائش نہ رہے۔

رحیم

اللہ کا یہ نام قرآن مجید میں ، ۲۱۷ مرتبہ استعمال ہوا ہے ایک سو تیرہ مرتبہ بسملہ میں اور ایک سو چار مرتبہ آیتوں کے درمیان۔ یہ بھی رحمت ہی سے ماخوذ ہے اور فعیل کے وزن پر ہے۔ اس کا مفہوم ہے ایسا رحم کرنے والا جس کا رحم دائمی اور مسلسل ہے۔

رحمٰن ورحیم کا فرق

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ مترادف ہیں اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے ایک ساتھ استعمال کرنے کا مقصد کلام میں شکوہ اور تاکید پیدا کرنا ہے۔ اس دعوے کی تردید یا تائید سے قبل ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا قرآن ایسے مترادفات استعمال کرتا ہے جو ہر لحاظ سے متحد المعنی ہوں؟ قرآن فقط ادب کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ ایسی کتاب ہدایت جو زمان و مکان دونوں پر محیط ہے اس کے پاس نزول کی کم و بیش تئیس برس کی مدت ہے اور قیامت تک کے سارے مسائل پر گفتگو کرنی ہے۔ اس لیے اس کا ایک ایک لفظ قیمتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں قرآن کے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ ہے اور یہی سبب ہے کہ جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ ان سب کا نام بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ ایسی کتاب سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں فقط شکوہ یا تاکید مزید کے لیے لفظوں کو استعمال کیا جائے گا۔ یہ قرآن کے مقصد اصلی سے بے خبری کی دلیل ہے یا یہ کہ ایک ایسا فعل عبث قرار پائے گا۔ جس کی گنجائش حکیم کے اعمال و افعال میں نہیں ہوتی۔ البتہ اگر تاکید مزید سے معنی میں اضافہ ہو رہا ہے تو پھر یہ عمل مقتضائے بلاغت کے عین مطابق ہوگا اور عقلاء دہر کی نگاہ میں مستحسن قرار پائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رحمٰن و

ورحیم میں وہ بنیادی فرق کیا ہے جس کی بنیاد پر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کیے گئے۔ ارباب تفسیر نے بہت سی توجیہیں سپردِ قلم کی ہیں۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ رحمان ایسا رحم کرنے والا ہے جس کی رحمت ہر شے پر محیط ہو جائے اور رحیم وہ رحم کرنے والا ہے جو بار بار تکرار کے ساتھ رحم کرے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ اہلِ آسمان کے لیے رحمان ہے اور اہلِ ارض کی نسبت سے رحیم ہے۔ کسی مفسر کا خیال ہے کہ رحمٰن کے معنی زیادہ رحمت کرنے والا اور رحیم کے معنی رحمت کرنے والا ہے۔ کسی مفسر کی نگاہ میں رحمان میں یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنی رحمت میں جوش و خروش رکھتا ہے اور رحیم میں یہ مفہوم ہے کہ اس کی رحمت کو دوام حاصل ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان دونوں الفاظ کی تشریح میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

"اَلرَّحْمٰنُ اسْمٌ خَاصٌّ بِصِفَةٍ عَامَّةٍ وَالرَّحِيْمُ اِسْمٌ عَامٌّ بِصِفَةٍ خَاصَّةٍ۔" [1]

"رحمن اسم خاص ہے، صفت عام کے لیے اور رحیم اسم عام ہے۔ صفتِ خاص کے لیے۔"

اس جملہ کی تشریح یہ ہے کہ قرآن مجید سے رحمت کی دو قسمیں ثابت ہوتی ہیں پہلی رحمت عامہ اور دوسری رحمت خاصہ۔ پہلی قسم کے لیے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ:

"وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ۔"

(اعراف: ۱۵۶)

"اور میری رحمت ہر شے کو شامل ہے۔"

"رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَىْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا۔"

(مومن: ۷)

"اے ہمارے رب تیرے رحمت و علم ہر شے کو شامل ہیں۔"

اور دوسری قسم کے لیے یہ ارشاد ہے کہ

"وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔"

(بقرہ: ۱۰۵)

"اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔"

"وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔"

(احزاب: ۴۳)

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۵۔

"اللہ ایمان والوں کے لیے رحیم ہے۔"

اس کی رحمتِ عامہ کا فرد مومن اور نا اہل و اہل سب کے لیے مساوی ہے۔ اس نے سب کو خلعت وجود بخشی اور سب کی بقا کے لیے وہ سارے اسباب حیات اور اسباب معیشت فراہم کیے جن کی بنیادوں پر آج نسل انسانی اس دنیا میں پھل پھول رہی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جب سورج چمکے تو فقط مومن کے پھلوں کو پکائے اور کافر کے پھل کو چھوڑ دے اور چاندنی چاندنی سے فقط مومن کے پھلوں میں مٹھاس پیدا کرے کافر کے پھل اس سے محروم رہ جائیں یا جب بادل برسیں تو فقط ان کھیتوں پر برسیں جو صاحبان ایمان کے ہوں اور کافروں کے کھیت خشک و بے آب رہ جائیں اس کی رحمت عامہ موسیٰ صفت انسانوں اور فرعون نژاد انسانوں میں فرق نہیں کرتی اور یہی اس کی رحمانیت کا مفہوم ہے۔ لیکن قیامت کے دن جب پوری انسانیت اس کے میزان عدل پر تُلے گی تو وہاں اس کی رحمت کے مستحق فقط وہ لوگ ہوں گے جو صاحبان ایمان و تقویٰ ہوں گے۔ اسی بات کو امام صادقؑ نے فرمایا کہ اسم رحمٰن خدا کی ذات کے لیے خاص ہے کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا اور ساری مخلوق کو شامل ہے۔ اس میں مومن و کافر کے لیے تمیز نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس اسم رحیم عام ہے اس لیے کہ خدا کے علاوہ انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[1] لیکن یہ صفت اس لیے خاص ہے کہ اس کی رحیمیت قیامت کے دن فقط مومنین کے ساتھ مخصوص ہوگی اس مفہوم کی روایات تفسیر تبیان، تفسیر مجمع البیان، توحید صدوق، تفسیر علی بن ابراہیم قمی وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

رحمٰن کی جلالت

اس لفظ کی جلالتِ قدر یہ ہے کہ لفظ اللہ کے بعد معنوی اور لفظی دونوں حیثیتوں سے یہ خدا کا اہم ترین نام ہے۔ ہم اس بات پر آگے بحث کریں گے کہ اللہ اور رحمان میں کیا معنوی نسبت ہے لیکن اس لفظ کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ بسملہ میں لفظ رحمان آیت کا چوتھائی ہے

---

[1] پیغمبر اکرمؐ کے لیے ارشاد ہوا ہے "عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ" (توبہ ۱۲۸) تمہاری تکلیف اس (رسول) کو شاق گزرتی ہے، تمہاری بھلائی کا انتہائی خواہاں ہے اور مومنین کے لیے شفقت اور رحم والا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کے ساتھیوں کے لیے ارشاد ہوا ہے مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ الخ (سورہ فتح ۲۹) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے لیے سخت ہیں۔ لیکن آپس میں (رحماء) مہربان اور رحم والے ہیں۔ اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ "رحماء" رحیم ہی کی جمع ہے۔

جب کہ ترتیب آیات کی رُو سے سورۂ حمد کی تیسری آیت کا نصف ہے اور سورۂ رحمٰن میں ایک مستقل آیت ہے اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے تین مقطعات قرآنی "الٓر، حٰمٓ، نٓ" کا مجموعہ ہے۔

عہدِ قرآن سے پہلے

قرآن کا عہد شروع ہونے سے قبل بھی ہمیں یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہوا ملتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر سے کہا۔

"يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا"

(مریم: ۴۴)

"بابا شیطان کی عبادت نہ کریں۔ اس لیے کہ شیطان رحمان کا نافرمان ہے"

"يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا"

(مریم: ۴۵)

"بابا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں رحمان کی طرف سے آپ پر عذاب نہ آجائے اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں"

جناب مریمؑ سے کہا گیا کہ ولادتِ عیسیٰ کے بعد اگر کوئی آدمی نظر آئے تو بات نہ کرنا بلکہ اشارے سے کہہ دینا کہ:

"إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا"

(مریم: ۲۶)

"میں نے رحمان کے لیے روزہ کی منت مانی ہے آج میں ہرگز کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی"

جب اصحابِ قریہ کے پاس تین رسولوں نے آکر اپنی رسالت کا اعلان کیا تو انھوں نے جواب میں کہا۔

"قَالُوا مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ"

(یٰسٓ: ۱۵)

"کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو اور رحمان نے کوئی شے نازل نہیں کی تم تو

جھوٹ بول رہے ہو۔

ان آیتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ خاتمؐ سے قبل بھی اللہ کا تذکرہ اُس نام کے ساتھ رائج تھا۔ لیکن عہدِ قرآن میں عرب کے مشرکین اس نام سے نامانوس نظر آتے ہیں۔ قرآن نے اپنے عہد کے منکرین کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

" وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا "

(فرقان، ٦٠)

" اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے۔ کیا جس کا تم حکم دو ہم اسی کو سجدہ کریں اور ان کی نفرت بڑھ جاتی ہے"

رحمٰن کے بارے میں یہ سوال ممکن ہے کہ اس کی ماہیت کے بارے میں ہو کہ اس رحمٰن کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سوالیہ جملہ درحقیقت سوال نہ ہو، بلکہ نفرت وحقارت کا اظہار ہو کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔ جسے ہم سجدہ کریں یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ کسی اور زبان کا ہو اور عربوں کو اس کا علم نہ ہو اس بات پر آگے گفتگو کریں گے۔ اس سوال سے قبل وبعد کی دو دو آیتوں میں اس کا جواب موجود ہے۔ لہٰذا مفہومِ رحمٰن کو سمجھنے کے لیے اس سوال کا سیاق وسباق دیکھنا ضروری ہے۔

" وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ۝٥٨ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ الرَّحْمَٰنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا ۝٥٩

" (رسول!) اس زندہ خدا پر توکل کرو، جسے موت نہیں ہے اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کے جاننے میں کافی ہے وہ ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اسے چھ دنوں میں خلق کیا۔ پھر عرش کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ رحمٰن ہے تو اس کے بارے میں کسی باخبر سے سوال کرو۔

" وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ۩ ۝٦٠ تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا ۝٦١ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ۝٦٢

(سورۃ الفرقان ۵۸ تا ٦٢)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا جس کا تم حکم دو ہم اسی کو سجدہ کریں اور ان کی نفرت بڑھ جاتی ہے۔ وہ بابرکت ہے جس نے آسمان میں برج بنائے اور ان میں سورج کا چراغ اور نورانی چاند بنایا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو پیچھا کرتا ہوا بنایا یہ بیان اس کے لیے ہے جو سمجھنا چاہے یا شکر کا ارادہ کرے"۔

ان آیات میں اَلْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ" اس کی حیات مسلسل کا اظہار ہے "خَبِیْرًا" اس کے علم ظاہر و باطن کا اظہار ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کی صفت خالقیت کا اعلان ہے۔ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ "عرش عالم امکان کا وہ آخری نقطہ ہے جہاں سے کائنات کی تدبیر ہوتی ہے اور یہ اس کے اقتدار کا اعلان ہے۔ بروج اور شمس و قمر وہ حالات پیدا کرتے ہیں جس سے زندگی کو اپنی بقا کا سامان ملتا ہے۔ یہ اس کے علتِ مبقیہ ہونے کا اعلان ہے رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا مختلف مراحلِ تخلیق پر مختلف سازگار اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ اس کی ربوبیت و رحمت کی دلیل ہے اور یہ ساری صفات جس میں جمع ہو جائیں وہ رحمٰن ہے

قرآنی استعمال

اصول بلاغت کی رو سے لفظ رحمن کو انھیں موارد میں استعمال ہونا چاہیے جو رحمت کے ہوں جیسے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ چونکہ تعلیم قرآن ایک عمل رحمت ہے، اس لیے اللہ کی جگہ لفظِ رحمٰن استعمال ہوا لیکن اس کے برعکس اگر رحمٰن کی جگہ قہار استعمال ہوتا تو یہ اصول بلاغت کے خلاف ہوتا۔ اس لیے کہ عمل رحمت صفتِ قہاریت سے منسوب ہو جاتا۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر اگر رحمٰن کے قرآنی استعمال پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا استعمال موارد رحمت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ پچھلی بحث میں جناب ابراہیم کا قول سورۂ مریم سے نقل کیا جا چکا ہے کہ آزر سے کہا کہ کہیں رحمان کی طرف سے آپ پر عذاب نہ آجائے۔ یہ موردِ رحمت نہیں بلکہ موردِ عذاب ہے ایسی مثالیں قرآن میں بکثرت ہیں جن میں اس لفظ کو موارد رحمت کے علاوہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لفظ اکثر مقامات پر لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

اس کے استعمالات پر توجہ دینے سے یہ بات بخوبی منکشف ہوسکتی ہے کہ رحمٰن اللہ کے مفہوم میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اگر فقط سورۂ مریم ہی کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس دعویٰ کی دلیلیں سامنے آسکتی ہیں۔

(۱) " جَنّٰتِ عَدْنِۣ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ " (مریم۔۶۱)

"ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کا وعدہ رحمٰن نے غیب سے اپنے بندوں سے کیا ہے۔"

" وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ " (توبہ: ۷۲)

" اللہ نے مؤمنین و مؤمنات سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔"

(۲) " اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا " (مریم۔۷۸)

" کیا اس نے رحمٰن سے عہد لے لیا ہے۔"

" قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا " (بقرہ۔۸۰)

" کہہ دو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد لے لیا ہے۔"

(۳) " وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا " (مریم۔۸۸)

" اور کہتے ہیں کہ رحمان بیٹا رکھتا ہے۔"

" وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا " (بقرہ: ۱۱۶)

" اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔"

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی ایسی آیات ہیں جنھیں پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ اپنے مفہوم میں مترادف ہیں اور تساوی کی نسبت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ایک آیت میں تو بہت وضاحت سے کہا گیا ہے کہ:

" قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى " (بنی اسرائیل ۱۱۰)

" رسول کہہ دو کہ تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جس سے بھی پکارو تو جان لو کہ سارے اچھے نام اسی کے لیے ہیں۔"

ان آیات سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ رحمٰن اگرچہ رحمت سے مشتق ہے، لیکن اللہ کی طرح اس کا اسم ذات ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ رحمت اور رحمٰن کسی قدیم زبان سے عربی میں داخل ہوئے ہوں اس کی طرف بعض اہل لغت نے اشارہ بھی کیا ہے۔

"وَقَالَ الزَّجَّاجُ الرَّحْمٰنُ اسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مَذْكُوْرٌ فِي الْكُتُبِ الْاُوَلِ وَلَمْ يَكُوْنُوْا يَعْرِفُوْنَهٗ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى" (تاج العروس)

"زجاج نے کہا کہ رحمٰن اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے جو پچھلی مقدس کتابوں میں مذکور ہے اور عرب اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ اللہ کے اسماء میں سے ہے۔"

وَحَكَى الْاَزْهَرِيُّ عَنْ اَبِي الْعَبَّاسِ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جَمَعَ بَيْنَهُمَا لِاَنَّ الرَّحْمٰنَ عِبْرَانِيٌّ وَالرَّحِيْمُ عَرَبِيٌّ۔

(تاج العروس)

"الرحمٰن الرحیم کے سلسلہ میں ازہری نے ابو العباس سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے ان دونوں لفظوں کو ایک ساتھ اس لیے استعمال کیا ہے کہ الرحمٰن عبرانی ہے اور الرحیم عربی ہے۔"

صاحب مجمع البحرین نے مادہ "ر،ہ،م" کے تحت ایک دلچسپ جملہ لکھا ہے کہ "وَمِنْ كَلَامِ نُوْحٍ عِنْدَ مَا وَقَعَتِ السَّفِيْنَةُ رَهْمَنِ اتْقَنْ وَمَعْنَاهُ يَارَبِّ اَتْقِنْ"۔ اس جملہ میں "رهمن" خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگر نوح علیہ السلام کی طرف اس قول کی نسبت درست ہے تو پھر لفظ رحمٰن کا وجود اپنی ابتدائی حالت میں عہد نوح سے ثابت ہے۔ قرآن نے حضرت نوح کا قول نقل کیا ہے "بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" گویا بسملہ کے سارے الفاظ نوح علیہ السلام کی زبان پر جاری ہوئے "بسم اللہ ، رهمن ، رحیم" واللہ اعلم بالصواب۔

رحمٰن کی تقدیم کا سبب

بسملہ میں رحمٰن کو لفظ رحیم سے مقدم رکھا گیا ہے۔ اس تقدیم کی مختلف توجیہیں بیان کی گئی ہیں۔ سب سے بہتر قول صاحب مجمع البیان کا ہے:

"اِنَّمَا قَدَّمَ الرَّحْمٰنَ عَلَى الرَّحِيْمِ لِاَنَّ الرَّحْمٰنَ بِمَنْزِلَةِ الْعَلَمِ

مِنْ حَيْثُ لَا يُوصَفُ بِهِ إِلَّا اللهُ فَوَجَبَ لِذَٰلِكَ تَقْدِيمُهُ
بِخِلَافِ الرَّحِيمِ فَإِنَّهُ يُطْلَقُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ غَيْرِهِ"

"رحمٰن کو رحیم پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ رحمٰن بہ منزلۂ اسم ذات ہے اس لیے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو رحمان سے متصف نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اسے مقدم کرنا واجب ہے برخلاف رحیم کے کہ یہ لفظ اللہ اور غیر اللہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رحمٰن و رحیم اپنے مفہوم کے اعتبار سے دُنیا اور آخرت سے متعلق ہیں (جیسا کہ تفصیلاً بیان ہو چکا)؛ لہٰذا جو لفظ دُنیا سے متعلق تھا اسے پہلے رکھا گیا اور جو آخرت سے متعلق تھا اسے بعد میں ذکر کیا گیا۔

صفتِ رحمت

اللہ اسم ذات ہے اور قرآن کا آغاز اسی اسم ذات سے کیا گیا ہے اور اس کے فوراً بعد رحمٰن و رحیم کی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ جبکہ نہ تو اللہ کے اسماء حسنٰی کم ہیں اور نہ قرآن کے پاس ان کی کمی ہے۔ وہ لفظ اللہ کے بعد قہار، جبار، متکبر یا ایسے ہی کسی نام کو ذکر کر سکتا تھا لیکن اس نے اللہ کے فوراً بعد اللہ کی رحمت کا تذکرہ کیا جس سے یہ تبلانا مقصود تھا کہ یہ صفت ساری صفات پر غالب ہے اور اس کی پوری سُنت دائمہ میں اس صفت کو ساری صفات پر تفوق حاصل ہے۔ لہٰذا اللہ سے بندے کا رشتہ خوف پر نہیں محبت پر استوار ہونا چاہیئے۔

اسماء کی ترتیب

بسملہ میں خدا کے تین نام ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں اس ترتیب میں جو لطافت رکھی گئی ہے اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زمانہ ایک نُقطۂ نظر کے لحاظ سے ارسطو سے نیوٹن اور گلیلیو تک ایک علٰحدہ اور مستقل بالذات ہستی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ دوسرے نُقطۂ نظر کے لحاظ سے اپی کورس (EPICURUS) سے آئنسٹائن تک اشیاء مادی سے وابستہ ایک غیر مستقل اور اضافی شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اس کی حقیقت اور ماہیت جو بھی ہو وہ بہرکیف خدا کی نسبت سے ایک بے حقیقت شے ہے لیکن مادی اشیاء کی نسبت سے ایک ایسا دریا ہے جو مسلسل بہتا رہتا ہے، چاہے اس میں کشتیاں چل رہی ہوں یا نہ چل رہی ہوں۔ دوسرے نقطوں میں اس کے گزرنے کا عمل جاری رہتا ہے چاہے واقعات ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن جب اس زمانے کے بہاؤ میں واقعات رونما ہوتے ہیں تو ان واقعات کی نسبت سے وہ تین حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یوں ماضی، حال اور

مستقبل جنم لیتے ہیں۔ بسملہ کے تینوں اسمائے مبارکہ انسان کی نسبت سے ان تینوں زمانوں پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ اللہ انسان کے ماضی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آیا ہے اور اسے موجود کرنے والا اللہ ہے۔ یہاں اگر لفظ خالق استعمال ہوتا تو اس سے صرف صفت خلقت کا اظہار ہوتا۔ تخلیق کی حکمت و مصلحت اور غرض و غائت کا اظہار نہ ہوتا۔ جب کہ اللہ کے معنی مستجمع جمیع صفات کمال کے ہیں، جس میں وہ سارے معانی پوشیدہ ہیں جو انسان کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ انسان کے ماضی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد رحمٰن کو ذکر کیا گیا جو انسان کے حال پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا وجود، اس کی بقا، اور اس کی زندگی گزارنے کے سارے اسباب صفت رحمانیت کے ظہور کا نتیجہ ہیں پھر رحیم کو ذکر کیا گیا جو انسان کے مستقبل پر دلالت کرتا ہے کہ قیامت کے دن صرف انھیں پر رحم ہو گا جو اس کی رحمت خاصہ کے مستحق ہوں گے ہر ایک پر نہیں ہو گا۔

ترتیب اسماء کو اس زاویہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ اللہ کہہ کر توحید کی طرف اشارہ کیا گیا۔ پھر رحمٰن کہا گیا۔ رحمٰن وہ ہے جو دنیا میں ہر ایک کی ضروریات کو پورا کرے۔ اگر وہ پورا نہ کرتا تو یہ ظلم ہوتا اس لیے کہ جب خلق کیا ہے تو پھر ان مخلوقات کے اسباب حیات کا بندوبست کرنا ہی عین عدل ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے عدل کی طرف اشارہ ہوا۔ اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہدایت بھی ہے اور ہدایت اشخاص کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس ضرورت کو نبوت و امامت کے ذریعہ پورا کیا گیا، پھر آخر میں رحیم کہہ کر یہ بتلایا گیا کہ وہ اعمال کو دیکھ کر جزاء دے گا۔ اس سے قیامت کا تصور واضح ہوا اور یوں بین السطور کی کیفیت میں پورے اصول دین بیان ہو گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بسملہ کی جامعیّت

(۱) اِعْلَمْ اِنَّ جَمِیْعَ اَسْرَارِ الْکُتُبِ السَّمَاوِیَّةِ فِی الْقُرْاٰنِ وَجَمِیْعُ مَا فِی الْقُرْاٰنِ فِی الْفَاتِحَةِ وَجَمِیْعُ مَا فِی الْفَاتِحَةِ فِی الْبَسْمَلَةِ وَجَمِیْعَ مَا فِی الْبَسْمَلَةِ فِی بَاءِ الْبَسْمَلَةِ وَجَمِیْعُ مَا فِی بَاءِ الْبَسْمَلَةِ فِی النُّقْطَةِ الَّتِیْ هِیَ تَحْتَ الْبَاءِ قَالَ الْاِمَامُ عَلِیٌّ کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ اَنَا النُّقْطَةُ الَّتِیْ تَحْتَ الْبَاءِ۔ [۱]

---

[۱] قندوزی، ینابیع المودّۃ صفحہ ۶۹ طبع استنبول۔

بیان ہو کہ آسمانی کتابوں کے سارے اسرار و معارف قرآن میں ہیں اور جو کچھ قرآن میں ہے وہ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ فاتحہ میں ہے وہ بسملہ میں ہے اور جو بسملہ میں ہے وہ بائے بسملہ میں ہے اور جو بائے بسملہ میں ہے وہ اس کے نیچے کے نقطہ میں ہے اور امام علی کرم اللہ وجہہ نے کہا کہ میں وہ نقطہ ہوں جو اس با کے نیچے ہے۔[1]

(۲) "قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَخَذَ بِیَدِیَ الْاِمَامُ عَلِیٌّ لَیْلَةً مُقْمِرَةً فَخَرَجَ بِیْ اِلَی الْبَقِیْعِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَقَالَ اِقْرَاْ یَا عَبْدَ اللّٰهِ فَقَرَأْتُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَتَکَلَّمَ لِیْ فِیْ اَسْرَارِ الْبَاءِ اِلٰی بُزُوْغِ الْفَجْرِ"[1]

ابن عباس نے کہا کہ حضرت علیؑ نے ایک چاندنی رات میں عشاء کے بعد میرا ہاتھ پکڑا اور بقیع میں لے گئے اور کہا کہ اے عبداللہ کچھ قرات کرو۔ میں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا تو وہ طلوع فجر تک مجھ سے بائے بسم اللہ کے اسرار بیان فرماتے رہے۔

(۳) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اِنَّهُ قَالَ یَشْرَحُ لَنَا عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ نُقْطَةَ الْبَاءِ مِنْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَانْفَلَقَ عَمُوْدُ الصُّبْحِ وَهُوَ بَعْدُ لَمْ یَفْرَغْ فَرَاَیْتُ نَفْسِیْ فِیْ جَنْبِهٖ کَالْفَوَّارَةِ فِیْ جَنْبِ الْبَحْرِ الْمُتَلَاطِمِ۔[2]

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ ہمارے لیے بائے بسم اللہ کی تشریح کرنے لگے یہاں تک کہ پو پھٹ گئی لیکن وہ تشریح سے فارغ نہیں ہوئے۔ میں نے اپنے آپ کو ان کے مقابل ایسا محسوس کیا جیسے متلاطم سمندر کے مقابل ایک فوارہ ہو۔

(۴) قَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مَرَّةً لَوْشِئْتُ لَاَوْقَرْتُ بَعِیْرًا مِنْ تَفْسِیْرِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔[3]

ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر سے اونٹ کو بار کر دوں۔

(۵) اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عَبَّاسٍ سَئَلَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَنْ تَفْسِیْرِ الْقُرْاٰنِ

---

[1] قندوزی ینابیع المودۃ صفحہ ۶۹ طبع استنبول
[2] امرتسری، عبیداللہ ارجح المطالب صفحہ ۱۱۲ طبع لاہور۔
[3] شافعی مطالب السئول ۲۶ طبع تہران۔

فَوَعَدَهُ بِاللَّيْلِ فَلَمَّا حَضَرَ قَالَ مَا اَوَّلُ الْقُرْآنِ قَالَ الْفَاتِحَةُ قَالَ وَمَا اَوَّلُ الْفَاتِحَةِ قَالَ بِسْمِ اللهِ قَالَ وَمَا اَوَّلُ بِسْمِ اللهِ قَالَ بِسْمِ قَالَ وَمَا اَوَّلُ بِسْمِ قَالَ الْبَاءُ فَجَعَلَ يَتَكَلَّمُ فِي الْبَاءِ طُولَ اللَّيْلِ فَلَمَّا قَرُبَ الْفَجْرُ قَالَ لَوْ زَادَنَا اللَّيْلُ لَزِدْنَا [1]

عبد اللہ ابن عباس نے امیر المومنینؑ سے تفسیر قرآن کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے رات کو بیان کرنے کا وعدہ کیا۔ رات کو پوچھا کہ اوّل قرآن کیا ہے۔ کہا فاتحہ! پوچھا اوّل فاتحہ کیا ہے کہا بسم اللہ! پوچھا اوّل بسم اللہ کیا ہے کہا بسم! پوچھا اوّل بسم کیا ہے کہا با۔ تو آپ پوری رات بائے بسم اللہ کی تشریح کرتے رہے۔ قریب فجر فرمایا کہ اگر رات بڑھتی تو ہمارا بیان بھی بڑھتا۔

نقطہ بائے بسم اللہ

ان روایات کے علاوہ ان سے ملتی جلتی روایات ذخیرۂ احادیث میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اختلاف الفاظ کے باوجود ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ علی بائے بسم اللہ کا نقطہ ہیں۔ اور اگر وہ چاہتے تو سورہ حمد، بسملہ یا بائے بسملہ کی اتنی تفسیر بیان کر سکتے تھے کہ جسے اگر حیطۂ تحریر میں لایا جاتا تو وہ تحریر شدہ مواد ستر اُسی اونٹوں کا بار ہوتا۔

علامہ جلیل سید راحت حسین گوپالپوری مرحوم نے اپنی تفسیر کے حاشیے میں امیر المومنین کے نقطۂ بائے بسم اللہ ہونے کی توجیہہ یوں سپرد قلم کی ہے۔

"نقطہ مرکز کو کہتے ہیں جس پر پرکار کا ایک پایہ ٹھہرتا ہے اور دوسرا پایہ گول دائرہ بناتا ہے اور اس دائرہ پر چلنے والی چیز مرکز کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ جیسے چکّی کے لیے اس کے بیچ کا کھونٹا اور گاڑیوں کے پہیوں کے لیے اس کے بیچ کا دُھرا اور خطّی دائرہ کے لیے اس کے بیچ کا خیالی جُزء۔"

پس اس حدیث میں نُقطہ سے مقصود یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام دائرہ علوم قرآنی کے لیے مرکز ہیں اور عُلوم آپ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ہے معنیٰ اَنَا تِلْكَ النُّقْطَةُ کا۔[2]

---

[1] تفسیر البرہان جلد اوّل صفحہ ۲۔

[2] تفسیر انوار القرآن حصہ اوّل ص۱۲ (حاشیہ) طبع کھجوا بہار ہندوستان۔ اس کے علاوہ اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۲/۱۰۳ پر بھی اس موضوع سے متعلق کچھ سطریں موجود ہیں۔

کچھ صاحبان فکر و قلم نے مغربی محققین کے اقوال کی روشنی میں یوں توجیہ کی ہے کہ عربی زبان کے حروف تہجی دراصل فینقی زبان سے ماخوذ ہیں اور فینیقیوں کے حروف تہجی مصریوں سے ماخوذ ہیں لیکن فینیقیوں نے اپنے حروف تہجی میں مصریوں سے ہٹ کر یہ راہ نکالی کہ جس چیز کو تحریر کرنا مقصود ہو اس چیز کے کسی اہم جزء کی تصویر کو حرف قرار دے دیا مثلاً بھینسا یا بیل الف کہلاتا تھا۔ انھوں نے اس کے سینگ کو الف قرار دے دیا۔ اسی طرح اونٹ ان کی زبان میں جیم کہلاتا تھا یہی جیم ان کے حروف تہجی میں "ج" بنا اور اس کا نقطہ اس کے مالک یا سوار کی علامت قرار پایا اس قاعدہ کی رُو سے گھر ان کی زبان میں بیت کہلاتا تھا انھوں نے بار کو گھر کی علامت قرار دیا اور اسے یوں تحریر کیا "ب" اس حرف میں دائیں اور بائیں کی عمودی لکیریں گھر کی دیوار قرار پائیں۔ طویل افقی لکیر کا درمیان گھر میں داخلہ کی جگہ قرار پایا اور نیچے کا نقطہ اس کے مالک کی علامت قرار پایا۔ امیرالمومنین اپنے مذکورہ قولِ گرامی میں یہ بیان فرمارہے تھے کہ پورا قرآن ایک گھر ہے اس گھر میں انسانی ضرورت کی ہر وہ شے موجود ہے جو پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود تھی اور اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والی ہر ضرورت کو پورا کرنے والی اشیاء بھی اس گھر میں موجود ہیں اور میں اس گھر کا مالک ہوں، مجھ سے بے تعلق ہو کر کوئی شخص اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ [1]

نقطۂ بائے بسم اللہ کے دقیق تر مفہوم کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پوری کائنات کے تناظر میں اس نقطے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ اللہ اور ماسوی اللہ۔ اسے علم کلام کی اصطلاح میں واجب الوجود اور ممکن الوجود کہا جاتا ہے، واجب الوجود اس وجود کو کہتے ہیں جس میں مفروضے کے طور پر بھی عدم کا گزر نہ ہو اور وہ ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے اس کے برخلاف ممکن الوجود اس وجود کا نام ہے جس کے ترازو میں عدم اور وجود دونوں کے پلڑے برابر ہوں ایسی شے میں وجود کسی خارجی ترجیح کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔

واجب الوجود کے علاوہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ ممکن الوجود ہے اور ساری ممکن الوجود اشیاء واجب الوجود کے ارادے کے سبب وجود پذیر ہوئی ہیں۔ یعنی واجب اور ممکن میں خالق اور مخلوق کا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس رشتے کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کے درمیان باہمی ارتباط استوار ہو یعنی خالق اپنے مخلوقات سے ربط رکھے اور مخلوقات اپنے خالق سے۔ اس بحث میں تین مرکزی دائرے وجود میں آتے ہیں۔

خالق (اللہ)

مخلوق (ماسوی اللہ)

---

[1] مولانا ظفر حسن امروہوی صاحب تفسیر القرآن، ڈاکٹر ذوالفقار الحسنین صاحب مقامات قرآن اور دیگر مصنفین۔

دونوں کا باہمی ارتباط۔

قرآن مجید کے سارے مباحث انھیں تین مرکزی دائروں میں منحصر ہیں، یعنی قرآن مجید کا کوئی جُملہ ان تین دائروں سے باہر نہیں۔ اس کتاب الٰہی کے موضوعات اگرچہ رنگارنگ اور متنوع ہیں۔ لیکن ہر ایک کی بازگشت انھیں مذکورہ دائروں کی طرف ہے، قرآن مجید کا پہلا موضوع خالق ہے۔ اس موضوع میں خالق کا وجُود، اس کی صفات، صفات کے تقاضے اور ان کے عملی اظہار پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے موضوع میں مخلوقات، ان کا مقصد تخلیق اور کائنات میں ان کی درجہ بندی پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے موضوع میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کائنات کیوں خلق کی گئی ہے؟ اور اس کے مختلف اجزاء اپنے خالق کی کس طلب کو پورا کر رہے ہیں؟ خالق کی وہ طلب جو بے عقل مخلوقات سے ہے وہ اس طلب سے مختلف ہے۔ جو صاحب عقل مخلوق سے ہے۔ لہٰذا تیسرے موضوع کا اہم ترین جُزء یہ ہوگا کہ انسان کے ساتھ اس کے خالق کا رویّہ کیا ہے؟ اور خالق کے ساتھ انسان کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے؟ خالق کا رویّہ پہلے موضوع کے ذیل میں قرآن میں بکثرت مذکور ہوا ہے۔ البتہ انسان کے رویّہ پر وہ ساری آیات دلالت کرتی ہیں، جن کا تعلق انسان کی غرض تخلیق، عبادات اور احکام سے ہے۔ لہٰذا پورے قرآن کی یہی تین تقسیمیں ہیں۔ خالق اور اس کے صفات انسان اور اس کے احوال، اللہ اور انسان کا باہمی ارتباط (اس عنوان میں انسان کی احتیاج اور عبادت دونوں شامل ہیں) یہی پُورے قرآن کا خلاصہ بلکہ ساری آسمانی کتابوں کی تلخیص ہے۔

اگر سُورۂ فاتحہ پر نظر ڈالی جائے تو اس کے بنیادی موضوعات بھی تین ہی ہیں۔ ابتدائی چار آیات خالق اور اس کے صفات سے متعلق ہیں اور آخری دو آیات انسان اور اس کے احوال سے متعلق ہیں اور درمیان میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا جُملہ ہے جو اللہ اور انسان کے درمیانی ربط کو اُجاگر کرتا ہے کہ انسان کا ربط اللہ سے عبادت اور استعانت کا ربط ہے۔

اس بحث کی روشنی میں سُورۂ فاتحہ پُورے قرآن کا خلاصہ ہے اور سُورۂ فاتحہ میں وہ سب کچھ ہے جو پورے قرآن میں بسط و تفصیل کے ساتھ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس سُورہ کا خلاصہ بسملہ میں ہے یا نہیں؟۔

(۱) اسم اور اللہ دونوں خالق اور اس کے صفات و افعال پہ دلالت کرتے ہیں۔

(۲) رحمٰن و رحیم بندوں کے احوال سے متعلق ہیں، اس لیے کہ انسان کا وجود اور اس کی بقاء صفتِ رحمٰن پر اور انسان کی جزاء و سزا صفتِ رحیم پہ موقوف ہے۔

(۳) باءٌ عربی زبان میں ربط پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے اس آیت میں باءٌ کا وجود اللہ اور بندے کے درمیانی ربط کو واضح کرتا ہے۔

یوں یہ بسملہ پُورے سورۂ حمد کا خلاصہ ہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ باء اللہ اور انسان کے

درمیانی رابطہ کے طور پر استعمال ہوئی ہے اور اسی "باء" سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی مرضی اور احکام انسان تک پہنچتے ہیں تو اب "باء" کی شناخت کیسے ہو۔ اس لیے کہ "باء" اپنی شکل میں "تا" اور "ثاء" کے ساتھ مشترک ہے۔ لہٰذا ایک ایسے وجود کی ضرورت ہے جو "باء" کو اس کی ہم شکل بہنوں سے الگ کر سکے اور وہ وجود نقطۂ "باء" ہے۔ یعنی "باء" اپنے تشخص اور اپنی پہچان میں نقطے کی محتاج ہے۔ نقطہ ہی "باء" کو بناتا ہے۔ اگر نقطہ نہ ہو تو "باء" کا وجود ثابت نہ ہو سکے گا۔ اور اگر "باء" کا وجود بسملہ میں ثابت نہ ہو تو اللہ اور انسان کے درمیان عبادت اور استعانت کا رابطہ ثابت نہ ہو سکے گا۔ اسی بات کی طرف امیر المومنین علیہ السلام نے اشارہ فرمایا تھا کہ اللہ اور بندوں کے رابطے کا حقیقی سبب میں ہوں اور یہ نقطہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی محمدیت اور علویت کا حقیقی وارث ہے وہ اپنے عہد میں نقطۂ "بائے" بسم اللہ ہے۔

بسملہ جزو سورہ ہے

علمائے شیعہ کا اجماع ہے کہ بسملہ سورۂ برأت کے علاوہ ہر سورہ کا جزو ہے شیعہ تفسیروں میں اسے بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

"اِتَّفَقَ اَصْحَابُنَا اَنَّهَا آيَةٌ مِّنْ سُوْرَةِ الْحَمْدِ وَمِنْ كُلِّ سُوْرَةٍ وَاِنَّ تَرْكَهَا فِي الصَّلٰوةِ بَطَلَتْ صَلٰوتُهُ سَوَاءٌ كَانَتِ الصَّلٰوةُ فَرْضًا اَوْ نَفْلًا۔[1]

ہمارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بسملہ سورہ حمد اور ہر سورہ کی آیت ہے اور اگر کوئی شخص اس کو ترک کر دے تو اس کی نماز باطل ہو گی خواہ وہ نماز واجب ہو یا سنت ہو۔

اِتَّفَقَتِ الشِّيْعَةُ الْاِمَامِيَّةُ عَلٰى اَنَّ الْبَسْمَلَةَ آيَةٌ مِنْ كُلِّ سُوْرَةٍ بُدِئَتْ بِهَا۔[2]

شیعہ امامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بسملہ قرآن کے ہر اس سورہ کی آیت ہے جو بسملہ سے شروع ہوتا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان صفحہ ۷۔

[2] البیان سید ابو القاسم خوئی صفحہ ۴۳۸۔

اس اجماع واتفاق کا سبب یہ ہے کہ ذخیرۂ احادیث میں آلِ محمدؐ علیہم السلام سے بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں۔ جن میں یہ صراحت موجود ہے کہ لبسملہ سُورۂ حمد اور دوسرے سوروں کا جُزء ہے[1] اس کے برعکس علمائے اہلِ سُنّت میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں فقہا، علماء اور مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ البتہ ابن عباس، ابن مبارک، ابن کثیر اور دیگر اکابر مفسرین کا ایک معتدبہ گروہ اس کی جزئیت کا قائل ہے۔

---

[1] کافی۔ بحار الانوار، وسائل الشیعہ وغیرہ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ساری تعریف مخصوص ہے اللہ کے لیے جو عالمین کا رب ہے

یہ آیۂ مبارکہ قرآن مجید میں سورۂ حمد کے علاوہ مزید پانچ مقامات پر وارد ہوئی ہے:

① "فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

"پھر کاٹ دی گئی جڑ ان لوگوں کی جو ظالم تھے اور ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔"

(انعام: ۴۵)

② دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

"اہل جنت جنتوں میں پکاریں گے کہ خدایا تو پاک ہے اور ان کی مدارات سلام ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔"

(یونس: ۱۰)

③ "وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

"اور ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔"

(الصّٰفّٰت: ۱۸۲)

④ "وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

"اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد گھیرے اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔"

(زمر: ۷۵)

⑤ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "

" وہ زندہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ سو تم اس کو پکارو اسی کے لیے دین کو خالص کر کے ہر تعریف اللہ کے لیے ہے۔ جو عالمین کا رب ہے "

(مومن - ۶۵)

ان ساری آیتوں کو بیک وقت دیکھنے سے اس آیۂ مبارکہ کی جلالتِ قدر سامنے آتی ہے۔ سورۂ حمد میں ہونے کے سبب سے اللہ کی آخری کتاب کا آغاز اس جملے سے ہوا۔ سورۂ یونس کی آیت کی رو سے اہلِ جنت کا آخری جملہ جنت میں یہی ہوگا۔ سورۂ زمر کے مطابق قیامت کے دن فیصلہ کرنے کے بعد آخری ندائے غیب یہی جملہ ہوگی۔ سورۂ صافات میں اللہ نے مرسلین پر سلام بھیجنے کے بعد یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ سورۂ مومن میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ استجابتِ دعا موجب حمدِ الٰہی ہے اور سورۂ انعام کی آیت کے موجب اللہ کا ظالموں کی نسل کو منقطع کر دینا بھی اس کی حمد کا موجب ہے۔

اَلْحَمْدُ

حمد کے معنی تعریف کے ہیں اور اسی معنی میں لفظ مدح بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ لفظِ مدح اختیاری اور غیر اختیاری دونوں قسم کی خوبیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شجاعت وسخاوت، علم وحلم وغیرہ اختیاری خوبیاں ہیں ان کا بیان بھی مدح کہلاتا ہے اور موتی کی آب، چہرے کی خوبصورتی سرو کی خوش قامتی اور پرِ طاؤس کی بوقلمونی وغیرہ غیر اختیاری خوبیاں ہیں، ان کے لیے بھی مدح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حمد فقط ان خوبیوں کے بیان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اختیاری ہوں۔ اسی طرح لفظ شکر منعم کی اس خوبی کے بیان کو کہتے ہیں جو نعمت پانے کے بعد ہو۔ اس تفصیل سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ لفظ حمد مدح سے خاص، اور لفظ شکر سے عام ہے۔ یعنی ہر شکر حمد ہے لیکن ہر حمد شکر نہیں ہے۔ اس طرح ہر حمد مدح ہے۔ لیکن ہر مدح حمد نہیں ہے۔

مفسرین نے اس پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے کہ الحمد میں الف لام کی نوعیت کیا ہے اور للہ میں لام کی نوعیت کیا ہے؟ اگر الف لام استغراق یا جنس کا ہو اور لام تملیک یا اختصاص کے لیے ہو تو اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی تعریف کسی بھی زبان سے ہو اور کسی شے کے لیے ہو، وہ درحقیقت خدا ہی کی تعریف ہے۔ اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شے یا شخص کی تعریف کی جا رہی ہے تو وہ بھی درحقیقت اس لیے خدا کی حمد ہے کہ جس کے پاس جو کچھ بھی قابلِ تعریف ہے وہ سب خدا ہی کا بخشا

ہوا ہے۔

جامعیّت

اس مختصر سے جملے کی جامعیت کا اندازہ مندرجہ ذیل تین روایات سے لگایا جا سکتا ہے۔

" وَ بِاِسْنَادِہٖ اِلٰی عَلِیِّ ابْنِ الْحُسَیْنِؑ قَالَ وَ مَنْ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ فَقَدْ اَدّٰی شُکْرَ کُلِّ نِعْمَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی " [1]

" امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ جس نے الحمد للہ کہا اس نے اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کر دیا "

" عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِؑ قَالَ لِیْ مَا اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلٰی عَبْدٍ بِنِعْمَۃٍ صَغُرَتْ اَوْ کَبُرَتْ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اِلَّا اَدّٰی شُکْرَھَا " [2]

" امام صادقؑ نے فرمایا کہ اگر بندہ اللہ کی نازل کردہ چھوٹی یا بڑی نعمت پر الحمد للہ کہ دے تو اس نے اس کا شکر ادا کر دیا۔

" خَرَجَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ مِنَ الْمَسْجِدِ وَ قَدْ ضَاعَتْ دَابَّتُہٗ فَقَالَ لَئِنْ رَدَّھَا اللّٰہُ لَاَشْکُرَنَّ اللّٰہَ حَقَّ شُکْرِہٖ قَالَ فَمَا لَبِثَ اَنْ اُتِیَ بِھَا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَقَالَ قَائِلٌ لَہٗ جُعِلْتُ فِدَاکَ اَلَیْسَ قُلْتَ لَاَشْکُرَنَّ اللّٰہَ حَقَّ شُکْرِہٖ فَقَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ اَلَمْ تَسْمَعْنِیْ قُلْتُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ " [3]

" امام صادقؑ مسجد سے باہر آئے اور ان کا جانور گم ہو چکا تھا۔ آپ نے کہا کہ اگر اللہ نے وہ جانور مجھے واپس دلا دیا تو میں اس کا ایسا شکر کروں گا جو شکر کرنے کا حق ہے، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ وہ جانور مل گیا آپ نے فرمایا الحمد للہ " کسی نے کہا میں آپ پر فدا ہوں کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا شکر کروں گا جو شکر کرنے کا حق ہے آپ نے فرمایا کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے الحمد للہ کہا ہے "

ان روایات سے جہاں اس جملے کی جامعیت کا اظہار ہوتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ لفظ حمد میں تعریف کے ساتھ ساتھ شکر کا مفہوم بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے یعنی انسان جب کائنات

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۵۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۵۔

اور اس پر نازل ہونے والی نعمتوں کو دیکھ کر الحمد للہ کہے تو یہ تعریف ہوگی اور جب خود اپنی ذات پر ہونے والی نعمتوں پر نگاہ کر کے یہ جملہ کہے تو یہی شکر ہوگا۔

آغاز سورہ اور حمد

سورۂ حمد کے علاوہ چار مزید ایسے سورے ہیں جن کا آغاز حمد خداوندی سے ہوا ہے۔

(۱) "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ۔"

"ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے سماوات وارض کو خلق کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا پھر بھی کافر اپنے رب کے ساتھ (دوسری چیزوں کو) برابر کر رہے ہیں۔" (انعام)

(۲) "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔"

"ہر تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔" (کھف)-۱

(۳) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ۔"

"ہر تعریف اللہ کے لیے ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں سب کچھ اسی کا ہے، اور آخرت میں اسی کی تعریف ہے اور وہ صاحب حکمت اور صاحب خبر ہے۔"

(سبا)-۱

(۴) "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓىٕكَةِ رُسُلًا اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔"

"ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے۔ جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہیں، وہ تخلیق میں جو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(فاطر)

ان سوروں کا آغاز اگرچہ حمد خداوندی سے ہوا ہے۔ لیکن یہ "حمد" ان سوروں کا مرکزی خیال

نہیں ہے۔ان میں مختلف عناوین پر گفتگو کی گئی ہے اور مختلف موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں اس کے برعکس سورہ حمد کا مرکزی خیال ہی حمد خداوندی ہے۔ اللہ، رحمٰن، رحیم، رب العالمین، مالک یوم الدین یہ سب اس کے اسماء واوصاف جمیلہ وجلیلہ ہیں۔جن کے ذریعہ انسان اس کی حمد کرتا ہے۔ اس کے بعد اظہار عبودیت اور اعلان عجز و طلب استعانت اس کی الوہیت اور قدرت کی حمد ہی کا ایک لطیف رُخ ہیں۔اس کے بعد ہدایت کی دُعا ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ اس کے بندوں میں کچھ اس کی نعمت پانے والے ہیں، کچھ غضب کا شکار ہیں اور کچھ گمراہ ہیں۔ ہدایت کی دُعا اور بندوں کی ان اقسام میں بھی حمد کے بلیغ ترین استعارے موجود ہیں۔جن کی لطافت کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس سُورے کے مضامین میں سفر کرتے ہُوئے یہ بات بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہ اس کی ہر آیت میں بالصراحت یا بین السطور حمد کی ایک فضا قائم ہے،جو مجموعی طور پر پورے سُورے کو گھیرے ہُوئے ہے اسی لیے دوسرے مذکورہ سُوروں کے بالمقابل یہی سورہ سورۂ حمد کے نام سے معروف ہُوا۔

رَبّ

صاحب مفردات کے قول کے مطابق یہ لفظ تربیت کے معنی میں ہے اور فاعل (یعنی تربیت کرنے والے) کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔صاحب مجمع البیان کے قول کے مطابق رب کے معنی رئیس، لائق اطاعت، مالک، رفیق، مربی اور مصلح کے ہیں۔ یہ لفظ تنہا فقط خدا کے لیے اور اضافت کے ساتھ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "رَبُّ الدَّارِ" (گھر کا مالک)

اس لفظ کی جمع ارباب ہے اور یہ جمع قرآن مجید میں چار مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔

"قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ"

"کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم ایک بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے بعض بعض کو ارباب بنائیں سوائے اللہ کے پھر بھی اگر وہ

پھر جائیں تو یہ کہو کہ تم گواہ رہنا کہ ہم فرماں بردار ہیں۔"

(آلِ عمران : ۶۴)

(۲) "وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔"

"اور تم کو یہ حکم نہیں دیا ہے کہ تم فرشتوں اور انبیاء کو اپنے ارباب قرار دے لو۔ کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا۔ جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔"

(آلِ عمران : ۸۰)

(۳) "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔"

"انھوں نے اللہ کے علاوہ اپنے علماء اور اپنے عابدوں کو ارباب بنا لیا۔"

(توبہ : ۳۱)

(۴) "يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔"

"اے میرے زندان کے ساتھیو! کئی ارباب الگ الگ بہتر ہیں یا وہ خدا جو اکیلا اور قہر کرنے والا ہے (بہتر ہے)"

(یوسف : ۳۹)

یہ بیان کیا جا چکا کہ تنہا لفظ رب فقط اور فقط خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو پھر قرآن مجید نے اس کی جمع غیر خدا کے لیے کیوں استعمال کی؟ صاحب مفردات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ قرآن کو اُن لوگوں کے معتقدات پر تنقید کرنی تھی جو ایک سے زیادہ رب کے قائل ہیں۔ اس لیے ان کے اعتقاد کے مطابق جمع استعمال کی ہے۔

اَلْعَالَمِيْنَ

یہ لفظ قرآن میں ۳۰ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہ جمع ہے اور اس کا واحد عالم ہے۔ صحاح، قاموس اور اقرب الموارد وغیرہ کی رُو سے اس سے مراد تمام مخلوقات و موجودات ہیں اور اس کی جمع عَوَالِم اور عَالَمُوْنَ دونوں ہیں۔ عرف عام اور بول چال میں عالَم ایک ایسی وحدت ہے جو اپنی نوع یا جنس کے اعتبار سے الگ الگ تمیز دی جا سکے، جیسے عالَمِ ارواح، عالَمِ ذر، عالَمِ جمادات وغیرہ یا ایسی وحدت ہے جو کیفیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہو، جیسے عالَمِ طفلی، عالَمِ شباب، عالَمِ پیری

عالم خواب وغیرہ۔

صاحب مجمع البیان علامہ طبرسیؒ کے قول کے مطابق عالم خود جمع ہے اس کا مفرد نہیں ہے۔ جیسے نفر اور جیش کہ یہ خود جمع کا مفہوم رکھتے ہیں۔ لفظ عالم علامت سے مشتق ہے۔ اس لیے کہ وجود صانع کی علامت ہے۔ اس سے مراد تمام مخلوقات ہیں۔ قرآن مجید میں عالم استعمال نہیں ہوا ہے۔ عالمین استعمال ہوا ہے، تو جب یہ لفظ خود مفہوم جمع رکھتا ہے تو اس کی جمع استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عالم کی بے کراں وسعتوں اور کثرت و تعدد کو سمجھانے کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

رب العالمین کے معنی ہیں تمام موجودات و مخلوقات کی پرورش کرنے والا۔ یہ ترکیب قرآن مجید میں بیالیس مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔

ربوبیت کا عالمینی تصور

رب العالمین کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کے وہ مختلف مقامات جہاں صراحتہً یا اشارۃً اس صفت کی وضاحت پائی جاتی ہے، ان میں سے چند کو زیر بحث لایا جائے۔

(۱) "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔"

"یقیناً تمہارا پالنے والا وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں خلق کیا پھر عرش کی طرف متوجہ ہوا، وہی رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور وہ اس کے پیچھے آتی ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ آگاہ رہو کہ خلق اور امر دونوں اللہ کے لیے ہیں۔ بابرکت ہے وہ اللہ جو رب العالمین ہے۔"

(اعراف: ۵۴)

اس آیۂ مبارکہ میں عالمینی ربوبیت کے مندرجہ ذیل اوصاف بیان کیے گئے ہیں:

(۱) چھ ادوار میں آسمان و زمین کو خلق کرنا۔

(۲) عرش کی طرف توجہ اور غلبہ۔

(۳) روز و شب کا اجراء۔

(۴) تمام ستاروں اور سیاروں کا تابع فرمان ہونا۔

(۵) خلق وامر دونوں کا ملکیت میں ہونا۔
یہ سارے امور جس ذاتِ گرامی میں جمع ہیں، وہی رب العالمین ہے۔

(۲) فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾
"پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں۔"
اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾
"کہ تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔"
قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾
"اس نے کہا کہ کیا ہم نے تمھیں بچپنے میں نہیں پالا اور تم نے برسوں ہمارے درمیان اپنی عمر گزاری۔"
وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾
"اور تم وہ کام بھی کر گئے جو تم نے کیا اور تم ناشکروں میں ہو۔"
قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾
"(موسیٰ نے) کہا میں نے وہ کام کیا تھا جب میں راہ بھول کر ادھر آ گیا تھا۔"
فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾
"پھر جب میں تم لوگوں سے خائف ہوا تو تم سے فرار کر گیا۔ پس میرے رب نے مجھے حکمت عطا کی اور رسولوں میں قرار دیا۔"
"وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾
"اور یہ بھی کیا کوئی نعمت ہے جس کا تم احسان دھرتے ہو، کہ بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔"
قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾
"فرعون نے کہا یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟"
قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾
"کہا وہ سماوات و ارض اور ان کے درمیان کی ہر شے کا پالنے والا ہے، اگر تم لوگ

یقین کرو۔"

"قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اس نے اپنے مصاحبین سے کہا اس کی بات نہیں سنتے ہو؟"

"قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

(موسیٰؑ نے) کہا وہی تمہارا پالنے والا اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا پالنے والا ہے۔"

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

اس نے (ساتھیوں سے) کہا کہ یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے پاگل ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

(موسیٰ نے) کہا وہ مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی ہر شے کا پالنے والا ہے اگر تم عقل سے کام لو۔

(سورۂ شعراء آیات ۱۶ تا ۲۸)

ان ساری آیات پر سیر حاصل بحث ان کے اپنے مقام پر ہوگی۔ لیکن یہاں ربوبیت کے حوالے سے چند نکات کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی سے اپنا تعارف یہ کہ کر کرایا کہ ہم اس کے رسول ہیں جو رب العالمین ہے۔ پھر جب اپنی حکمت و نبوت کا تذکرہ فرمایا تو کہا کہ یہ چیزیں میرے رب نے مجھے عطا کی ہیں یعنی روحانی تربیت بھی عالمینی ربوبیت کا جزء ہے۔

فرعون کا دعویٰ تھا کہ:

"اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى"

"میں تمہارا بلند ترین رب ہوں"

(سورہ النّٰزِعٰت ۲۴)

یعنی اس کے نزدیک ربوبیت صرف انسان کی ہوتی ہے یا صرف انسان ربوبیت کا محتاج ہے۔ اب جو موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کا تذکرہ کیا تو اس نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ یعنی وہ اپنی حماقت اور شدید گمراہی کے سبب یہ بات نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ پوری کائنات اور اس کا ایک ایک عنصر محتاج ربوبیت ہے اور یہ اس عہد کا مزاج غالب تھا کہ وہ لوگ مختلف دیویوں دیوتاؤں کو اور مختلف عناصر فطرت کو بالاستقلال رب اور مؤثر جانتے اور مانتے تھے۔ سورج، چاند، ستارے، بادل بجلی وغیرہ وغیرہ یہ سب مستقل بالذات حیثیتوں کے حامل تھے۔ فلسفہ یونان میں رب النوع کے عنوان سے ان کی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسی سلسلے کو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ رب العالمین ہی رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا ہے۔ یہ آسمان وزمین اور اس کے درمیان کی اشیاء نہ رب ہیں اور نہ حقیقی مؤثر ہیں، بلکہ حقیقی مؤثر وہ ہے، جو ان سب چیزوں کا بھی رب ہے۔ جب اس جواب پر فرعون نے اپنے مصاحبین کی طرف مخاطب ہوکر طنزیہ جملہ کہا تو اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تمہارا اور تمہارے باپ داداؤں کا بھی رب ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم بھی بہ حیثیت انسان عالمین ہی کا ایک جُز ہو۔ اپنے وجود اور اپنی ساخت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر لحہ کسی بیرونی ربوبیت کے محتاج ہو تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ اجزاء تو اپنی تربیت میں کسی کے محتاج ہوں اور جن اجزاء سے وہ کل تشکیل پارہا ہے وہ خود کسی کا محتاج نہ ہو۔

پھر جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر جنون کی تہمت لگائی تو آپ نے فرمایا کہ وہ ربّ العالمین مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کی ہر شے کا رب ہے۔ اس جواب میں لطافت یہ ہے کہ یہ پوری کائنات مکان اور زمان کا ایک طلسم ہے اور ہر موجود اس طلسم میں قید ہے۔ ربّ السّمٰوات والارض میں مکان کی ربوبیت کی طرف اشارہ ہے اور ربّ المشرق والمغرب میں زمان کی ربوبیت کا اشارہ ہے اور ان دونوں آیات کے درمیان رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ (تمہارا اور تمہارے آباء اوّلین کا رب) کہہ کر انسان کی ربوبیت پر گفتگو کی گئی تو یہ بتلایا گیا کہ تم بھی اس زمان ومکان کی طلسمی کوٹھڑی میں بند ہو۔ جب زمان ومکان ربوبیت سے بے نیاز نہ ہو سکے تو تم کیسے بے نیاز ہو جاؤ گے؟ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے اور تم مجھ پر جنون کا الزام لگا رہے ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پھر اٹھارہ آیتوں کے بعد قرآن مجید نے دربار فرعون کے جادوگروں کے ایمان کا تذکرہ کیا اور ان کے کلمے کو بیان کیا:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَھٰرُوْنَ ۝

انھوں نے کہا کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو موسیٰ اور ہارون کا ربّ ہے۔

(شعراء ۴۷-۴۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس بیان کو سمجھ لیا جو آپ عالمینی ربوبیّت کے سلسلے میں سمجھانا چاہ رہے تھے۔

اسی واقعے کے کچھ اجزاء سورۂ طٰہٰ میں بھی بیان ہوئے ہیں کہ خدا کا حکم ہوا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تمہارے رب کے بھیجے ہوئے ہیں کہ تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردو اور ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچاؤ، ہم تمہارے ربّ کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں۔

اور اس پر سلام ہو جو ہدایت کا اتباع کرے اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ عذاب اس کے لیے ہے جو جھٹلائے اور نافرمانی کرے (۴۷/۴۸) جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دربار میں آئے تو گفتگو شروع ہوئی۔

(۳) "قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يٰمُوسٰى ﴿۴۹﴾"

"اس نے کہا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے"؟

"قَالَ رَبُّنَا الَّذِىٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾"

"کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت کی ہے۔"

"قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْاُولٰى ﴿۵۱﴾"

(فرعون نے کہا پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہوا؟

"قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنسَى ﴿۵۲﴾"

"کہا کہ اس کا علم ایک کتاب میں میرے رب کے پاس ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے۔"

"الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَّاَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾" طٰہٰ سورۃ ۴۹ تا ۵۲

"اس نے تم لوگوں کے لیے زمین کو فرش بنایا اور اس میں راستے نکالے اور آسمان سے پانی برسایا، سو ہم نے اس پانی کے ذریعے نباتات کے مختلف جوڑے اگائے۔"

ان آیات پر گفتگو کرنے سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جو لوگ مزاج قرآن سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر قرآن مجید کسی واقعے کو کہانی کی طرح مکمل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا بلکہ حسب ضرورت موقع و محل کی مناسبت سے اجزاء کی صورت میں بیان فرماتا رہتا ہے۔ جیسے قصۂ آدم علیہ السلام کو حسب ضرورت اجزاء کی کمی بیشی کے ساتھ مختلف مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی صورت سورۃ شعراء اور سورۃ طٰہٰ کی ان آیات کی ہے۔

سورۂ طٰہٰ کی ان آیات میں ربوبیت کے اوصاف میں خلق اور ہدایت کو بیان کیا گیا ہے پھر آگے چل کر یہ بتلایا گیا ہے کہ اسی رب نے زمین کو سکونت اور چلنے پھرنے کے قابل بنایا آسمان سے پانی برسایا اور نباتات اگائے۔ یعنی ان آیات سے ربوبیت کے مندرجہ ذیل اوصاف

سامنے آتے ہیں:

ہر شے کو خلق کرنا۔

ہر شے کی ہدایت کرنا

زمین کو قابل سکونت و سفر بنانا۔

پانی کا بندوبست کرنا۔

نباتات اگانا

اس مسئلے پر جب سورۂ اعلیٰ میں گفتگو فرمائی تو یہ ارشاد کیا۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴿١﴾

"اپنے ربّ اعلیٰ کے نام کی تسبیح کرو۔"

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ﴿٢﴾

"جس نے خلق کیا پھر تسویہ کیا۔"

وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ﴿٣﴾

"اور جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھلائی۔"

وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى ﴿٤﴾

"اور جس نے نباتات اگائے۔"

فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى ﴿٥﴾

"پھر انہیں سیاہ بھوسے کی طرح کر دیا۔"

ان آیات سے ربوبیت کے جو اوصاف سامنے آتے ہیں وہ خلق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت ہیں اور یہ اوصاف کائنات کی ہر شے میں کارفرما ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا کہ ربّ وہ ہے جس نے خلق کیا۔

لیکن یہ نہیں بتلایا گیا کہ کیا خلق کیا؟ اس لیے کہ اگر قرآن مخلوقات کی فہرست بتلانے لگتا تو ساری دُنیا کے کاغذ اور قلم ختم ہو جاتے لیکن فہرست ختم نہ ہوتی۔ لہٰذا اسے ذہن انسانی پر چھوڑ دیا۔ کہ تخلیق پر غور کرتے جاؤ۔ جو بھی مخلوق تمہیں نظر آئے سمجھ لو کہ اس کا خالق وہی ربّ ہے۔

مذکورہ بالا ساری آیات کی روشنی میں اجمالی طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس عظیم ترین کائنات کی ہر شے میں اللہ کی عالمینی ربوبیت کے تین نظام جاری و ساری ہیں، نظامِ خلق و تسویہ، نظام تقدیر اور نظام ہدایت اور نمو، حرکت اور عقل و ارادہ رکھنے والی مخلوقات میں ان تین نظاموں کے علاوہ مزید چار اور ایسے نظام ہیں جو ان کی تربیت و بقا کے ذمہ دار ہیں، نظامِ سکونت، نظامِ نفس،

نظامِ آب اور نظامِ غذا۔

نظامِ خلق و تسویہ

اس نظام سے عالمینی ربوبیت اور کائناتی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے سے قبل خود تربیت کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ بعض محققین نے تربیت کی تعریف کی ہے۔ تَبْلِیْغُ الشَّیْءِ اِلیٰ کَمَالِہٖ بِحَسَبِ اسْتِعْدَادِہِ الْاَزَلِیْ شَیْئًا فَشَیْئًا یعنی کسی چیز کو اس کی فطری استعداد کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبۂ کمال تک پہنچانا، لیکن زیادہ جامع تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ ہر شے کو اس کی فطری استعداد کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبۂ کمال تک پہنچانا تاکہ وہ شے اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی عمل تربیت اور ربوبیّت کہلاتا ہے۔

نظامِ خلق کا ربوبیّت کے ساتھ جو ربطِ خاص ہے، وہ آیت کی پہلی وحی میں بہت نمایاں طریقے سے محسوس ہوتا ہے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" (پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے خلق کیا) یعنی پروردگار نے اس آیت میں اپنی ربوبیت پر پہلی دلیل خالقیت سے قائم کی۔ اور ربوبیت کا ذکر پہلے فرمایا اور خالقیت کا تذکرہ بعد میں کیا، بعینہٖ یہی صورت حال سورۂ اعلیٰ میں ہے "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی" اس میں بھی رب کا تذکرہ پہلے ہے اور خالقیت کا ذکر بعد میں جبکہ عقل اور مشاہدہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے پہلے خلق کیا، پھر تربیت فرمائی یعنی خالق پہلے ہے اور رب بعد میں، تو پھر ان آیات میں یہی ترتیب کیوں نہ ملحوظ رکھی گئی؟ تو بظاہر یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے خلق کرنے کے بعد ربوبیت کا منصوبہ نہیں بنایا بلکہ ربوبیت کے منصوبے کے بعد خلق فرمایا ہے۔

تخلیق میں ربوبیت کی شان کو سمجھنے کے لیے فقط ان عناصر اربعہ پر ہی نگاہ کافی ہے جنھیں اگلے وقتوں میں واقعتاً عناصر ہی سمجھا جاتا تھا۔ پانی میں انگارہ ڈال دیا جائے تو بجھ جائے گا۔ آگ پر پانی رکھ دیا جائے تو بھاپ بن کر اُڑ جائے گا۔ مٹی کو ہوا کی زد پر رکھ دیا جائے تو ہوا اُسے دھول بنا کر اُڑا دے گی اور وہ ایسا رب ہے کہ اس نے ان جھگڑا کرنے والے عناصر کو اپنی بہت سی مخلوقات میں ایسا ملا کر رکھا ہے کہ جھگڑا کرنا تو درکنار رہا وہ ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔

اسی طرح ذرا نباتات کی دنیا پر نگاہ ڈالیں۔ زندگی بھر اناج کو بورے میں بند رکھا جائے۔

کبھی اس میں نشوونما نہیں ہوگی اور اسی اناج کو زمین کھود کر دبا دیا جائے اور پانی سے سیراب کر دیا جائے تو کونپل پھوٹ آئے گی ــــ ایسی ملائم کونپل کہ اگر اس پر پانی کی تیز دھار پڑ جائے تو جڑ سے اکھڑ جائے لیکن اتنی طاقت ور ہے کہ زمین کا کلیجہ پھاڑ کر نکلی ہے، تو کیا یہ اس کی ذاتی طاقت ہے۔ اگر ذاتی طاقت ہوتی تو اکھڑ نہ جاتی لہٰذا ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسا ان دیکھا دستِ ربوبیت ہے جو آہستہ آہستہ اُسے ارتقا کی منزلوں سے ہم کنار کرتا جا رہا ہے۔

اگرچہ تربیت کے مفہوم کی وضاحت میں تسویہ کا مفہوم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی بعض جہتوں پر مزید گفتگو ناگزیر ہے۔ تسویہ کے معنی ہیں کسی شئے کو ٹھیک اور درست بنانا اور اُسے نوک پلک سے سنوارنا یعنی جس مقصد کے لیے اس شئے کو خلق کیا جا رہا ہے اُس مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہونے والی ساری صلاحیتوں اور ساری قابلیتوں کو اُس شئے میں اس طرح ودیعت کر دینا کہ اس سے بہتر کا امکان نہ ہو۔

عملِ تسویہ اللہ کی قدرتِ تامہ و کاملہ کے لیے کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ اس کے انجام دینے کے لیے وقت درکار ہو۔ وہ اسے وقت کی قید کے بغیر بھی انجام دے سکتا ہے۔ لیکن اس کی سُنّت جاریہ میں ہر چیز کا اپنے کمال پر پہنچ جانا دفعتہً نہیں ہے۔ وہ اس نظامِ تسویہ کے تحت تدریج کے ساتھ اپنے تخلیقی اور تربیتی اعمال کو انجام دیتا ہے، جس کی مثال میں سورۂ اعراف اور سورۂ مؤمنون کی ان آیات کو پیش کیا جا سکتا ہے، جن میں بالترتیب آسمان و زمین کی خلقت چھ ادوار میں بتلائی گئی ہے اور بطنِ مادر میں تخلیقِ انسانی کے مراحل کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اس بات کی مزید تائید کے لیے اس مشہور و معروف آیت کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے، جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"[1] اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں کُن کا ترجمہ "ہو جا" ہے اور یکون کا ترجمہ ہے "ہو جاتی ہے"۔ لیکن اگر یکون کے ترجمہ میں مزید دقتِ نظر سے کام لیا جائے اور یہ ترجمہ کیا جائے کہ "ہونے لگتی ہے"۔ تو جہاں اس سے قرآن کے نظریۂ ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے وہیں ربوبیتِ عامّہ کے نظامِ تسویہ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

❋

---

[1] یٰسٓ ۸۲۔

نظامِ تقدیر

پچھلے مباحث میں یہ تبلایا جا چکا ہے کہ یہ کائنات ایک مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ منصۂ شہود پر آئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے قدر، مقدار اور میزان وغیرہ پر بار بار گفتگو فرمائی ہے اور آج کی علمی دنیا بھی یہ بات بخوبی جانتی ہے کہ کائنات کی کوئی شے مقداریت کے حصار سے باہر نہیں ہے۔ مادہ کے دائرے سے باہر نکل کر اگر وسیع تر بنیادوں پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا، کہ خالقِ حکیم نے ہر شے کی غرضِ خلقت معین کی ہے، اسے مناسب مقصد خواص عطا کیے ہیں مناسبِ حال توانیاں بخشی ہیں اور اس کی کمی اور کیفی مقدار معین فرمائی ہے یہ طے فرمایا ہے کہ کس معین مدت میں اسے درجۂ کمال تک پہنچنا ہے کس قانون کے تحت اپنی غرضِ تخلیق کو پورا کرنا ہے۔ پھر یہ کہ کس حد تک اور — کتنی مدت تک اس غرضِ تخلیق کو پورا کرکے — اور کب اپنے کام کو انجام دے کر اپنے مرکز کی طرف واپس ہو جاتا ہے، یہی اس رب العالمین کا نظامِ تقدیر ہے، جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔

نظامِ ہدایت

جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا انسان — کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے، جس کے لیے فطری طور پر ایک مکمل نظامِ زندگی موجود نہ ہو اور ان میں کی کوئی فرد ایسی نہیں ہے جو اپنے اس فطری نظامِ زندگی سے آگاہ نہ ہو، شہد کی مکھیوں کا نظام یا چیونٹیوں کا نظام اس دعوے کی بین دلیل ہے، بلکہ وہ مخلوقات جن کے حس وشعور کے سلسلے میں عقلِ انسانی ابھی کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچی وہ بھی اپنے فطری نظامِ زندگی کے پابند ہیں، پانی نشیب ہی کی طرف بہتا ہے۔ درخت اوپر ہی کی طرف بڑھتا ہے۔ کمرے میں دریچے کے قریب رکھے ہوئے پودے کی شاخیں دریچے ہی کی طرف بڑھتی ہیں، کوئی اپنے فطری نظام سے بغاوت نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اپنے مقصدِ تخلیق کو حاصل کرنے کے لیے ایک معین راستے پر چلنا ان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، جس پر وہ چل رہے ہیں اور اپنے مقصدِ تخلیق کو حاصل کر رہے ہیں۔ اسے ہم ہدایتِ فطری کے علاوہ ہدایتِ تکوینی بھی کہہ سکتے ہیں (انسان ایک حد تک اس ہدایت میں شریک ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ہدایت کا بھی پابند ہے، جس کا ذکر اگلے مباحث

میں ہوگا)
اب وہ مخلوقات جن میں نمو، حرکت اور حیات پائی جاتی ہے۔ ان کے لیے مذکورہ نظاموں کے علاوہ مزید کچھ ایسے نظام وضع کیے گئے ہیں جو ان کے وجود اور بقا میں ممد و معاون ہوں۔

نظامِ سکونت

اس کی ربوبیتِ مطلقہ کا ایک رُخ یہ زمین ہے، جسے اُس رب العلمین نے کُرات آسمانی کے درمیان ایسی متوازن جگہ پر قرار دیا ہے، جہاں حرکت کرنے والے جان دار سکونت کی ساری سہولتوں سے استفادہ کرسکیں۔ ورنہ اگر یہ نظامِ کشش جو زمین کو اپنے معیّن راستے پر رکھے ہوئے ہے، ذرا سا بھی غیر متوازن ہو جائے تو یا وہ زمین سے الگ ہو کر خلاؤں میں بھٹکتے پھریں یا اس طرح سے چپک جائیں کہ زمین میں ان کے پاؤں گڑ کر رہ جائیں اور کہیں آنے جانے کے قابل نہ رہیں یا پھر چاند کی زمین کی طرح چلنے پھرنے کے لیے مسلسل جست لگاتے رہیں اور اس طرح ان کی زندگی اجیرن بن کر رہ جائے۔
زمین کی کشش کو متوازن کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے مہداً[1] اور مہاداً[2] (گہوارہ اور جائے سکونت) قرار دیا۔ ان لفظوں میں اس کی حرکت کی طرف بھی اشارہ کیا جس کے سبب شب و روز وجود میں آتے ہیں اور موسموں کی تبدیلی کا عمل بھی رونما ہوتا ہے۔

نظامِ تنفس

جاندار مخلوق سانس لیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، جدید تحقیقات کی رُو سے مختلف کُرات میں ہوا کے عناصر کا توازن وہ نہیں ہے جو اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ اس زمین کی ہوا جاندار مخلوق کے نظامِ تنفس کے لیے آخری درجۂ کمال تک سازگار بنائی گئی ہے اور اس کا ایک لطیف ترین اشارہ اس آیۂ مبارکہ میں پایا جاتا ہے:۔

---

1. طٰہٰ۔ ۵۳۔ زخرف، ۱۰۔
2. نبا، ۶

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ
وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ[1] الخ

اللہ جب کسی انسان کی ہدایت کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان میں چڑھ رہا ہو۔ الخ

یہ بھی قرآن کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ ہر آیۂ مبارکہ میں ایک مرکزی موضوع کے ساتھ ساتھ دوسرے ضمنی موضوعات بھی زیر بحث آتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں سینے کی تنگی کو آسمان میں چڑھنے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، جس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ آسمان کی فضا میں سانس لینا مشکل یا ناممکن ہے۔

نظامِ آب

پانی زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ پانی ایک مخصوص نظام کے تحت مختلف علاقوں میں ایک مخصوص توازن اور مقدار کے ساتھ پہنچایا جا رہا ہے۔ سمندر، سورج کی تمازت، بادل، رعد و برق، آبشار، چشمے اور دریا وغیرہ اسی نظام کے اجزا ہیں اور اپنا اپنا کام سلیقے کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ قرآن مجید نے کثرت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو فرمائی ہے۔

نظامِ غذا

اس نظام کے تحت زمین اور پانی کے تعاون سے مختلف اناج، سبزیاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جو گوناگوں خواص کے حامل ہوتے ہیں اور جسم کی پرورش و بقا میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ علاج بالغذا طب یونان کا ایک معرکۃ الآرا موضوع ہے۔

ان کے علاوہ بحری اور بری جانوروں میں اور پرندوں میں بھی ایسی اقسام پیدا کی گئیں جن کا

---

[1] انعام - ۱۲۶۔

گوشت اور دیگر اشیاء جسم کے لیے مناسب اور سازگار ہیں۔ انسانوں سے قطع نظر خود نباتات وحیوانات کی غذا کا مکمل بندوبست اس زمین پر پایا جاتا ہے۔

اللہ کی عالمینی ربوبیت کے سلسلے میں جو تفصیلات پیش کی گئیں وہ فقط طویل ترین مباحث کے عنوانات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کی کسی بھی صفت کی کُنہ تک پہنچ جانا طاقتِ بشری کی استطاعت سے باہر ہے زبانِ عصمت نے چند جملوں پر اسی مفہوم کو واضح کیا ہے۔ یہ چند جملے ایک طویل روایت سے اقتباس ہیں۔

"جاء رجلٌ الی الرضا علیہ السلام فقال لہ یا بن رسول اللہ اخبرنی عن قول اللہ تعالیٰ الحمد للہ رب العلمین ما تفسیرہ فقال لقد حدثنی ابی عن جدی عن الباقر عن زین العابدین عن ابیہ علیہم السلام ان رجلاً جاء الی امیر المؤمنین فقال اخبرنی عن قول اللہ تعالیٰ الحمد للہ رب العلمین ما تفسیرہ فقال الحمد للہ ھو ان عرف عن عبادہ بعض نعمہ علیھم جملاً اذ لا یقدرون علی معرفۃ جمیعھا بالتفصیل لانھا اکثر من ان تحصی او تعرف فقال لھم قولوا الحمد للہ علی ما انعم بہ علینا رب العالمین وھم الجماعات من کل مخلوق من الجمادات والحیوانات فاما الحیوانات فھو یقلبھا فی قدرتہ ویغذوھا من رزقہ ویحوطھا بکنفہ ویدبر کلاً منھا بمصلحتہ واما الجمادات فھو یمسکھا بقدرتہ ویمسک المتصل منھا ان یتھافت ویمسک المتھافت منھا ان یتلاصق ویمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ ویمسک الارض ان تنخسف الا بامرہ انہ بعبادہ رؤف رحیم"[1]

"ایک شخص امام رضا علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا کہ فرزند رسول الحمد للہ رب

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۷ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

العالمین کی تفسیر فرما دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے والد نے میرے جد سے اور انھوں نے امام باقرؑ سے انھوں نے امام زین العابدینؑ سے اور انھوں نے اپنے والد (علیہم السلام) سے روایت کی ہے۔ کہ ایک شخص نے امیرالمومنینؑ سے یہی سوال کیا تھا کہ الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ الحمد للہ یہ ہے کہ خدا نے اپنی بعض نعمتوں کی اجمالی طور پر اپنے بندوں کو معرفت کرادی ہے، کیونکہ وہ ساری نعمتوں کی تفصیل سمجھنے پر قادر نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کی نعمتیں نہ شمار میں آسکتی ہیں اور نہ کما حقہٗ پہچانی جاسکتی ہیں تو اس نے ان سے یہ کہا کہ خدا کی حمد ہے اس کی ان نعمتوں پر جو ہمیں عطا کی ہیں۔ جو ربّ العالمین ہے۔ عالمین سے جمادات و حیوانات کی ساری مخلوقات کے گروہ مراد ہیں وہ (ربّ العالمین) حیوانات کی حالتوں کو اپنی قدرت سے بدلتا ہے اور اپنے رزق سے انھیں کھلاتا ہے اور انھیں مصیبتوں سے بچاتا ہے اور اپنی مصلحت کے مطابق ان کے امور کی تدبیر کرتا ہے۔ اور جمادات کو اپنی قدرت سے روکتا ہے کہ متصل چیزیں بکھر نہ جائیں اور منتشر چیزیں متصل نہ ہوجائیں اور آسمان کو روکتا ہے کہ وہ زمین پر گر نہ پڑے (مگر باذن الٰہی) اور زمین کو روکتا ہے کہ وہ دھنس نہ جائے (مگر بامر الٰہی) وہ اپنے بندوں پر بے انتہا مہربان اور بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔

یہ جملے اپنی بلاغت اور جامعیت کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ الحمد للہ رب العالمین اگرچہ جملہ خبریہ ہے۔ لیکن حقیقت میں جملہ انشائیہ کے معنی میں ہے، پروردگار اپنے بندوں کو حمد و شکر کی تعلیم دے رہا ہے کہ اس طریقے سے حمد کرو۔ یعنی بندہ جب اس جملے کو کہتا ہے تو اللہ کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل حمد و شکر کو انجام دیتا ہے۔

حمد و شکر کی اس تعلیم میں جملہ فعلیہ کی بجائے جملہ اسمیہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ نہیں سکھلایا گیا کہ حَمِدْتُ اللّٰہَ (میں نے اللہ کی حمد کی) یا اَحْمَدُ اللّٰہَ (میں اللہ کی حمد کرتا ہوں یا کرتا رہوں گا) اس لیے کہ پہلے جملے کی خرابی یہ ہے کہ اس سے زمانۂ ماضی میں اللہ کا مستحق حمد ہونا ثابت ہوتا ہے، زمانۂ حال اور زمانۂ مستقبل کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا اور دوسرے جملے کی خرابی یہ ہے کہ زمانۂ حمد سے قبل اس کا مستحق حمد ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ان دو خرابیوں کے علاوہ دونوں جملوں کی مجموعی خرابی یہ ہے کہ ان میں حمد کا تعلق صرف متکلم کی ذات سے ہے۔ ان کے ذریعہ پوری کائنات کے حمد کرنے والوں کا احصار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے پتہ چلتا ہے

کہ کائنات کی ہر شے اپنی لسان استعداد، اپنے وجود اور اپنے اپنے طریقوں سے بلا قیدِ زمان آغازِ کائنات سے حمد میں مشغول ہے اور انجام تک حمد میں مشغول رہے گی۔

اسبابِ حمد

علم کلام کی کتابوں میں ایک مختصر سی بحث ہے کہ شکرِ منعم واجب ہے۔ اس کی توضیح مزید یہ ہے کہ احسان کرنے والے اور نعمت دینے والے کے لیے انسان کے دل میں فطری طور سے جذبۂ تشکر و امتنان پیدا ہوتا ہے اور فطرت پکار پکار کر کہتی ہے کہ نعمت دینے والے کا شکریہ ادا کرو۔ اور یہ جبلت (INSTINCT) جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے کہ اگر انھیں نعمتوں سے نوازا جائے تو وہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اور مختلف طریقوں سے اپنے جذبۂ سپاس گزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں یعنی کسی نعمت پر شکریہ ادا کرنا ایک فطری جذبہ ہے۔ اس آیۂ مبارکہ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں اسی فطری جذبے کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بیدار کیا گیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ایک اور عقلی قاعدے کو زیرِ بحث لانا ضروری ہے کہ "تَعْلِیْقُ الْحُکْمِ بِالْوَصْفِ مُشْعِرٌ بِالْعِلِّیَّۃِ" یعنی اگر حکم کسی صفت کے ساتھ مشروط کر دیا جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صفت ہی اس حکم کا سبب ہے۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ عالم کا احترام کرو تو یہ حکم احترام صفتِ علم کے ساتھ مشروط سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی شخص میں یہ صفت نہ پائی جاتی ہو تو حکم احترام اس شخص سے متعلق نہیں ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں اس آیت کے ساتھ اگلی دو آیتوں کو ملا کر مطالعہ کریں تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا:

حمد مخصوص ہے اللہ کے لیے جو۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رَحْمٰن

رَحِیْم

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے۔

اب اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ حمد و شکر اس لیے خدا کے ساتھ مخصوص ہیں کہ اس کی ربوبیت، رحیمیت اور مالکیت تمام مخلوقات کو شامل ہے۔ اس لیے جو بھی اس کے ان اوصاف حمیدہ سے فیض پا رہا ہے اور اس کی نعمتوں سے بہرہ یاب یا آیندہ میں نعمتوں کا متوقع ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ زبانِ حال یا زبانِ مقال سے اس کی حمد کرے اور اس کا شکر بجا لائے۔

وجوبِ شکرِ منعم کی اس بحث کے بعد ہم گفتگو کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے اسبابِ حمد کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی تعریف اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ ذاتی طور پر قابلِ تعریف کمالات کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو تعریف (شکر) ہوتی ہے وہ جلبِ منفعت یا دفعِ ضرر کے سبب کی جاتی ہے، جس طرح نفع پہنچانے پر منعم کا شکر لازم آتا ہے اس طرح دفعِ ضرر پر شکرِ منعم لازم ہے اس لیے کہ دفعِ ضرر خود ایک مستقل نعمت ہے۔ اس روشنی میں اسبابِ حمد کی پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں۔ حمد کبھی ذاتی کمالات پر ہوگی۔ کبھی بالفعل نعمت پانے پر ہوگی کبھی بالفعل ضرر سے بچنے کے لیے ہوگی کبھی آئندہ نعمت ملنے کی توقع پر ہوگی اور کبھی آئندہ کے ضرر سے بچنے کے لیے ہوگی۔

لہٰذا اب پروردگارِ عالم اس لیے قابلِ تعریف ہے کہ:

(۱) وہ اللہ ہے اس میں ذاتی کمالات پائے جاتے ہیں۔

(۲) وہ رب العالمین ہے اس لیے بالفعل نعمت دے رہا ہے۔

(۳) وہ رحمٰن ہے، جب تک دُنیا ہے بالفعل ضرر سے بچائے رکھے گا۔

(۴) وہ رحیم ہے آیندہ میں بھی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔

(۵) وہ مالک یوم الدین ہے آیندہ میں بھی ضرر سے محفوظ رکھے گا۔

چونکہ انسان بالفعل نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے یا فوری متوجہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس آیۂ مبارکہ میں لفظ اللہ کے بعد بلافصل اس کی صفت ربوبیت کا ذکر کیا گیا ہے۔

ربّ اور دُعا

لفظِ رب کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے:

(۱) روایت میں ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بھی سات بار کہے "یا اللہ"۔ "یارب"، پھر اس کے بعد جو حاجت طلب کرے گا وہ پوری ہوگی۔

(۲) روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص حاجت رکھتا ہو تو پانچ مرتبہ "ربّنا" کہے اس کی حاجت پوری ہوگی۔ اس کی مثال قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب پانچ "رَبَّنَا"[۱] کہہ کر دُعا مانگی گئی تو جواب میں پروردگار نے فرمایا:

"فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ"[۲] (پس ان کی دُعا ان کے رب نے قبول کرلی)

---

[۱] آلِ عمران ۱۹۱/ ۱۹۲/ ۱۹۳/ ۱۹۴

[۲] آلِ عمران ۱۹۵۔

(۳) ایک اور روایت میں ہے کہ جب بندہ یارب کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے۔ "لبیک" اور جب دوسری اور تیسری بار "یارب" کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے۔ لَبَّیْکَ یَا عَبْدِیْ (لبیک اے میرے بندے) سَلْ تُعْطَ (تو مانگ تاکہ تجھے دیا جائے)۔

(۴) امام صادق علیہ السلام سے کسی شخص نے اسم اعظم معلوم کیا، شدید سردی تھی اور سامنے حوض تھا آپ نے اُسے حکم دیا کہ اس حوض میں غسل کرو تاکہ میں تمھیں اسم اعظم بتلا دوں۔ پوچھنے والا پانی میں داخل ہوا۔ جب اس نے نکلنا چاہا تو امامؑ نے حاضرین سے فرمایا کہ اسے نکلنے نہ دو۔ کچھ دیر میں وہ سردی سے پریشان ہو کے پکارا:
"رَبِّ اَغِثْنِیْ" (پروردگارا! میری فریاد رسی کر)
امام نے فرمایا کہ یہ ہے اسم اعظم جو تم نے کہا، جب بندہ حیرانی و بے چارگی کے عالم میں اسے اس نام سے پکارتا ہے تو اللہ فریاد رسی کرتا ہے۔

(۵) ابو ہشام کی ایک طویل روایت میں ہے کہ ایک شخص مسجد میں آیا، نماز پڑھی اور ایک گفتگو کے بعد کہنے لگا۔
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب آدم و حوا درماندہ ہوئے تو انھوں نے خدا کو کس نام سے پکارا انھوں نے کہا:
"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا" [۱] ان کی توبہ قبول ہوئی۔
جب نوحؑ کفار کے ہاتھوں عاجز ہوئے تو کہا:
"رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا" [۲] خدا نے توبہ قبول کی اور کافروں کو ہلاک کر دیا۔
ابراہیمؑ نے دعا مانگی:
"رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ" [۳] دعا قبول ہوئی۔
موسیٰؑ نے قبطی کو مار دیا تو کہا:
"رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ" [۴]

---

[۱] اعراف، ۲۳۔
[۲] نوح، ۲۶۔
[۳] شعراء، ۸۳۔
[۴] قصص، ۱۶۔

تو جواب آیا: "فَغَفَرَ لَهُ"۔[۱]
سلیمان نے حکومت و مغفرت مانگی:
"رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي"[۲]
دعا قبول ہوئی
زکریا نے لڑکا چاہا:
"رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ"[۳] دعا قبول ہوئی اور ان کو یحییٰؑ ملے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ"[۴] جواب آیا:
"لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ"[۵]
صالحین امت نے "رَبَّنَا" کہہ کر دعا مانگی قبول ہوئی۔
اس بدترین خلائق (ابلیس) نے دعا مانگی:
"رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ"[۶] اس کی دعا قبول ہوئی:
"فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ"[۷]
تو کیا "رب" سے بھی بڑا "اللہ" کا کوئی نام ہو سکتا ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ کہ کر وہ شخص غائب ہو گیا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ حضرت خضرؑ تھے۔[۹]

*

---

۱ سورۂ قصص : ۱۶۔
۲ سورۂ ص : ۳۵۔
۳ سورۂ انبیاء : ۸۹۔
۴ سورۂ مومنون : ۱۱۸۔
۵ سورۂ فتح : ۲۔
۶ سورۂ آل عمران : ۱۹۰-۱۹۳۔
۷ سورۂ حجر : ۳۶
۸ سورۂ حجر : ۳۷
۹ تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اول صفحہ ۴۲/۴۳۔

عالمین کی وسعت

اس کی ربوبیت کی شان یہ ہے کہ وہ خلق کر کے عالمین سے بے پروا نہیں ہوا بلکہ ہر لحظہ اس کی تزئین و آرائش اور تسویہ میں مشغول ہے۔

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ"[۱]

"ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان خلق کیے ہیں اور ہم خلق سے غافل نہیں ہیں"

اور وہ مسلسل اس میں اضافے بھی فرماتا جارہا ہے۔

"يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"[۲]

"وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے۔"

یہ اس کی سنت جاریہ ہے جو ازل سے ابد تک جاری رہے گی یہی سبب ہے کہ جب ربوبیت کا تذکرہ فرمایا تو جمع کا صیغہ "عالمین" استعمال فرمایا۔ تاکہ انسان اپنے عالم ہی کو تنہا عالم نہ سمجھے۔ اس کے علاوہ روایات کی ایک معتدبہ تعداد کثرت عوالم پر دلالت کرتی ہے۔

(۱) وَعَنْ أَبِي جَعْفَرٍ حَدِيثٌ طَوِيلٌ وَفِيهِ لَعَلَّكَ تَرٰى أَنَّ اللّٰهَ إِنَّمَا خَلَقَ هٰذَا الْعَالَمَ الْوَاحِدَ أَوْ تَرٰى أَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَخْلُقْ غَيْرَكُمْ بَلٰى وَاللّٰهِ لَقَدْ خَلَقَ أَلْفَ أَلْفِ عَالَمٍ وَأَلْفَ أَلْفِ آدَمَ أَنْتَ فِي آخِرِ تِلْكَ الْعَوَالِمِ وَأُولٰئِكَ الْآدَمِيِّينَ۔[۳]

امام باقر علیہ السلام سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ فرمایا شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ نے اسی ایک عالم کو خلق کیا ہے یا یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے علاوہ اللہ نے کچھ اور خلق نہیں کیا۔ خدا کی قسم اس نے ہزار ہزار عالم اور ہزار ہزار

---

[۱] سورۂ مومنون، ۱۷۔

[۲] سورۂ فاطر، ۱۔

[۳] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۔

آدم خلق کیے ہیں اور تم ان عالموں اور ان آدمیوں کے آخر میں ہو۔

(۲) عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اِثْنَیْ عَشَرَ اَلْفَ عَالَمٍ کُلُّ عَالَمٍ مِنْھُمْ اَکْبَرُ مِنْ سَبْعِ سَمٰوٰتٍ وَ سَبْعِ اَرَضِیْنَ مَا یَرٰی عَالَمٌ مِنْھُمْ اَنَّ لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ عَالَمًا غَیْرَھُمْ وَاَنَا الْحُجَّۃُ عَلَیْھِمْ ۔[۱]

"امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ خدائے عزوجل کے بارہ ہزار عالم ہیں اور ان میں سے ہر عالم ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں سے بڑا ہے اور کسی عالم کو نہیں معلوم کہ اللہ نے اس کے علاوہ بھی خلق کیے ہیں اور میں ان سب پر حجت ہوں۔

(۳) "اِنَّ الْاِمَامَ الرَّابِعَ عَلِیُّ السَّجَّادُ (عَلَیْہِ السَّلَامُ) قَالَ لِلْمُنَجِّمِ فِیْمَا قَالَ: ھَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی رَجُلٍ قَدْ مَرَّ مُنْذُ دَخَلْتَ عَلَیْنَا فِیْ اَرْبَعَۃِ آلَافِ عَالَمٍ ــــــ وَرَوَاہُ السَّیِّدُ نِعْمَۃُ اللّٰہِ الْجَزَائِرِیْ فِیْ شَرْحِہٖ عَلَی الصَّحِیْفَۃِ بِزِیَادَۃِ قَوْلِہٖ الدُّنْیَا مِنْ مَشْرِقِھَا اِلٰی مَغْرِبِھَا عَالَمٌ وَاحِدٌ۔"[۲]

"امام زین العابدین علیہ السلام کے پاس ایک منجم آیا، آپ نے دوران گفتگو اس سے فرمایا کہ تمھیں ایسا شخص بتلاؤں کہ جب سے تم یہاں آئے ہو اس وقت سے اب تک وہ چار ہزار عالموں کی سیر کر چکا ہے ــــ نعمۃ اللہ جزائری نے شرح صحیفہ کاملہ میں یہ جملہ اس روایت میں اضافہ کیا ہے کہ یہ دُنیا اپنے مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔

(۴) وَعَنْ تَفْسِیْرِ ابْنِ شَھْرَآشُوْبَ عَنْہُ (ص) اِنَّ لِلّٰہِ ثَمَانِیَۃَ عَشَرَ اَلْفَ عَالَمٍ وَاحِدُھَا الدُّنْیَا ۔[۳]

رسول اللہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ جن میں سے ایک یہ دُنیا ہے۔

---

[۱] خصال صدوق جلد دوم صفحہ ۴۳۶۔

[۲] منہج البیان جلد اول صفحہ ۴۴۴۔

[۳] منہج البیان جلد اول صفحہ ۴۴۴۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی روایات کثرتِ عوالم پر دلالت کرتی ہیں، اس سلسلے کے بیشتر مسائل و مباحث بحار الانوار کتاب السماء والعالم میں اور الھیئۃ والاسلام شہرستانی میں دیکھے جاسکتے ہیں عوالم کی تعداد کا اختلاف درحقیقت اختلاف نہیں ہے، بلکہ ان کی کثرت پر دلالت کرتا ہے یا ممکن ہے کہ ان بیانات میں عوالم کے اقسام کے اعتبار سے تعداد بتلائی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب ہم حدوثِ عالم اور اثبات واجب الوجود پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

حدوث مادہ اور واجب الوجود

اگرچہ ان دونوں اصطلاحوں کا تعلق فلسفہ اور علم کلام سے ہے۔ لیکن ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ حدوثِ مادہ سے مراد یہ ہے کہ مادہ اپنے وجود میں ہمیشگی نہیں رکھتا بلکہ وہ عدم سے وجود میں آیا ہے۔ اور واجب الوجود سے مراد ایسی ذات ہے جو عدم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی ذات کی ہمیشگی ذاتی ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں میں ربط یہ ہے کہ اگر حدوثِ مادہ ثابت ہو جائے تو واجب الوجود کے لیے الگ سے دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر واجب الوجود کی ذات ثابت ہو جائے تو حدوثِ عالم خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

اس کائنات کے متعلق ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی اصل فقط اور فقط مادہ ہے یہ پوری کائنات مادّی اجسام پر مشتمل ہے اور ان کے علاوہ اس کائنات میں کوئی اور شے نہیں ہے۔ یہ مادی کائنات قدیم ہے ہمیشگی اس کا ذاتی وصف ہے۔ نشوونما، حرکت و سکون، عقل و شعور اور موت و حیات وغیرہ سب کچھ مادہ ہی کی مختلف کیفیات ہیں جو اس پر مختلف حالات میں طاری ہوتی رہتی ہیں۔

پچھلے مباحث میں یہ اشارہ کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید ہر سطحِ فکر کے لیے ہدایت ہے وہ اپنے براہین کو فلسفہ کی مصنوعی پوشاک نہیں پہناتا یہی سبب ہے کہ رب العالمین کی سیدھی سادی ترکیب میں حدوثِ مادہ اور اثباتِ واجب الوجود دونوں کی دلیلیں موجود ہیں لیکن فلسفہ و علم کلام میں ان مسائل کو خالص فنی طریقوں سے زیرِ بحث لایا گیا ہے اور مختلف زاویوں سے ادلّہ و براہین قائم کیے گئے ہیں ۔ ہزاروں ہزار صفحات پر مشتمل یہ مباحث ایک ایسا میدانِ جنگ ہیں، جہاں ہر تلوار دوسرے کے خلاف اٹھی ہوئی ہے۔ ان سارے مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف ایک ایسی دلیل کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں جو قرآن ہی سے مستفاد ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے سورج، چاند اور ستارے کے ڈوب جانے سے وجودِ خدا پر استدلال قائم کیا تھا (سورۂ انعام) اس استدلال میں حرکت و سکون کے مسئلے کی طرف ذہن انسانی کو متوجہ کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جو شے بھی متحرک ہوگی وہ حادث ہوگی اور جو شے حادث ہوگی وہ واجب الوجود نہیں ہوسکتی۔ اس ایک

دلیل کو سمجھنے کے لیے فلسفۂ حرکت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اس مقام پر نیوٹن کے تین اصول حرکت بیان کیے جائیں۔ انگریزی عبارت حسب ذیل ہے:۔

NEWTON'S THREE LAWS :

1. Every body continues in its state of rest, or of uniform motion in a straight line except so far as it may be compelled by force to change the state.

2. Change of motion is proportional to force applied, and takes place in the direction of the straight line in which the force acts.

3. To every action there is always an equal and contrary re-action.

ترجمہ

قانون اوّل

کسی جسم کی سکون کی حالت یا خطِ مستقیم میں اس کی یکساں حرکت کی حالت ہرگز نہیں بدل سکتی۔ جب تک کہ کوئی بیرونی قوت اس پر عمل کر کے اس کی حالت کو نہ بدلے۔

قانون دوّم

معیار حرکت کی شرحِ تبدل، قوت عاملہ کے متناسب ہوتی ہے اور اس کی سمت، اس خط مستقیم کی سمت ہوتی ہے۔ جس میں کہ قوت عمل کرتی ہے۔

قانون سوّم

ہر ایک عمل قوت کے متساوی اور متقابل ایک جواب عمل ہوتا ہے۔

ان تینوں قوانین کا کوئی برہانی یا تجرباتی یا دیگر ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ان قوانین پر تمام علم حرکت کی بنیاد ہے اور علم حرکت پر علم ہیئت مبنی ہے اور علم ہیئت سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں اور جو پیش گوئیاں کی جاتی ہیں ان کا تطابق عینی مشاہدات عالم سے ہوتا ہے جو اس قدر مکمل ہے کہ اس علم کے بنیادی قوانین کا غلط ہونا حیطہ قیاس سے باہر ہے۔ مثلاً بحری جنتری چار سال پہلے شائع ہوتی ہے اور اس میں چاند اور سیاروں کی حرکات کے متعلق پیش گوئیاں ہوتی ہیں ' در سورج گرہن اور

چاند گرہن کے متعلق وقت و مقام کی شرح ہوتی ہے اور یہ تمام پیش گوئیاں صحیح نکلتی ہیں۔ پس مندرجہ بالا قوانین حرکت کی صحت پر ہمارے اعتقاد کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جو نتائج ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے مشاہدات سے متفق و مطابق ہیں (علم حرکت ترجمہ فضل محمد خاں صاحب صفحہ ۱۰۷-۱۰۸)

تبصرہ

مصنف قانون حرکت کا یہ کہنا کہ "ان تینوں قوانین کا کوئی برہانی یا تجرباتی یا دیگر ثبوت نہیں دیا جا سکتا" درست نہیں ہے۔ کیونکہ قانون اول کہ "کسی جسم کا سکون یا حرکت ایک دوسرے سے اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کوئی بیرونی قوت اس پر عمل کر کے اس حالت میں تبدیلی واقع نہ کر دے۔" اس حقیقت کا فطری نتیجہ ہے کہ جسم اپنے حد ذات میں نہ متحرک ہے نہ ساکن۔ کیونکہ اگر حرکت اس کی ذاتی ہوتی، جیسے پانی کے لیے آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں تو (جسم) کبھی ساکن نہ ہوتا جیسے پانی کی ذات سے یہ دونوں اجزا جدا نہیں ہو سکتے، اگر جدا ہو جائیں تو پانی پانی نہ رہے۔ اسی طرح سکون کسی جسم کا ذاتی جزء نہیں ہے۔ اسی لیے حالت سکون میں بھی جسم، جسم رہتا ہے اور حالتِ حرکت میں بھی۔ لہٰذا متحرک ہے تو اسے ساکن کرنے کے لیے بیرونی قوت درکار ہے اور ساکن ہے تو متحرک کرنے کے لیئے بیرونی قوت درکار ہوگی۔

اور یہ بات مشاہدے اور تجربے میں بھی آچکی ہے اور آتی رہتی ہے کہ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرنے کے لیے خارجی قوت بہم پہنچائی جاتی ہے اور جو شخص یہ انتظار کرے کہ موٹر خود چلے گی یا خود رُکے گی اُسے حماقت سے منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا اوپر کی دلیل عقلی اور یہ مشاہدہ و تجربہ دونوں قانون اوّل کے بُرہانی ہونے کو ثابت کرتے ہیں۔ علم ہیئت کے نتائج یا جبری جنتری سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ علم ہیئت خود حرکت کا نتیجہ اور اس کا ضابطہ ہے اور حرکت اس کا سبب ہے۔ مسبب اور نتیجہ سے سبب پر استدلال کرنا برہان ضعیف کہا جاتا ہے اس کے برعکس اگر حرکت سیارات کا انضباط کیا جائے اور اس کے نتیجہ میں علم ہیئت کی تشکیل ہو تو برہان قوی ہوگا اور ہے بھی یہی۔! علماء علم ہیئت نے پہلے سیارات کی حرکت پر نظر کی، ان کی تیزی و سستی کو ضابطے میں لائے باہم کے مقابلے اور ان کی رفتار کے رُخ کی تحدید کی پھر علم ہیئت مرتب کیا۔ اور ان تمام باتوں میں وہ تینوں قانون کارفرما ہیں اور واقعہ ہے کہ کوئی حرکت ان قوانین سے باہر نہیں ہے، جو ذرا سے تامل و فکر سے واضح ہو سکتا ہے۔

ہر حال! ان تینوں قوانین سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہر متحرک اپنی بیرونی قوت سے حرکت میں آتا

ہے جب یہ مسلّم ہے کہ کسی جسم کو متحرک کرنے کے لیے کسی قوت عاملہ کی ضرورت ہے تو ذرا مسئلہ دفع پر نظر کرو اور غور کرو کہ قوتِ دافعہ یعنی علت دفع جس رُخ پر ہوگی اسی رُخ پر دفع کرے گی، بشرطیکہ دفع کے رُخ پر کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو

یہ معلوم ہے کہ حرکت یا مستقیم ہوتی ہے یا دوری۔ اگر دو جسموں میں تدافع (ٹکر) ہو اور ان میں سے کوئی چرخہ نما نہ ہو تو ٹکر کے بعد علٰحدگی بخط مستقیم ہوگی۔ جیسے ریل گاڑی کے دو ڈبوں کی ٹکر کہ ہر ڈبہ اپنی پچھلی طرف بخطِ مستقیم واپس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے پہیے لوہے کی سیدھی پٹڑی پر آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں۔ ٹکر سے پہلے دونوں ڈبے ایک دوسرے کی طرف متحرک تھے۔ ٹکرؔ کی پہلی آن میں دونوں کی پہلی حرکتیں ختم ہوئیں، دوسری آن میں دوسری مختلف حرکت پیدا ہوگئی۔ ہر دو چیزوں کی ٹکر میں پہلی حرکت ختم ہوکر دوسری ٹکر اس حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ حرکت دونوں جسموں کی متوازن ہو یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے، جس پر دلیل قائم کرنا مشاہدہ اور مشاہدہ کرنے والے دونوں کی توہین ہے۔

اس مشاہدے سے چند باتیں ذہن میں آتی ہیں۔

(۱) مادہ حرکت اور سکون دونوں سے متصف ہوتا رہتا ہے۔

(۲) حرکت ہوتی ہے تو سکون نہیں ہوتا اور سکون ہوتا ہے تو حرکت نہیں ہوتی ایک کا وجود دوسرے کا عدم ہے۔

(۳) مادہ دونوں حالتوں میں اپنی حقیقت پر باقی رہتا ہے۔

(۴) لہٰذا حرکت و سکون مادّے کا ذاتی اقتضا نہیں ہیں۔ جیسے پانی کے لیے آکسیجن اور ہائیڈروجن کہ پانی انکے بغیر موجود نہ ہوگا ــــ بلکہ مادّے کے لیے حرکت و سکون ایسے ہیں جیسے پانی کے لیے حرارت (گرمی) اور برودت (سردی) دونوں حالتوں میں پانی پانی ہی رہتا ہے۔ ایسا نہیں کہ حرارت نہ ہو تو پانی نہ رہے یا برودت نہ ہو تو پانی معدوم ہوجائے۔ اسی طرح ایسا نہیں کہ حرکت نہ ہو تو مادہ غائب یا سکون نہ ہو تو مادّہ مفقود۔

(۵) حرکت یا سکون دونوں میں سے کوئی ازلی نہیں ہے، ورنہ ان میں سے کوئی فنا نہ ہوتا۔ دونوں یکے بعد دیگرے فنا ہوجاتے ہیں اور جو شے ازلی ہوتی ہے وہ چونکہ ذاتی وجود رکھتی ہے اس لیے فنا نہیں ہوسکتی۔

اب اگر فرض کیا جائے کہ یہ عالم ازلی ہے تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ عالم اور اجزائے عالم بغیر حرکت یا سکون کے پائے نہیں جاسکتے۔ لہٰذا عالم کے ساتھ ساتھ حرکت و سکون کو بھی ازلی تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ کہنے کا امکان نہیں کیونکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ حرکت و سکون ازلی نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہنے کا امکان نہیں کہ عالم تھا مگر اس کے ساتھ نہ حرکت تھی نہ سکون۔ کیونکہ جو اس بات کا دعویٰ کرے

اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ جب نہ حرکت تھی نہ سکون، تو وہ تیسری حالت جو ان دونوں سے الگ ہو وہ کیا ہے؟ اور یہ بتانا محال ہے، کیونکہ حرکت نہ ہوگی تو سکون ہوگا اور سکون نہ ہوگا تو حرکت ہوگی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان دو کے علاوہ کسی تیسری حالت کا ہونا محال ہے اور محال موجود نہیں ہوتا۔

پس اب صرف دو صورتیں ہیں۔

(۱) ازل میں عالم بے حرکت و سکون تھا اور اس کا محال ہونا ثابت ہو چکا۔

(۲) عالم ازلی نہیں ہے حادث ہے عدم سے وجود میں آیا ہے۔

(یہ عالم) جب وجود میں آیا تو یا مجموعًا ساکن تھا، پھر بعد کو اس کے بعض اجزا متحرک ہوئے یا مجموعًا متحرک تھا پھر بعض اجزا ساکن ہوئے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم عدم سے وجود میں آیا تو حرکت و سکون دونوں کی صلاحیت لے کر آیا اور جب عالم ازلی (قدیم) نہ ٹھہرا تو اسے موجود ہونے میں ایسی ذات کی احتیاج ہے جو اپنی ذات سے موجود ہو اس پر کبھی عدم نہ رہا ہو، وہ اپنے ہونے میں کسی کا محتاج نہ ہو اور مصدرِ وجود و منبع وجود ہو، جو جسے چاہے وجود عطا کر دے، کیونکہ بغیر ایسی ذات کے ماننے ہوئے عالم کے موجود ہونے پر اور کسی قسم کی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔[1]

اثبات واجب الوجود، حدوث مادہ اور حدوث عالم پر ایسی بہت سی دلیلیں کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن صاحبانِ نظر جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہل بیتؑ نے ان موضوعات پر جس طرح گفتگو فرمائی ہے وہ عقاید کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ بحثیں احتجاج طبرسیؒ وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے فقط ایک بحث اس مقام پر نقل کی جاتی ہے تاکہ ارباب بصیرت پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان مسائل کی ساری شمعیں اس ایک شمع حقیقت سے جلی ہیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے آبا رکرامؑ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن یہودی، عیسائی، دہریہ ثنویین، اور مشرکین، رسول اللہ کے پاس آئے تاکہ ان سے مناظرہ کریں، آپ نے ان سے مناظرہ فرمایا، گفتگو کرتے کرتے جب دہریوں کی نوبت آئی۔

"ثُمَّ اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَلَى الدَّهْرِيَّةِ فَقَالَ وَاَنْتُمْ فَمَا الَّذِيْ دَعَاكُمْ اِلَى الْقَوْلِ بِاَنَّ الْاَشْيَاءَ لَا بَدْءَ لَهَا وَهِيَ دَائِمَةٌ لَمْ تَزَلْ وَلَا تَزَالُ"

فَقَالُوْا لِاَنَّا لَا نَحْكُمُ اِلَّا بِمَا نُشَاهِدُ وَلَمْ نَجِدْ لِلْاَشْيَاءِ حُدُوْثًا فَحَكَمْنَا بِاَنَّهَا لَمْ تَزَلْ وَلَمْ نَجِدْ لَهَا انْقِضَاءً وَفَنَاءً فَحَكَمْنَا

---

[1] یہ پوری بحث رسالہ علم کلام مولانا محمد مصطفٰے جوہرا(مخطوطہ) کے مختلف اقتباسات پر مشتمل ہے۔

بِاَنَّهَا لَا تَزَالُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ۔

اَفَوَجَدْتُمْ لَهَا قِدَمًا اَمْ وَجَدْتُمْ لَهَا بَقَاءً اَبَدَ الْاَبَدِ فَاِنْ قُلْتُمْ اِنَّكُمْ وَجَدْتُمْ ذٰلِكَ اَنْهَضْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ اِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوْا عَلٰى هَيْئَتِكُمْ وَعُقُوْلِكُمْ بِلَا نِهَايَةٍ وَلَا تَزَالُوْنَ كَذٰلِكَ وَلَئِنْ قُلْتُمْ هٰذَا دَفَعْتُمُ الْعِيَانَ وَكَذَّبَتْكُمُ الْعَالِمِيْنَ الَّذِيْنَ يُشَاهِدُوْنَكُمْ۔

قَالُوْا بَلْ لَمْ نُشَاهِدْ لَهَا قِدَمًا وَلَا بَقَاءً اَبَدَ الْاَبَدِ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَالِهٖ وَسَلَّمَ فَلِمَ صِرْتُمْ بِاَنْ تَحْكُمُوْا بِالْقِدَمِ وَالْبَقَاءِ دَائِمًا لِاَنَّكُمْ لَمْ تُشَاهِدُوْا حُدُوْثَهَا وَانْقِضَاءَهَا اَوْلٰى مِنْ تَارِكِ التَّمْيِيْزِ لَهَا مِثْلَكُمْ فَيَحْكُمُ لَهَا بِالْحُدُوْثِ وَالْاِنْقِضَاءِ وَالْاِنْقِطَاعِ لِاَنَّهٗ لَمْ يُشَاهِدْ لَهَا قِدَمًا وَلَا بَقَاءً اَبَدًا اَوَلَسْتُمْ تُشَاهِدُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاحِدُهُمَا بَعْدَ الْاٰخِرِ۔

فَقَالُوْا نَعَمْ۔

فَقَالَ اَتَرَوْنَهُمَا لَمْ يَزَالَا وَلَا يَزَالَانِ۔

فَقَالُوْا نَعَمْ۔

قَالَ اَفَيَجُوْزُ عِنْدَكُمْ اِجْتِمَاعُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔

فَقَالُوْا لَا۔

فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ فَاِذًا مُنْقَطِعٌ اَحَدُهُمَا عَنِ الْاٰخِرِ فَيَسْبِقُ اَحَدُهُمَا وَيَكُوْنُ الثَّانِيْ جَارِيًا بَعْدَهٗ۔

قَالُوْا كَذٰلِكَ هُوَ۔

فَقَالَ قَدْ حَكَمْتُمْ بِحُدُوْثِ مَا تَقَدَّمَ مِنْ لَيْلٍ وَنَهَارٍ لَمْ تُشَاهِدُوْهُمَا فَلَا تُنْكِرُوا اللّٰهَ قُدْرَةً۔

ثُمَّ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ اَتَقُوْلُوْنَ مَا قَبْلَكُمْ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مُتَنَاهٍ اَمْ غَيْرُ مُتَنَاهٍ فَاِنْ قُلْتُمْ اِنَّهٗ غَيْرُ مُتَنَاهٍ فَقَدْ وَصَلَ اِلَيْكُمْ اٰخِرٌ بِلَا نِهَايَةٍ لِاَوَّلِهٖ وَاِنْ قُلْتُمْ مُتَنَاهٍ فَقَدْ كَانَ وَلَا شَيْءَ مِنْهُمَا۔

قَالُوْا نَعَمْ!

قَالَ لَهُمْ أَفَقُلْتُمْ إِنَّ الْعَالَمَ قَدِيْمٌ غَيْرُ مُحْدَثٍ وَ أَنْتُمْ عَارِفُوْنَ بِمَعْنَى مَا أَقْرَرْتُمْ بِهِ وَبِمَعْنَى مَا جَحَدْتُمُوْهُ۔

قَالُوْا نَعَمْ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ فَهٰذَا الَّذِيْ تُشَاهِدُوْنَهُ مِنَ الْأَشْيَاءِ بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ يَفْتَقِرُ لِأَنَّهُ لَا قِوَامَ لِلْبَعْضِ إِلَّا بِمَا يَتَّصِلُ بِهِ كَمَا تَرَى الْبِنَاءَ مُحْتَاجًا بَعْضُ أَجْزَائِهِ إِلَى بَعْضٍ وَإِلَّا لَمْ يَتَّسِقْ وَلَمْ يَسْتَحْكِمْ وَكَذٰلِكَ سَائِرُ مَا نَرَى۔

قَالَ فَإِذَا كَانَ هٰذَا الْمُحْتَاجُ بَعْضُهُ إِلَى بَعْضٍ لِقُوَّتِهِ وَتَمَامِهِ هُوَ الْقَدِيْمُ فَأَخْبِرُوْنِيْ إِنْ لَوْ كَانَ مُحْدَثًا كَيْفَ كَانَ يَكُوْنُ وَمَا ذَا كَانَتْ تَكُوْنُ صِفَتُهُ

قَالَ فَبُهِتُوْا وَعَلِمُوْا أَنَّهُمْ لَا يَجِدُوْنَ لِلْمُحْدَثِ صِفَةً يَصِفُوْنَهُ بِهَا إِلَّا وَهِيَ مَوْجُوْدَةٌ فِيْ هٰذَا الَّذِيْ زَعَمُوْا أَنَّهُ قَدِيْمٌ فَوَجَمُوْا وَقَالُوْا سَنَنْظُرُ فِيْ أَمْرِنَا۔ [1]

تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ دہریوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اب تم بتلاؤ کہ تم نے کیوں یہ قول اختیار کیا ہے کہ اشیاء کی کوئی ابتدا نہیں ہے وہ دائمی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔؟

انھوں نے کہا اس لیے کہ ہم فقط اسی چیز پر حکم لگاتے ہیں جسے مشاہدہ کرتے ہیں اور ہم نے اشیاء میں حدوث نہیں پایا تو ہم نے حکم لگا دیا کہ وہ ازل سے ہیں اور ہم نے ان کو فنا و ختم ہوتے نہیں دیکھا۔ اس لیے حکم لگایا کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔

---

[1] احتجاج طبرسی صفحہ ۵ مطبوعہ ایران ۱۳۰۲ھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
کیا تم نے ان کا قدیم ہونا دیکھا ہے یا ان کے بقاء و دوام کو دیکھا ہے، اگر اثبات میں جواب دو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی ازل سے اپنے جسموں اور اپنی عقلوں کے ساتھ ہو اور تمھاری کوئی انتہا نہیں؟ اور اسی طرح ہمیشہ رہو گے اور اگر تم واقعاً ہی کہو گے تو تم نے ظاہر کی مخالفت کی اور ان لوگوں کی تکذیب کی جو تم سے واقف ہیں۔
انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اشیار کی بقا اور ان کا قدم نہیں دیکھا۔
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے کہا۔
پھر کیوں اس کے قائل ہو کہ اشیار ہمیشہ سے قدیم اور باقی ہیں۔
وہ تم سے زیادہ اولی ہے جو تمھاری ہی طرح مشاہدہ پر اعتماد کر کے کہے کہ اشیا حادث، فانی اور ختم ہونے والی ہیں۔ کیونکہ اس نے ان اشیا میں قدم اور بقاء دوام کو نہیں دیکھا ہے۔ کیا تم رات اور دن کو یکے بعد دیگرے یہ رات دن آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھتے ہو؟
انھوں نے کہا کہ ہاں دیکھتے ہیں تو فرمایا کہ کیا تمھاری رائے یہ ہے کہ اسی طرح ازلی وابدی ہیں؟
انھوں نے کہا کہ ہاں۔
تو آپ نے فرمایا کہ کیا تمھارے خیال میں رات دن کا جمع ہونا جائز ہے۔
انھوں نے کہا کہ نہیں۔
تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے جب ایک طلوع کرے گا اور دوسرا جائے گا تو یقیناً ان میں سے ایک سابق ہے اور دوسرا اس کے بعد میں آرہا ہے۔
انھوں نے کہا کہ واقعاً ایسا ہی ہے۔
تو آپ نے فرمایا کہ تم نے گزرے ہوئے دن رات کے حدوث کا حکم لگا دیا۔ حالانکہ تم نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا ہے تو تم اللہ کی قدرت کا انکار نہ کرو۔
پھر آپ نے سوال کیا کہ تم سے پہلے جو دن رات گزر گئے وہ متناہی تھے یا غیر متناہی تھے؟ اگر کہو کہ لامتناہی تھے تو تم تک ایسا آخری (دن یا رات) آیا ہے جس کے آغاز کا کوئی سرا نہیں ہے اور کہو کہ متناہی تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تھا اور ان دونوں

میں سے کچھ نہ تھا۔
انھوں نے کہا کہ ہاں۔
پھر فرمایا کہ کیا تم کہتے ہو کہ عالم قدیم ہے حادث نہیں ہے؟ اور تم خوب جانتے ہو جس معنی کا اقرار کر چکے ہو اور اسے بھی خوب جانتے ہو، جس کا انکار کر چکے ہو۔
انھوں نے کہا کہ ہاں۔
آپ نے فرمایا کہ تم جو اشیاء عالم میں سے چیزوں کا مشاہدہ کر رہے ہو تو یہ سب ایک دوسرے کی محتاج ہیں ایک شے کو دوسری سے اتصال کے بغیر قوام نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ عمارت کے اجزا ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں ورنہ نہ تو ان میں ترتیب پیدا ہو سکتی ہے اور نہ استحکام۔ یہی حال ان ساری چیزوں کا ہے۔ جنہیں ہم دیکھتے ہیں۔
فرمایا کہ یہ اشیاء اپنی قوت اور تمامیت میں ایک دوسرے کی محتاج ہیں اگر یہ قدیم ہیں تو پھر مجھے تبلاؤ کہ اگر یہ حادث ہوتیں تو کیسی ہوتیں! ان کی صفت کیا ہوتی؟
یہ سن کر وہ مبہوت ہو گئے اور جان گئے کہ جو بھی صفت حادث میں ہو سکتی ہے۔ وہ سب ان اشیاء میں موجود ہے جسے وہ قدیم سمجھ رہے ہیں لہذا انھوں نے سکوت کیا اور کہا کہ ہم اپنے عقیدے میں دوبارہ غور کریں گے[1]

*

---

[1] والد ماجد مولانا محمد مصطفٰے جوہر اعلی اللہ مقامہ نے اس پورے مناظرے کو تشریح کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اور وہ "خدا کا وجود اور توحید" کے نام سے مجلس المسلمین رضویہ سوسائٹی کی نگرانی میں طبع ہوا ہے۔

اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وہ رحمان ورحیم ہے

ان دونوں لفظوں کی تشریح بسملہ کے ذیل میں ذکر کی جا چکی ہے۔ اب سوال فقط یہ ہے کہ جب بسملہ میں یہ دونوں صفتیں ذکر کی جا چکی تھیں تو وہ کون سی مصلحت تھی کہ دوبارہ انھیں ذکر فرمایا گیا ہے؟ اس کا جواب مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ بسملہ میں اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لانا اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا تقاضا تھا اور دوبارہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ عدم سے وجود میں لانے کے بعد موجودات کی بقاء اور موجودات میں سے مکلفین کی جزا بھی اس کی انھیں صفتوں کا تقاضا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بسملہ میں ان دونوں صفات کے اظہار سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ وہ ذاتاً رحمٰن ورحیم ہے اور دوبارہ انھیں اس لیے بیان کیا گیا کہ عملاً بھی ایسا ہی ہے۔

ان دو لفظوں کو اگر سیاق وسباق کے ساتھ دیکھا جائے تو فکر کا ایک نیا افق نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ پروردگار نے ان دو صفتوں کی تکرار سے اپنے دعوے پر دلیل قائم کی ہے اور ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب مرحمت فرمایا ہے کہ جب تک عالمین ہیں اس وقت تک انھیں ربوبیت کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے رب کا وجود ہر دور میں (بلا قید زمان) ضروری قرار پاتا ہے تاکہ وہ اپنے عمل ربوبیت کو جاری رکھ سکے اور اس ربوبیت کے لیے وجود رحمت ضروری ہے اس لیے کہ پورا نظام ربوبیت اس کے نظام رحمت ہی کا ایک جز ہے یہی سبب ہے کہ "ربّ العالمین" کے بعد دوبارہ "الرحمٰن الرحیم" ارشاد فرمایا گیا۔

اس کی تشریح مزید یہ ہے کہ جیسے ہی "ربّ العالمین" کہا گیا۔ ذہن میں فوری طور سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیوں پال رہا ہے کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جو عالمین کو پال رہا ہے تو اس پرورش میں اس کا اپنا کوئی فائدہ مضمر ہے؟ اس لیے ربوبیت کے اعلان کے فوری بعد یہ صفات دوبارہ بیان فرما دیں تاکہ پتا چل جائے کہ یہ عالمینی ربوبیت اس کی رحمتِ عامہ کا تقاضا ہے، وہ اس لیے پال رہا ہے کہ اس میں صفتِ رحمانیت ورحیمیت پائی جاتی ہے۔ اور کائنات سے اس کا رشتہ رحمت کا رشتہ ہے۔

اس تکرار میں مزید لطافت یہ ہے کہ اس آیت سے فوراً قبل ربّ العالمین ہے اور اس آیت

کے فوراً بعد "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن" ہے اور درمیان میں یہ آیت "الرحمٰن الرحیم" ہے۔ رحمٰن کے معنی ہیں حاجتوں کو دیکھ کر دینے والا تو سب کو دے گا اس لیے کہ "رب العلمین" ہے اور رحیم کے معنی ہیں، عمل کو دیکھ کر قیامت میں دینے والا تو قیامت میں دے گا اس لیے کہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ رحمانیت و رحیمیت میں اپنے جمال کا اظہار فرمانے کے بعد مالك یوم الدین میں اپنے جلال کا اعلان فرمایا تاکہ رحمت کی تکرار بندوں کو گناہوں پر جری نہ بنا دے، وہ خوف و رجا کے درمیان زندگی گزاریں اطاعت میں کوشاں رہیں اور معصیت سے گریز اختیار کریں۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

روزِ جزاء کا مالک ہے

مالک اسے کہتے ہیں جس کا کسی بھی شے پر قبضہ، اختیار اور اقتدار اور تصرف صحیح، درست اور جائز ہو پوری دُنیا ملکیت مجازی، ملکیت اعتباری اور ملکیت اضافی میں گھری ہوئی ہے، ملکیت حقیقی فقط اللہ کے لیے ہے اس لیے کہ ہر شے کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور جب چاہے پھر عدم میں لے جائے یہی حقیقی ملکیت کی شان ہے کہ جسے چاہے جو عطا کر دے اور جس سے جو چاہے چھین لے۔

یوم سے مراد زمانے کی ایک معین مقدار یا مدت ہے۔ یہ لفظ لغت کے اعتبار سے دن اور رات دونوں پر مشتمل ہے، قرآن نے اس کو مختلف ادوار اور مختلف زمانی وحدتوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں فرمایا۔

"كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" [1]

"ہر لمحہ اس کی نرالی شان ہے۔"

اسی طرح سورۂ حج میں ارشاد فرمایا۔

"وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" [2]

"اور ایک دن تمھارے اللہ کے نزدیک ایک ہزار برس ہے تمھاری گنتی کے اعتبار سے۔"

اس آیت میں بھی ایک زمانی وحدت ہی مراد ہے

"دین" کے معنی جزاء، حساب، طاعت، اقتدار، اور عدل و انصاف وغیرہ کے ہیں

---

[1] سورۂ رحمٰن آیت ۲۹۔

[2] سورۂ حج آیت: ۴۷۔

(صحاح، قاموس، مفردات، اقرب الموارد وغیرہ) ان معانی کی رُو سے یہ یوم الدّین، یوم الجزاء، یوم الحساب، یوم الطّاعۃ، یوم اظہار اقتدار الٰہی اور یوم عدل ہے۔

اس آیت مبارکہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ فقط روز قیامت کا مالک ہے اور اس دُنیا کا مالک نہیں ہے۔ "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" کہہ کر وہ دنیا پر اپنی مالکیت کا اظہار فرما چکا ہے۔ یعنی وہ دنیا و آخرت دونوں کا مالک ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دُنیا میں اس نے انسانوں کو جو ڈھیل دی ہوئی ہے وہ آخرت میں ختم ہو جائے گی اور اس دن اس کی مالکیت حقیقی کا ظہور ہوگا، قرآن مجید نے سُورہ انفطار میں اس دن کی اہمیت بتلاتے ہُوئے اور اس کی جامع ترین تعریف بیان کرتے ہوئے اس مفہوم کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔

"وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ"۔[1]

"اور تمھیں کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے۔"

"ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ"۔[2]

"پھر تمھیں کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے۔"

"يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ"[3]

"اس دن کسی کا کسی پر کوئی اختیار نہیں ہوگا اور سارا حکم اس دن اللہ ہی کے لیے ہوگا۔"

"یوم الدین" کی مالکیت کو اگر مندرجہ بالا آیات سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) انسانوں نے اپنی معاشرتی زندگی کو استوار رکھنے کے لیے قوانین وضع کیے ہیں اور ان قوانین سے سرتابی کرنے کی سزائیں بھی تجویز کی ہیں، پوری دنیا میں عدالتوں کا نظام قائم ہے جن میں مختلف جرائم پر مختلف سزائیں بھی دی جاتی ہیں، لیکن اس کے برخلاف قیامت میں یہ کام فقط خدائے ذوالجلال سے متعلق ہوگا۔ کسی دوسرے کو نہ سزا کا حق ہوگا اور نہ جزا کا۔

(۲) بہت سے مجرم قانون سازی یا نفاذ قانون کی خامیوں کے سبب قانون کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ لیکن اس دن اللہ کی دسترس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔

---

[1] سورۂ انفطار آیت: ۱۷۔

[2] سورۂ انفطار آیت: ۱۸

[3] سورۂ انفطار آیت: ۱۹

(۳) مذکورہ خامیوں کے سبب بہت سے ناکردہ گناہ افراد کو بھی سزا ہو جاتی ہے۔ اس دن ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس دن کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔

(۴) دنیاوی معاشروں میں قانون توڑنے کی سزا ہے۔ لیکن قانون پر عمل کرنے کی جزا نہیں ہے۔ چھوٹی سی مثال سے بات واضح ہو سکتی ہے کہ انسان زندگی بھر ٹریفک کے لال پیلے اور ہرے اشاروں کی پابندی کرتا ہے اسے حکومت کی طرف سے کوئی جزا نہیں ملے گی اور ایک دن اگر اشارہ توڑ دے تو سزا کا مستحق بن جائے گا۔ اس کے برخلاف وہ "یَوْمِ الدِّیْنِ" ہے اور دین کے معنی بدلے کے ہیں (اچھا ہو یا بُرا) اس دن اچھے اعمال کی جزا بھی ملے گی اور بُرے اعمال کی سزا بھی۔

بعض مفسرین نے "یَوْمِ الدِّیْنِ" سے روز قیامت کے ساتھ ساتھ اس دُنیا کا وہ زمانہ بھی مراد لیا ہے جس میں اللہ کا پسندیدہ دین کرۂ ارض پر نافذ ہوگا۔ اگر اس توجیہ کو بھی قبول کر لیا جائے تو یہ جملہ مبارکہ قیامت کے علاوہ رجعت کے عہد پر بھی ایک لطیف ترین اشارہ قرار پائے گا۔ ہم عقیدۂ رجعت پر ان شاء اللہ کسی مناسب موقع پر گفتگو کریں گے۔

"یَوْمُ الدِّیْنِ" کا قرآنی تصوّر

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کا نام اللہ ہے اور اس اللہ نے اس کائنات کو دقیق ترین حکمتوں اور ریاضیاتی اصولوں پر خلق کیا ہے۔ جہاں تک بھی انسان فطرت وطبیعت کی تہوں کو کھول سکا ہے اسے یہی نظر آرہا ہے کہ ہر ادنیٰ اور اعلیٰ تخلیق مکمل ترین منصوبہ بندی کا شاہکار ہے تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ اس خالق حکیم نے انسان کو کسی منصوبے کے بغیر خلق کر دیا ہو؟ اگر انسان کے سلسلے میں اس کا منصوبہ فقط اتنا ہے کہ انسان عدم سے آئے۔ اس دنیا میں اپنی عمر گزارے، پھر عدم میں چلا جائے تو اس منصوبے پر مندرجہ ذیل سوالات قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) کیا اربوں کھربوں سال پر محیط اس کائنات میں انسان کا حصّہ فقط اس کی مختصر سی عمر طبیعی ہے؟

(۲) کیا انسان کو جانوروں جیسی زندگی گزارنے کے لیے اس دُنیا میں بھیجا گیا؟

(۳) اور اگر ایسا ہے تو پھر عقل دینے کی کیا ضرورت تھی؟

(۴) انسان اس دنیا ہی میں کسی قانون کی پابندی کیوں کرے؟ اس لیے کہ اگر قیامت نہیں ہے، تو قانون توڑنا بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا قانون پر عمل کرنا۔

(۵) خدا ہی کو تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۶) انسانی زندگی میں خوشی کی مقدار کم ہے اور پریشانیاں، امراض، آفات اور آلام و مصائب زیادہ ہیں۔ کیا انسان اسی لیے پیدا کیا گیا ہے؟

(۷) بہت سے ایسے مجرم ہیں جو قانون کی دسترس میں نہیں آتے ان کا محاسبہ کیسے ہوگا؟

(۸) بہت سے ایسے نیک افراد ہیں جو اپنی پوری زندگی تزکیۂ نفس اور طہارتِ باطن کے ساتھ گزارتے ہیں، کیا موت کے بعد ایسے لوگ مجرمین کے برابر ہوں گے؟

(۹) اگر موت ہی ہر انسان کی زندگی کا حتمی نتیجہ ہے تو انسان کی فطرت میں ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش کیوں ودیعت کی گئی؟

(۱۰) انسان دُنیا کی ترقی میں کیوں حصہ لے؟ کیا اس لیے کہ اگلی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں؟ اگلی نسلوں کے فائدہ اُٹھانے سے اس انسان کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

ان سوالات کا کوئی مجموعی جواب تلاش کرنے سے قبل متکلمین کی ایک اصطلاح سے آشنا ہو جانا ہمیں مقصد سے قریب تر کر دے گا۔ "یوم الدین" یا قیامت کے لیے متکلمین نے معاد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ معاد کا لفظ مصدر، اسم مکان اور اسم زمان تینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، پہلے استعمال کے اعتبار سے معاد کے معنی پلٹنا، دوسرے کے اعتبار سے پلٹنے کی جگہ اور تیسرے استعمال کے اعتبار سے پلٹنے کے وقت کے ہوں گے۔ گویا معاد وہ زمانہ ہے۔ جب دوسرے جہان میں انسان کی رُوح اس کے بدن میں دوبارہ داخل ہوگی۔

دین کے جتنے بھی اصول و فروع ہیں اگر ان کی تلخیص کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ سارے کے سارے دو لفظوں کے تحت درج کیے جا سکتے ہیں۔ اور وہ ہیں مبدأ (آغاز) اور معاد[1] یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے ایمان باللہ کے فوراً بعد ایمان بالیوم الآخر کا تذکرہ کیا ہے اور یہ تذکرہ کم و بیش پچیس مقامات پر ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزِ جزا کا عقیدہ درحقیقت ایمان باللہ کا منطقی نتیجہ ہے جو شخص بھی مبدأ پر ایمان لائے گا اس کے لیے معاد پر ایمان لانا لازمی ہے۔ اس کے برعکس جو دہریہ ہیں ان کے لیے یہی دُنیا سب کچھ ہے اور "یَوْمِ الدِّیْن" یا روزِ جزا اور معاد نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن نے ان کے عقیدے کو نقل کیا ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ[2]

"وہ یہ کہتے ہیں کہ بس یہی ہماری دُنیاوی زندگی سب کچھ ہے ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں اور

---

[1] معروف فلسفی صدر الدین شیرازی کی ایک معرکہ آرا کتاب کا نام "المبدأ والمعاد" ہے۔

[2] سورۂ جاثیہ ۲۴

ہمیں تو بس دہر ہلاک کرتا ہے ان کے پاس اس کا کوئی علم نہیں ہے وہ فقط گمان پر بھروسہ کر رہے ہیں"۔

اگر دہریوں کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر وہ سارے سوالات اپنی جگہ پر برقرار رہیں گے لیکن اگر قرآن کے بتلائے ہوئے "یوم الدین" یا یوم آخر کو مان لیا جائے تو وہ سارے سوالات بیک قلم برطرف ہو سکتے ہیں۔ اب فقط یہ خلش ذہن میں باقی رہ جائے گی کہ قرآن کے اس قول کی، خود قرآن ہی کی روشنی میں عقلی یا منطقی توجیہ کیا ہے؟ تو اب ہم پھر گفتگو کو ان جملوں سے مربوط کرتے ہیں جو اس بحث کی ابتداء میں تحریر کیے گئے ہیں۔

خداوند عالم کا کوئی عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اور چونکہ وہ غنی مطلق ہے اور اسے کسی شے کی احتیاج نہیں ہے۔ اس لیے جو بھی اغراض و مصالح خلقت کائنات کے ہوں گے۔ وہ کائنات ہی کے فائدے کے لیے ہوں گے اس سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اس کائنات کی خلقت کے مکمل اغراض و مصالح جو بھی ہوں۔ ان میں سے ایک غرض اور ایک مصلحت خود انسان ہے یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر یہ بیان فرمایا ہے کہ رات دن، سورج، چاند اور ستارے انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں (نحل ۱۲) آسمان و زمین کی ہر شے انسان کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ (لقمان ۱۹، جاثیہ ۱۲) زمین و آسمان انسان کیلئے سازگار بنائے گئے ہیں (مؤمن ۶۶) تو یہ ساری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ لیکن خود انسان کس غرض کے لیے بنایا گیا۔ اس کا جواب ان آیتوں سے مل سکتا ہے۔

(۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۵۶﴾

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ﴿۵۷﴾

نہ میں ان سے کسی رزق کا طلب گار ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿۵۸﴾ [۱]

یقیناً اللہ ہی بڑا رزق دینے والا صاحب قوت اور مضبوط ہے۔

(۲) هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا ﴿۱﴾

یقیناً انسان پر زمانے کا ایک حصہ گزرا ہے کہ وہ قابل ذکر شے نہیں تھا۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ

---

[۱] سورۂ ذاریات: ۵۶ تا ۵۸

سَمِیْعًا بَصِیْرًا ② ؎۱

ہم نے انسان کو نطفۂ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ ہم اس کا امتحان لیں تو ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

یعنی غرض تخلیق انسانی عبادت اور امتحان ہے، تو کیا انسان کے عبادت کرنے سے اللہ کی کبریائی میں کوئی اضافہ ہوگا۔ کیا انسان کے سجدے ووٹ ہیں جو اس کی الوہیت کو مزید مضبوط بنادیں گے اور کیا وہ انسان کا امتحان لے کر اپنے علم میں کوئی اضافہ کرنا چاہتا ہے (نعوذ باللہ من ذٰلک) اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس عبادت و امتحان کے فوائد بھی انسان ہی سے متعلق ہوں گے۔ اب اگر ان فوائد سے دنیاوی زندگی اور اس کی نعمتوں کو مراد لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ۔

① دنیاوی زندگی آلام و مصائب سے گھری ہوئی ہے۔

② دنیاوی زندگی کی نعمتیں فانی ہیں۔

③ خود انسان فانی ہے۔

④ اس دُنیا میں ہر نعمت ہر ایک کو نہیں ملتی اکثر لوگ اکثر نعمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

⑤ اس دنیا میں اکثر نعمتوں کا حصول مشقت اور محنت پر ہوتا ہے۔

تو اگر انسان کی خلقت اسی دنیا اور انھیں دنیاوی نعمتوں کے لیے ہوئی ہے جن کی یہ خصوصیات بیان ہوئیں تو پھر یہ ایک ایسا عمل قرار پاتا ہے، جس کا کوئی مقصد نہیں ہے اس بات کو قرآن مجید میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ؎۲

کیا تمھارا گمان یہ ہے کہ ہم نے تمھیں بے مقصد خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔

اس لیے اگر اللہ انسانوں کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرنا ہی چاہتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا عالم ہو، جس میں بیان کردہ نقائص نہ ہوں اور وہی عالم "یوم الدین" یا "روز جزا" ہے۔ یہ اس یوم الدین کا مثبت پہلو ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ اگر قیامت نہ ہو تو خدا کا سارا منصوبۂ ہدایت یعنی عقل

؎۱ سورۂ دہر ۷۶: ۲۔

؎۲ سورۂ مومنون ۲۳: ۱۱۵۔

کا ودلیعت کرنا، رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا نازل کرنا، حلال وحرام اور خبیث وطیب میں تمیز قرار دینا عبث بلکہ غیر عقلی عمل قرار پائے گا۔ اس لیے کہ قیامت کے نہ ہونے کی صورت میں موت کے بعد مسلمین و مجرمین اور مومنین و کافرین سب برابر ہوں گے۔ بلکہ اطاعت گزار معصیت کاروں سے زیادہ خسارے میں رہیں گے اس لیے کہ معصیت کار عدم تقویٰ کے سبب، وقتی ہی سہی، مگر دنیا کی لذتوں سے بہرہ یاب تو ہوگئے اطاعت کرنے والے تو اس سے بھی محروم رہے۔

اور دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ تاریخ انسانیت کے آغاز سے کتنے مجرم ہیں جو محاسبے سے بچے رہے اور بچتے رہیں گے، کتنے مظلوم ہیں، جو دادرسی کی حسرت لیے ہوئے گزر گئے اور گزرتے رہیں گے اور کتنے معذور ہیں جو اچھی زندگی کی تمنا میں تڑپتے رہے اور تڑپتے رہیں گے اگر قیامت نہ ہو تو نہ مظلوموں کی دادرسی ہوگی اور نہ سزا سے بچے ہوئے مجرموں کا محاسبہ ہوگا اور نہ معذوروں کو ان کا حق مل سکے گا۔

یہی سبب ہے کہ مبدأ اور معاد یعنی اللہ اور روز جزا ہمارے ایمان کے ایسے بنیادی عنوانات ہیں کہ سارے ایمان انھیں کے ذیل میں مندرج ہوتے ہیں، قرآن مجید کے کم سورے ایسے ہیں گے۔ جن میں توحید اور قیامت کا کسی نہ کسی عنوان سے تذکرہ موجود نہ ہو اور یہ تذکرے بڑی شان و شوکت اور بڑے جلال کے ساتھ ہوئے ہیں اور ان میں وہ صراحت موجود ہے جو کسی عقیدے کے لیے ضروری ہے عقیدۂ قیامت کے سلسلے میں قرآن کے لب و لہجہ کی شان یہ ہے۔

"وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ" ؎۱

اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۙ لَمَجْمُوْعُوْنَ ڏ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ؎۲

کہ دو کہ اولین و آخرین یقیناً جمع کیے جائیں گے ایک معلوم دن کے معیّن وقت میں۔"

اس حتمی اور یقینی لب و لہجہ کے برخلاف منکرین روز جزا کے پاس اس عقیدے کے مقابل حتمیت نہیں پائی جاتی بلکہ تعجب، انکار اور استہزاء کی ملی جلی کیفیت ملتی ہے، جیسے بعض مقامات پر

؎۱ سورۂ حج، ۷۔

؎۲ سورۂ واقعہ، ۴۹۔۵۰۔

قرآن مجید نے نقل کیا ہے۔ جس کی فقط ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

" وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ " [1]

اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی خلقت کو بھول گیا کہا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ دو کہ انھیں وہی زندہ کرے گا۔ جس نے انھیں پہلی مرتبہ ایجاد کیا تھا اور وہ ہر تخلیق سے بخوبی واقف ہے۔

اعتراض اور جواب کے ذیل ہی میں دو لفظوں میں معاد پر مکمل دلیل فراہم کر دی "وَنَسِيَ خَلْقَهٗ" وہ اپنی خلقت کو بھول گیا کہ وہ مٹی تھا پھر اللہ نے اسے مٹی سے کھینچا۔ پھر نطفہ بنا کر ایک مستقر میں رکھا، پھر وہاں اسے علقہ، مضغہ سے گزارتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل ایک جسم بنا دیا، پھر اسے خلق آخر بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا تو وہ اللہ جو ابتداءً مٹی سے انسان بناتا ہے کیا وہ مٹی میں ملا کر دوبارہ اسے نہیں بنا سکتا۔ [2]

---

[1] سورۂ یٰس: ۷۸، ۷۹۔

[2] سورۂ مؤمنون: ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

ہم فقط تیری ہی عبادت کرتے اور فقط تجھی سے مدد مانگتے ہیں

اس آیت میں اِیَّاکَ ضمیر منفصل ہے اور فعل "نعبد" کا مفعول ہے اس لیے محل نصب میں ہے اس ترتیب کے اعتبار سے جس کی عبادت کی جارہی ہے اس کے ذکر کو مقدم رکھا گیا ہے اور خود عمل عبادت کو اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ

① عبادت ذات باری کے لیے مخصوص ہو جائے اور کسی دوسرے کے داخلے کی گنجائش نہ رہے۔

② عبادت ذات پر موتوف ہے، اس لیے پہلے ذات کے جلال و جبروت اور عظمت و قدرت کا تصور قائم ہو جائے تاکہ عبادت میں صحیح خضوع و خشوع کی کیفیت پیدا ہو سکے۔

③ عبادت کرنے والے کی انتہائی عاجزی اور فروتنی کا اظہار ہو جائے۔

عبادت کے معانی

صحاح

أَصْلُ الْعُبُوْدِيَّةِ الْخُضُوْعُ وَالذُّلُّ وَالْعِبَادَةُ الطَّاعَةُ

عبودیت کی اصل فروتنی اور عاجزی ہے اور عبادت کا مفہوم طاعت ہے،

قاموس

اَلْعُبُوْدِيَّةُ وَالْعُبُوْدَةُ وَالْعِبَادَةُ الطَّاعَةُ

عبودیت، عبودت اور عبادت کا مفہوم طاعت ہے۔

اقرب الموارد

اَلْعِبَادَةُ الطَّاعَةُ وَنِهَايَةُ التَّعْظِيْمِ

عبادت کا مفہوم طاعت اور اللہ کی انتہا درجہ کی تعظیم ہے۔

صاحب المیزان کے قول کے مطابق اَلْعِبَادَةُ هِيَ نَصْبُ الْعَبْدِ نَفْسَهُ

فِیْ مَقَامِ الْمَمْلُوْکِیَّۃِ لِرَبِّہٖ[1] بندے کا اپنے آپ کو رب کی مملوکیت میں قرار دینا عبادت ہے۔ سورۂ ذاریات میں جن وانس کی تخلیق کا مقصد عبادت کو قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔

قَالَ خَلَقَهُمْ لِلْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَالتَّكْلِيفِ وَلَيْسَتْ خِلْقَتُهُمْ جَبْرًا اَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلٰكِنْ خِلْقَتُهُمْ اِخْتِيَارًا لِيَخْتَبِرَهُمْ بِالْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَمَنْ يُطِيْعُ وَمَنْ يَعْصِيْ۔[2]

خدا نے انھیں امر ونہی اور احکام پر مکلف کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور اس نے انھیں عبادت پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ مختار بنایا ہے تاکہ امر ونہی میں ان کا امتحان لے کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے۔

اس روایت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ خدا کی عبادت سے مراد اس کے احکام اور اوامر و نواہی کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت وہی کرے گا جو دل سے اس کی الوہیت اور کبریائی کو تسلیم کرتا ہو۔ لہٰذا عبادت کے جتنے بھی معانی بیان کیے گئے ہیں ان سب کی بازگشت اسی روایت کے مرکزی مفہوم کی طرف ہے۔

دو طریقے

عبادت کا پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنے روزانہ یا ہفت روزہ مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے معبود یا بت وغیرہ کے سامنے کچھ مراسم بجالائے۔ یہ تصور عبادت عام طور سے دنیا کے مختلف ادیان ومذاہب میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا غلام سمجھے اور جس طرح غلام اپنے اعمال وافعال میں مکمل طور پر اپنے آقا کے اختیار میں ہوتا ہے، اسی طرح مکمل طور سے انسان اپنے آپ کو اپنے رب کے سپرد کر دے[3] اس طرح انسان کا کوئی عمل عبادت کے دائرہ سے خارج نہیں ہوگا۔

اس تصور عبادت کی روشنی میں "نَعْبُدُ" ایک ایسا اقرار ہے جو انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے اس اقرار کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے سارے اوامر و نواہی کے پابند ہیں، اس کے قائم کردہ حدود

---

[1] المیزان جلد اوّل صفحہ ۲۲۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم جلد دوم صفحہ ۳۳۱

[3] آقا اور غلام کی مثال فقط تقریب مفہوم کے لیے ورنہ درحقیقت اللہ کی مالکیت کے مقابلے میں آقا کی مالکیت ایک بے حیثیت شے ہے۔

کے پابند ہیں، اس کے حلال وحرام اور خبیث وطیب کے پابند ہیں۔ یہ ایک لفظ پورے اسلام اور پوری شریعت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس تصور عبادت کی روشنی میں لفظ عبادت کا مفہوم عام یہ ہوگا کہ پوری زندگی اللہ کے احکامات کی چھاؤں میں گزاری جائے اور مفہوم خاص یہ ہوگا کہ وہ اعمال وافعال جنہیں بطور خاص عبادت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، چاہے وہ ذہنی وقلبی ہوں یا جسمانی، انھیں بجالایا جائے۔ اس عبادت سے وہ اعمال وافعال مراد ہوں گے جنھیں فقہ میں معاملات، عقود اور ایقاعات کے مقابل بیان کیا جاتا ہے۔

صیغۂ جمع

نَعْبُدُ جمع کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں "ہم عبادت کرتے ہیں" جب کہ یہ بھی تعلیم دی جاسکتی تھی۔ کہ "میں عبادت کرتا ہوں" لیکن واحد پر جمع کو اس لیے ترجیح دی گئی کہ کمال بلاغت کا تقاضا یہی تھا۔

(۱) ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا نگراں قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ"

"تم میں ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے متعلق سوال کیا جائیگا۔"

اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا کہ انسان تنہا عبادت کر کے اپنے آپ کو اپنے فرائض سے سبکدوش نہ سمجھ لے بلکہ اسے دوسرے کا بھی خیال رہے۔ اور انھیں بھی عبادت کی طرف راغب کرتا رہے۔

(۲) انسان اپنی عبادت کو ایک مکمل وحدت قرار نہ دے، بلکہ ساری دُنیا کی عبادتوں کا ایک حصہ قرار دے تاکہ انانیت سے محفوظ رہ سکے اور یہ وسوسہ ذہن میں نہ آئے کہ "میں عبادت کرنے والا ہوں" بلکہ یہ بات ذہن میں آئے کہ ساری دُنیا کے عبادت کرنے والوں میں سے ایک میں بھی عبادت کرنے والا ہوں۔

(۳) ہر انسان مقام اظہار بندگی میں اپنے آپ کو پوری انسانیت کا نمائندہ قرار دے تاکہ اسلام کی اجتماعی رُوح باقی رہ سکے۔

(۴) اپنی عبادت کو صالحین کی عبادت میں ملا کر پیش کرے تاکہ اس کی قبولیت کا امکان بڑھ جائے۔

*

استعانت کا مفہوم

استعانت کے معنی مدد چاہنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں پروردگار کے اسمائے گرامی میں ایک اسم مستعان بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں " وہ جس سے مدد طلب کی جائے "۔ جب برادران یوسف نے حضرت یعقوب کے سامنے خون آلود پیراہن پیش کر کے من گھڑت واقعہ بیان کیا تو آپ نے جو جملے فرمائے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ:

" فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَاللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ " ۱

" پس جو تم بیان کرتے ہو اس پر بہترین صبر کرتا ہوں اور اللہ ہی مستعان ہے "۔

انسان کی زندگی گہوارے سے گور تک احتیاج کی زندگی ہے۔ اس کی زندگی کا آغاز بے علمی اور کم طاقتی سے ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے:

" وَاللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّہٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا " ۲

" اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے ارحام سے اس عالم میں باہر نکالا کہ تمہارے پاس کوئی علم نہیں تھا "۔

" وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا " ۳

" اور انسان کمزور خلق کیا گیا ہے "۔

آہستہ آہستہ معلم اور والدین کے ذریعہ ان دونوں عیبوں میں کمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے اس کی عمر آگے بڑھتی ہے ویسے ہی ویسے یہی دو عیب مختلف زاویوں سے اس کی زندگی پر محیط ہوتے جاتے ہیں۔ پوری کائنات کے مقابل اس کا حاصل کردہ علم ریگ زاروں کے ایک حقیر ذرہ سے بھی کم تر نظر آتا ہے اور زندگی کے ساتھ بڑھتے ہوئے مسائل کے مقابل اس کی کم طاقتی مزید نمایاں ہوتی رہتی ہے یہ زمان و مکان کا قیدی انسان اپنی حیات، اپنے رزق اور اپنے معاشرتی روابط میں کروڑوں دیکھی اور ان دیکھی اشیاء کی بیساکھیوں پر اپنے ایک دن کا سفر پورا کرتا ہے۔ وہ سراپا احتیاج ہے۔ اس کی طینت، اس کا خمیر، اس کے جسم و روح سب کے سب محتاج ہیں۔ وہ سانس لینے کے

---

۱ سورۂ یوسف، ۱۸۔

۲ سورۂ نحل، ۷۸۔

۳ سورۂ نساء، ۲۸

لیے ہوا کا محتاج ہے۔ پیاس بُجھانے کے لیے پانی کا محتاج ہے، شکم کی آگ بُجھانے کے لیے غذا کا محتاج ہے شفا پانے کے لیے دوا کا مُحتاج ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ ساری اشیاء جو اس کی احتیاج کو پورا کرتی ہیں، اپنے وجود میں دوسری اشیاء کی مُحتاج ہیں، یہی سبب ہے کہ استعانت انسان کا مزاج ہے۔ وہ استعانت کے بغیر ایک ثانیہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب اگر وہ اپنی استعانت کا دارومدار انھیں اشیاء پر رکھے جو خود محتاج ہیں تو اس کی حیوانی جبلت کا تقاضا تو پُورا ہو جائے گا لیکن عقل کی طلب پوری نہیں ہوگی جو اس کی انسانیت کا جوہرِ اصل ہے۔ لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسے کی بارگاہ میں دستِ استعانت دراز کرے جو عالمین کی کُل احتیاجات کا پُورا کرنے والا (ربّ العالمین) ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جو اس جُملے میں سکھلایا گیا۔ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم فقط تجھی سے مدد چاہتے ہیں اس لیے کہ تو ہی مستغنی بالذات ہے اور ہر ایک کی احتیاج کو پورا کرنے والا ہے۔

حصرِ استعانت

اگر استعانت ذاتِ پروردگار کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر دنیاوی آلات و اسباب سے استعانت کی حیثیت کیا ہوگی؟ اسے یُوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کافر کہے دوا سے شفا ہوتی ہے تو یہ جُملہ عین کفر ہے اس لیے کہ وہ خدا کا مُنکر ہے اور دوا ہی کو شفاء کا سببِ حقیقی سمجھتا ہے اور اگر یہی جُملہ مسلمان کہے تو یہ مطابقِ ایمان ہے۔ اس لیے کہ مسلمان خدا کو ہر شے کا سببِ حقیقی سمجھتا ہے اور باقی اشیاءً کو سببِ مجازی۔ استعانت کی صورتِ حال بھی یہی ہے، پوری دُنیا ایک دوسرے کی اعانت پر چل رہی ہے اگر اعانت و استعانت ایک دن کے لیے ختم ہو جائیں تو معاشرہ کا پورا کاروبار درہم برہم ہو جائے، اشخاص کی مدد، آلات کی مدد، ادویات کی مدد، طبیعی عوامل کی مدد فطرت اور عناصر کی مدد، ان میں سے کسی ایک سے بھی انسان بے نیاز نہیں ہے۔ اگر انھیں مستقل بالذات مددگار سمجھ لیا جائے تو یہی استعانت شرک ہوگی اور اگر انھیں اس رُخ سے دیکھا جائے کہ اللہ نے اس کائنات کو عالمِ اسباب قرار دیا ہے تو یہی استعانت مطابقِ ایمان ہوگی۔

اس طرح اگر بارگاہِ الٰہی کے مقربین سے استعانت کی جائے تو یہ درحقیقت خدا ہی سے استعانت ہوگی اس لیے کہ مُسلمان کے ذہن میں ہے کہ یہ لوگ اللہ کے مقرب بندے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر مقرب بندے نہ ہوتے تو مُسلمان ان سے استعانت نہ کرتا۔

*

جبر و تفویض

انسان کے اعمال و افعال کے سلسلہ میں متکلمین کے درمیان دو متضاد نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں ۔ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے کرنے پر مجبور ہے ۔کسی بھی کام کے ترک و فعل پر اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے ۔دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے کرنے میں مختار مطلق ہے اور خداوند عالم کا اس میں مطلق دخل نہیں ہے (اس کا نام تفویض ہے)

اس آیۂ مبارکہ کے دونوں اجزاء میں دونوں نظریوں کی رد کی گئی ہے ۔جبر کی رد اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے کی گئی ہے کہ اگر انسان عبادت پر مجبور کیا جاتا ہے تو عبادت کی نسبت انسان کی طرف نہ ہوتی اور تفویض کی رد اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" سے کی گئی کہ اگر انسان مکمل مختار ہے تو پھر مدد مانگنا بے معنی ہو جائے گا۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما

اگر اس آیۂ مبارکہ کو پچھلی آیت سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان اللہ کی بارگاہ میں اپنی یہ درخواست پیش کر رہا ہے کہ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں کہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔ ہدایت کی اہمیت کا اندازہ اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی دُعا ہے جو اللہ نے انسان کو سکھلائی ہے۔ لیکن اس منزل پر یہ سوال قابلِ حل ہے کہ جو شخص بھی خدا کی سکھلائی ہوئی اس دُعا کو طلب کرے گا وہ پہلے ہی سے ہدایت پر قائم ہوگا جبھی تو اسے توفیق ہوگی کہ وہ یہ دُعا مانگے تو جب وہ پہلے ہی سے ہدایت پر قائم ہے تو پھر یہ کس ہدایت کے پانے کی دُعا سکھلائی گئی ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے اللہ کے نظامِ ہدایت کو سمجھنا ضروری ہے۔

فطری ہدایت

انسان میں پائے جانے والے اعضاء وجوارح اور حواسِ خمسہ کے دو کردار ہیں۔ ایک ان کا ذاتی کردار ہے اور دوسرا انسان کے ارادے کے تابع ہے۔ آنکھ لال کو لال دیکھتی ہے اور نیلے کو نیلا ایسا نہیں ہوتا کہ وہ لال کو پیلا دیکھ لے اور پیلے کو کالا دیکھ لے۔ ہاتھ گرم کو گرم محسوس کرتا ہے۔ اور ٹھنڈے کو ٹھنڈا اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ زبان میٹھے کو میٹھا محسوس کرتی ہے اور کڑوے کو کڑوا اس کے برعکس نہیں ہوتا یہ ان اعضاء کا ذاتی کردار ہے جس کی بنیاد پر ہر عضو اپنے ذاتی کردار میں اس ہدایت کی پیروی کر رہا ہے جو اس کی فطرت میں اللہ کی جانب سے ودیعت کر دی گئی ہے اس بات کو سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے؛

"رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى"

"اللہ نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا کی اور ہر شے کی ہدایت کی۔" [1]

---

[1] اس ہدایت کی تشریح رب العالمین کے ذیل میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ (آیت ۵۰)

اسی ہدایت فطری کے تحت شہد کی مکھیاں اپنے چھتے بناتی ہیں، بیا اپنا نشیمن تعمیر کرتا ہے۔ چیونٹیاں اپنی بستیاں آباد کرتی ہیں، مچھلی کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے اور جانوروں اور انسانوں کے بچے اپنے سرچشمۂ غذ کو منہ میں لے کر چوسنے لگتے ہیں۔

لیکن یہی اعضا جب انسانی ارادے کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں تو ان کا دوسرا کردار سامنے آتا ہے۔ آنکھ غلط چیز کو بھی دیکھتی ہے اور صحیح کو بھی، ہاتھ مظلوم کی مدد بھی کرتا ہے اور ظالم کی بھی اسی طرح زبان حلال بھی چکھتی ہے اور حرام بھی اور یہی زبان سچ بھی بولتی ہے اور جھوٹ بھی۔ اس لیے ان اعضاء کو استعمال کرنے سے پہلے انسان کو یہ طے کرنا پڑے گا کہ کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے، کیسے چکھے اور کیسے نہ چکھے۔ اس لیے اُسے مشترک ہدایت کے علاوہ ایک دوسری ہدایت سے بھی سرفراز کیا گیا تاکہ وہ اپنے ارادوں کو اس ہدایت کے تابع رکھے۔

عقلی ہدایت

اعضاء و جوارح اور حواس خمسہ میں سے ہر ایک کی طاقت ایک معیّن حد میں کام کرتی ہے۔ ہاتھ میں وزن اٹھانے کی طاقت ہے لیکن ایک مخصوص حد تک، آنکھ دیکھتی ہے لیکن ایک خاص حدِ نظر تک، قدموں میں چلنے کی طاقت ہے لیکن چلتے چلتے یہ قدم جواب بھی دے جاتے ہیں، کان سنتے ہیں لیکن ایک مخصوص دائرے کے اندر کی آواز کو سنتے ہیں۔ اب انسان نے ان حدود کو توڑا اور تھکتے ہوئے قدموں کے لیے اس نے کاریں اور ریل، ہوائی جہاز اور دیگر وسائل ایجاد کیے۔ وزنی اشیاء کو اٹھانے کے لیے مختلف مشینیں وضع کیں آنکھ کی رویت کی حد کو توڑنے کے لیے دوربینیں اور خردبینیں ایجاد کیں۔ کان کی محدود قوت کے مقابل ریڈیو، ٹیلیفون اور ٹیلیویژن وغیرہ ایجاد کیے اور یہ ساری ایجادات و اختراعات اس لیے ممکن ہوئیں کہ اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرنے کے لیے عقلی ہدایت سے سرفراز کیا گیا ہے۔

یہ جوہر عقل ایک ایسی ہدایت ہے جس کی بنیاد پر انسان کلیات کا ادراک کرتا ہے اور معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات تک پہنچتا ہے تہذیب، تمدن کا ارتقاء اور علم و دانش کی روز افزوں ترقیاں اسی جوہر عقل کا کرشمہ ہیں اب یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اگر اعضاء و حواس کی کمزوریوں کو عقل نے دُور کیا ہے، تو عقل کی کمزوریوں کو کس چیز کے ذریعہ دُور کیا جائے؟ اس کی کمزوریوں سے اس لیے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی مسئلے میں صاحبانِ عقل یک رائے نہیں ہیں۔ نظریات کے اس اختلاف کی صُورت میں ہر ایک نظریہ کو صحیح قرار دینا بداہت سے انکار ہوگا۔ اس لیے کہ آپس میں متصادم ہونے والے نظریات سب کے سب درست نہیں ہو سکتے ان میں حق ایک ہی ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ ا سے اپنے اعضاء کے استعمال کے لیے قواعد و ضوابط طے کرنے ہوں گے اور ہر نیک کو بد سے، ہر حلال کو حرام سے اور ہر طیب کو خبیث سے تمیز دینا ہوگا اور یہ عمل

مکمل طور سے اس کے دائرہ استطاعت سے باہر ہے اس لیے کہ بہت سی باتیں اس کی عقل کے لیے بدیہی اور آشکار ہیں اور بہت سی باتیں اس کے لیے مبہم اور مجمل ہیں۔ لہٰذا اللہ نے عقل کی تربیت اور تہذیب کے لیے ایک مخصوص ہدایت کا بندوبست فرمایا جس کا نام ہدایت نبوی ہے۔

ہدایت نبوی

اسی ہدایت کے تحت اللہ تاریخ انسانی کے دوش بدوش انبیاء و مرسلین کو مبعوث فرماتا رہا، جو انسانوں کو بشارت و نذارت[1] کے ساتھ ساتھ عبادت الٰہی کی ترغیب اور اطاعت طاغوت سے اجتناب کا حکم دیتے رہے[2] اللہ کی شریعتوں سے روشناس کراتے رہے[3] اور نسل انسانی کو سعادت کی راہوں سے آشنا کرتے رہے۔ مجموعی طور پر یہی سارے فرائض ہدایت نبوی کہلاتے ہیں۔ جب اللہ کا پیغام مکمل ہو گیا اور اب مزید کسی نئے پیغام کو بھیجنے کی ضرورت نہ رہی تو اس نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان سارے عہدوں کو ختم فرما دیا اور قیامت تک کی ہدایت کے لیے ان کی جانشینی کے ادارہ کو قائم فرمایا — وہ ادارہ اصطلاح میں امامت کہلاتا ہے، جس پر آئندہ کسی مناسب موقع پر گفتگو کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

توفیقی ہدایت

ہدایت کی ان اقسام کے بعد اب ہم پھر اس سوال کی طرف واپس جاتے ہیں کہ ایک انسان جو نماز میں دُعا مانگ رہا ہے کہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما، وہ اگر سیدھے راستے پر نہ ہوتا تو نماز ہی کیوں پڑھتا؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ انسان اپنی روزانہ کی زندگی میں ابلیس، ذریت ابلیس، شیطان اور نفس امارہ وغیرہ کے سبب کبھی شکوک و شبہات کے ذریعہ اور کبھی غلط اعمال و افعال کے ذریعہ سیدھے راستے سے بھٹکتا رہتا ہے اور پھر اس راستے پر واپس آتا رہتا ہے، اگر خداوند عالم کی توفیق شامل حال نہ ہو تو شاید ہمیشہ ہی کے لیے بھٹک جانے اور واپس آنا ممکن نہ رہے۔ اس لیے یہ دُعا سکھلائی گئی کہ گمراہیوں کے سبب جو

---

[1] سورۂ بقرہ، ۲۱۳۔
[2] سورۂ نحل، ۳۶۔
[3] سورۂ شوریٰ، ۱۳۔

سلسلہ ہدایت ٹوٹتا رہتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم ہدایت پر ثابت قدم رہیں۔ اب یہاں یہ ضمنی سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر یہی مفہوم ہے تو پھر ہم نے یہ ترجمہ کیوں نہ کیا کہ ہمیں سیدھے راستے پر قائم رکھ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت پر ثابت قدم رکھنا بھی ہدایت ہی ہے، کچھ اور نہیں ہے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

"اَدِمْ لَنَا تَوْفِیْقَکَ الَّذِیْ بِہٖ اَطَعْنَاکَ فِیْمَا مَضٰی مِنْ اَیَّامِنَا حَتّٰی نُطِیْعَکَ کَذٰلِکَ فِیْ مُسْتَقْبَلِ اَعْمَارِنَا"[1]

اپنی اس توفیق کو ہمارے لیے باقی رکھ جس کے ذریعے ہم نے ماضی میں تیری اطاعت کی تاکہ ہم اپنے مستقبل میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں اراءۃ الطریق یعنی راستہ دکھلا دینا اور ایصال الی المطلوب یعنی مطلوب و مقصود تک پہنچا دینا اس تقسیم کی روشنی میں اس آیۂ مبارکہ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ پروردگار تو نے راستہ تو دکھلا دیا جس کے سبب ہم اس قابل ہوئے کہ تیری بارگاہ میں کھڑے ہو کر یہ دعا مانگ سکیں تو اب ہمیں مطلوب و مقصود تک پہنچا بھی دے۔

اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ"[2]

"اور جو لوگ ہدایت پر ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے اور انھیں تقویٰ عطا کرتا ہے۔

اس آیت کی روشنی میں یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ پروردگار ہم ہدایت پر تو قائم ہیں، لیکن اب تیری بارگاہ میں یہ دعا کرتے ہیں کہ ہدایت میں اضافہ فرما تاکہ معرفت کے ابواب ہم پر کھلتے جائیں اور ہم تیری راہوں میں زینہ بہ زینہ بلند ہوتے رہیں۔

صیغۂ جمع

اس آیۂ مبارکہ میں بھی صیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے یعنی میری ہدایت نہیں بلکہ ہماری

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۲۔ [2] سورۂ محمد ۱۷

ہدایت فرما۔ یہ اس آیت کی آفاقیت ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے اجتماعی شعور کو اجاگر کیا گیا ہے کہ اگر تنہا ایک کی ہدایت ہو تو گمراہیوں کے تیرہ و تاریک جنگل میں یہ ہدایت کا اکلوتا دیا کتنے دنوں تک اور کتنے فاصلوں تک روشنی پہنچا سکے گا؟ لہٰذا صیغۂ جمع استعمال کیا گیا تاکہ یہ دُعا پُورے معاشرے پر محیط ہو جائے۔

سُنّتِ ہدایت

اِھْدِنَا کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگار تو ہماری ہدایت فرما۔ جب تک یہ آیت ہر انسان دہراتا رہے گا۔ اس بات کا اعلان کرتا رہے گا کہ ہادی اللہ کی طرف سے آتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔

درجاتِ ہدایت

شکل وصُورت کی طرح ہر انسان کی سطحِ فکر بھی دوسرے انسان کی سطحِ فکر سے مختلف ہوتی ہے اس لیے فکر انسانی کے جتنے بھی درجات معیّن کیے جا سکتے ہیں اتنے ہی درجات ہدایت کے بھی ہوں گے، گویا درجاتِ ہدایت لامحدُود ہیں خود پیغمبر اکرم بھی نماز میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تلاوت فرماتے تھے۔ اب یہ مسئلہ انسانی عقل و فہم کے دائرہ سے باہر ہے کہ وہ کس ہدایت کی تمنا فرماتے تھے لیکن اتنا طے ہے کہ اگر ہدایت کے درجات لامحدُود نہ ہوتے، تو عالمین کا سب سے بڑا ہادی اپنی نماز میں یہ دُعا نہ مانگتا۔ اگر یہ بات درست ہے، تو اس دُعائے ہدایت صراطِ مستقیم کا مفہوم ہر انسان کے لیے اس کی اپنی سطحِ فکر کے مطابق ہوگا۔

صراطِ مستقیم

کسی مقام سے منزل تک کی سیدھی راہ اور مختصر ترین مسافت، جس میں نہ کجی پائی جائے اور نہ بلندی و پستی کی ناہمواری ہو، صراطِ مستقیم کہلاتی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس اصطلاح کے مفہوم کی تعیین میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں جو کم و بیش مندرجہ ذیل فہرست میں منحصر ہیں، دین اسلام، قرآن، جنّت کا راستہ، حق کا راستہ، صراطِ محمدؐ و آلِ محمدؐ، آلِ محمد علیہم السلام، بظاہر یہ الگ الگ الفاظ ہیں۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مصادیق ہیں۔ قرآن مجید

نے بہت سے مقامات پر اس اصطلاح کی توضیحات بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

" وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ " [۱]

" اور جو شخص خدا کو مضبوطی سے تھام لے وہ صراطِ مستقیم پر آ گیا۔"

خدا کو تھامنے سے مراد اس کی عبادت و اطاعت ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

" وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ " [۲]

" اور میری عبادت کرو یہی صراطِ مستقیم ہے۔"

واضح سی بات ہے کہ تنہا اللہ کی عبادت و اطاعت ہی صراطِ مستقیم ہے اور اس صراطِ مستقیم سے واقعاً کوئی راستہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے وہ اوامر و نواہی مراد ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان سعادت کی راہوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسی روایات بھی نظر آتی ہیں جو اس اصطلاح کی تشریح میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ وَنُصِبَ الصِّرَاطُ عَلٰى جَهَنَّمَ لَمْ يَجُزْ عَلَيْهِ اِلَّا مَنْ مَعَهٗ جَوَازٌ فِيْهِ وِلَايَةُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ [۳] الخ

انس بن مالک نے رسولؐ اللہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا، کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور صراط کو جہنم کے اوپر نصب کیا جائے گا تو اس پر سے فقط وہی گزر سکے گا، جس کے پاس اجازت نامہ ہو اور اس میں علیؑ ابن ابی طالب کی ولایت کا اقرار ہو۔

(۲) محدث حنبلی نے کہا ہے کہ اس آیت میں صراط سے مراد محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام ہیں۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ [۴]

اور جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں ہے وہ راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ [۵]

---

[۱] سورۂ آلِ عمران، ۱۰۱۔

[۲] سورۂ یٰسٓ، ۶۱۔

[۳] ینابیع المودۃ، سلیمان قندوزی حنفی صفحہ ۱۱۲ چاپ استنبول۔

[۴] سورۂ مومنون، ۷۴۔

[۵] مناقب مرتضوی، محمد صالح کشفی حنفی صفحہ ۳۹ چاپ اول۔

(۳) "عَنْ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ قَالَ الصِّرَاطُ وِلَایَتُنَا أَھْلَ الْبَیْتِ" [۱]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اس آیت میں صراط سے مراد ہم اہل البیت کی ولایت ہے۔

(۴) عَنِ الصَّادِقِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ ھِیَ الطَّرِیْقُ اِلٰی مَعْرِفَۃِ اللّٰہِ وَھُمَا صِرَاطَانِ صِرَاطٌ فِی الدُّنْیَا وَصِرَاطٌ فِی الْاٰخِرَۃِ فَاَمَّا الصِّرَاطُ فِی الدُّنْیَا فَھُوَ الْاِمَامُ الْمُفْتَرَضُ الطَّاعَۃِ مَنْ عَرَفَہٗ فِی الدُّنْیَا وَاقْتَدٰی بِھُدَاہُ مَرَّ عَلَی الصِّرَاطِ الَّذِیْ ھُوَ جِسْرُ جَھَنَّمَ فِی الْاٰخِرَۃِ وَمَنْ لَّمْ یَعْرِفْہُ فِی الدُّنْیَا زَلَّتْ قَدَمُہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ فَتَرَدّٰی فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ [۲]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ صراطِ مستقیم معرفت خدا کا راستہ ہے اور یہ دو صراط ہیں، ایک دُنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دُنیا کی صراط سے مراد امام مفترض الطاعۃ ہے۔ جو شخص بھی دنیا میں اس کی معرفت حاصل کرے گا اور اس کے اقوال واعمال کی پیروی کرے گا وہ آخرت کے اس صراط سے گزر جائے گا۔ جو پُل کی صُورت میں جہنم پر قائم ہے اور جو دُنیا میں اس کی معرفت حاصل نہیں کرے گا۔ آخرت میں اس کا قدم پھسل جائے گا اور وہ جہنم کی آگ میں گر پڑے گا۔

(۵) عَنِ السَّجَّادِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ نَحْنُ اَبْوَابُ اللّٰہِ وَنَحْنُ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ وَنَحْنُ عَیْبَۃُ عِلْمِہٖ وَنَحْنُ تَرَاجِمَۃُ وَحْیِہٖ وَنَحْنُ اَرْکَانُ تَوْحِیْدِہٖ وَنَحْنُ مَوْضِعُ سِرِّہٖ [۳]

"امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ابواب خدا ہیں اور ہم صراطِ مستقیم ہیں اور ہم اس کے علم کا ظرف ہیں اور ہم اس کی وحی کے ترجمان ہیں اور ہم اس کی توحید کے ارکان ہیں۔ اور ہم اس کے راز کا محل ہیں۔"

---

[۱] ینابیع المودۃ صفحہ ۱۲۴۔

[۲] معانی الاخبار بحوالہ المیزان جلد اوّل صفحہ ۲۹ چاپ اوّل۔

[۳] معانی الاخبار بحوالہ المیزان جلد اوّل صفحہ ۲۹ چاپ اوّل۔

(۶) عَنِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔[1]

"امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ صراطِ مستقیم سے مراد امیر المومنین علیہ السلام ہیں"

اسلام کے ذخیرۂ احادیث میں اس مفہوم کی بکثرت روایات پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند اس مقام پر نقل کی گئیں، چونکہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام اللہ کے احکامات اور دین و شریعت کی بشری تجسیم ہیں لہٰذا اگر صراطِ مستقیم سے وہ خود بھی مراد ہوں، ان کی سُنّت و سیرت بھی مراد ہو اور ان کی ولایت و محبت بھی مراد ہو تو اس میں کوئی فطری یا عقلی استبعاد نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے فوراً بعد صراطِ مستقیم کی تشریح خود پروردگارِ عالم نے ان الفاظ میں کی ہے کہ یہ نعمت پانے والوں کا راستہ ہے۔

---

[1] تفسیر عیاشی بحوالۂ مذکورہ۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ○

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے (یہ) ان لوگوں کے غیر ہیں جو (تیرے) غضب کا شکار اور گمراہ ہیں

اس آیۂ مبارکہ کے مندرجہ ذیل ترجموں پر ایک سرسری نگاہ ضروری ہے۔

① ان کے راستے پر (چلا) کہ جن پر تو نے فضل کیا نہ ان کے راستے پر کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا نہ گمراہوں کے راستے پر۔[1]

② ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا) فضل کیا نہ ان کا جن پر (تیرا) غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا۔[2]

③ ان کا راستہ جنھیں تو نے اپنی نعمت سے نوازا ہے نہ ان کا جن پر غضب ہے اور نہ ان کا جو بھٹکے ہوئے ہیں۔[3]

④ راہ کسانی کہ مشمولِ نعمت خود ساختی نہ راہ کسانی کہ برآنہا غضب کردی و نہ رہ گمراہان۔[4]

⑤ راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔[5]

⑥ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا، ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے

---

[1] تفسیر حقانی جلد اوّل صفحہ ۱۴۱

[2] ترجمۂ قرآن حافظ نذیر احمد، سورۂ فاتحہ۔

[3] تفسیر فصل الخطاب سید علی نقی نقوی صفحہ ۲۲۔

[4] تفسیر نمونہ جلد اوّل صفحہ ۱۔

[5] تفسیر ضیاء القرآن صفحہ ۲۰۔

اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے [۱]

یہ چند ترجمے فوری طور پر دسترس میں تھے۔ ان سب ترجموں میں غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کا ترجمہ "نہ ان کا راستہ" کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قواعد نحویہ کے مطابق نہیں ہے اس میں مضاف کو مقدر ماننا ضروری ہے۔ جب کہ یہ تقدیر بغیر کسی سبب معقول کے خود غیر منطقی ہے۔ اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خدا انسانوں کو مغضوب علیہم اور ضالین کا راستہ بھی دکھلا سکتا ہے۔ جبھی بندے یہ دُعا مانگ رہے ہیں کہ وہ راستہ نہ دکھلا بلکہ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ دکھلا۔ قواعد نحویہ کے اعتبار سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ در حقیقت اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی صفت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ انعام یافتہ لوگ نہ غضب الٰہی کا شکار ہیں، نہ گمراہ ہیں۔

انعام یافتہ افراد کا تذکرہ قرآن مجید نے یوں فرمایا ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا" [۲]

"خدا و رسول کی اطاعت کرنے والے اللہ کے انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہوں گے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور ان کی بہترین رفاقت حاصل ہوگی۔"

پروردگار عالم کی نعمتیں لاتعداد اور بے انتہا ہیں، جیسا کہ خود ارشاد فرماتا ہے:

" وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔" [۳]

" اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو احصاء نہیں کر سکتے۔"

ان لاتعداد نعمتوں میں مومن و کافر اور مشرک و منافق میں فرق نہیں ہے وہ نعمت وجود ہو، نعمت حیات ہو، نعمت رزق ہو یا ظاہری و باطنی حواس ہوں ان میں سارے انسان شریک ہیں۔ لہذا سورۂ حمد کی نعمت سے مراد وہ نعمت ہوگی جو اللہ کی مرضی کو حاصل کرنے کا سبب بنے اور تقرب الٰہی کے ذریعے سے انسان کو آخرت کی سعادتوں سے مالا مال کرے اور یہ نعمت فقط ان لوگوں کو حاصل ہے، جن کا تذکرہ سورۂ نساء کی آیت میں فرمایا گیا ہے۔

---

[۱] ترجمان القرآن ابو الکلام آزاد جلد اول صفحہ ۲۵۶۔

[۲] سورۂ نساء ۶۹۔

[۳] سورۂ نحل ۱۸۔

صراطِ مستقیم ایک مجرد اور غیر محسوس شے ہے۔ اسے اس وقت تک نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ پہچانا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ اس غیر محسوس صراطِ مستقیم پر چلنے والے کچھ لوگ نہ نظر آئیں۔ یہی سبب ہے کہ سورۂ حمد جیسی خالص دُعائیہ سورت میں بھی کچھ ایسے افراد کا تذکرہ ضروری قرار دیا گیا جو صراطِ مستقیم کی شناخت کا سبب ہیں۔ ان لوگوں کی تفصیل مذکورہ آیت میں گزر چکی اور اس کے اجمال کو سمجھانے کے لیے صاحب معانی الاخبار نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک قول نقل کیا ہے۔

"قَالَ قَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَزَّ وَجَلَّ فِی الْحَمْدِ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یَعْنِیْ مُحَمَّدٌ وَ ذُرِّیَّتُهٗ" [1]

آپ نے فرمایا کہ سورۂ حمد میں خدا نے جو انعام یافتہ لوگوں کے راستے کا ذکر کیا ہے۔ تو یہ لوگ محمدؐ رسول اللہ اور ان کی ذریت ہیں۔

یہ نعمت یافتہ لوگ غضب الٰہی کا شکار نہیں ہیں اور نہ گمراہ ہیں، تو اب وہ کون لوگ ہیں جو غضب الٰہی کا شکار ہیں اور گمراہ ہیں؟ اس سلسلے میں بعض روایات میں یہ تذکرہ ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے مراد یہودی اور ضَآلِّیْنَ سے مراد عیسائی ہیں [2] اور اس کی تائید آیات سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیات ۶۰ اور ۷۷ سے واضح ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہودی گمراہ نہیں ہیں اور عیسائی غضب الٰہی کا شکار نہیں ہیں بلکہ جو جس کیفیت بدمیں زیادہ مبتلا تھا اس کی اس کیفیت کو امتیاز کے طور پر بیان کیا گیا ہے، ورنہ درحقیقت دونوں ہی غضب الٰہی کا شکار بھی ہیں اور گمراہ بھی۔

ہو سکتا ہے کہ یہ آیت تنزیل کے اعتبار سے انہی دونوں گروہوں کے لیے ہو۔ لیکن آیاتِ قرآنی کی کلّیاتی اہمیت کے پیشِ نظر ان سے ہر وہ گروہ مراد ہوگا جو کسی بھی گمراہی میں مبتلا ہو اور ایسے کام کرے جو غضب الٰہی کو دعوت دینے والے ہوں یہی سبب ہے کہ ان گروہوں سے دشمنانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ اور امام وقت کی شناخت نہ رکھنے والے لوگ بھی مراد لیے گئے ہیں۔ [3]

*

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۲۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۴۔ تفسیر منہج الصادقین جلد اول صفحہ ۷۴۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۴۔ تفسیر علی بن ابراہیم جلد اول صفحہ ۲۵۔

آیات کا باہمی ارتباط

اس سُورے کے گہرے مطالعے سے ہر آیت کا دوسری آیت سے اور ہر لفظ کا دوسرے لفظ سے ایک عجیب و غریب اور معجزانہ ربط نظر آتا ہے اور بُرہان و استدلال کی ایک لطیف ترین رَو چلتی نظر آتی ہے جن کے سوتے منطق یونان و فرنگ سے نہیں پھوٹتے، بلکہ عقل سلیم اور فطرتِ صحیحہ کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں ـــــ ایسا ربط جس کی مثال دُنیا کے کسی الہامی یا غیر الہامی ادب میں نہیں ملتی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کے نام سے کیوں کام کو شروع کریں؟ اس کا جواب لفظ اللہ سے دیا کہ اللہ وہ ہے جو ساری صفات کمال کا جامع ہے اگر اپنے عمل میں کمال چاہتے ہو یا اس کی تکمیل چاہتے ہو تو ہر عمل کے آغاز میں بہ طور تبرک اس کا نام لو۔ اب یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ اس کا نام لینے سے ہمارے کام میں کمال پیدا ہو یا ہمارا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے؟ اس کا جواب،

اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سے دیا کہ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمھارے عمل میں کمال پیدا کرے اور اسے تکمیل سے ہم کنار کرے۔ اور چونکہ یہ بھی اس کی ایک نعمت ہے۔ لہٰذا مقام شکر میں کہو:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

حمد و شکر اللہ کے لیے ہے۔ اس ایک جُملے سے دو سوال پیدا ہُوئے، پہلا تو یہ کہ وہ ہے بھی یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ وہ اللہ اگر ہو بھی تو ہم پر کیوں لازم ہے کہ اس کے حمد و شکر کو بجا لائیں؟ دونوں سوالوں کا جواب:

رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

میں دیا گیا، پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ جو عالمین کی تربیّت ہو رہی ہے تو اس کے حدوث وایجاد کے لیے ایک علت بہر حال ضروری تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بقا کے لیے ایک علت مبقیہ کی بھی ضرورت ہے، اگر نہ ہوتی تو عالمین تباہ ہو جاتے، اور یہ عالمین چونکہ باقی ہیں اس لیے اللہ ہے، دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ چونکہ عالمین میں ہم بھی شامل ہیں اور وہی ہماری بھی تربیت کر رہا ہے اس لیے شکرِ منعم کے فطری فلسفہ کی رُو سے ہم پر حمد و شکر لازم ہیں۔ اسی بات کو اگلی آیت کے لفظ:

الرَّحۡمٰنِ
سے واضح کیا گیا کہ وہ دُنیا میں حاجتوں کا پورا کرنے والا ہے اب پھر سوال پیدا ہوا کہ وہ ہوگا حاجتوں کا پورا کرنے والا۔ لیکن اگر ہم اس کے احسان کو نہ مانیں اور حمد و شکر نہ کریں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟ اس کا جواب اسی آیت کے دوسرے لفظ میں دیا کہ:

الرَّحِيۡمِ
وہ عمل کو دیکھ کر جزاء دینے والا ہے اگر ہم نے بدعملی کی تو وہ جزا کی جگہ سزا دے گا۔ اب پھر سوال پیدا ہوا کہ کیا ثبوت ہے کہ وہ سزا دے گا؟ اس کا جواب:

مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ
سے دیا کہ وہ روزِ جزاء (قیامت) کا مالک ہے اور جو مالک ہوگا جزاء و سزاء کا استحقاق اسی کا ہوگا۔ اب مالک روزِ جزاء و سزاء کو خوش رکھنے کے لیے حمد و شکر لازم ہوئے اور اسی کا نام عبادت ہے۔ اسی لیے اس کے فوراً بعد یہ جملہ رکھا کہ:

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ
ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ طریقہ عبادت کون تبلاتے؟ تو بلا فاصلہ یہ جملہ رکھا گیا کہ

وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ
ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ لہٰذا طریقۂ عبادت بھی تو ہی تبلا دے۔ یہ عبادت چونکہ روزِ قیامت تک لے جانے والی ہے اس لیے پُورے راستے کی ہدایت ضروری ہے۔ لہٰذا کہا گیا۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ
ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت کر۔ اور یہ ہدایت انسانوں کے بغیر مل نہیں سکتی اور انسان مختلف قسموں کے ہیں تو اب کن لوگوں سے ہدایت لی جائے۔ لہٰذا کہا گیا۔

صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ
ان کا راستہ جن پر تو نے اپنی نعمت نازل کی، ہدایت کے آنے کے بعد ہمیشہ دو گروہ ہوں گے ایک ماننے والوں کا گروہ دوسرا تکذیب کرنے والوں کا گروہ اور ہمیں اس دوسرے گروہ کے ساتھ نہیں چلنا ہے۔ لٰہذا کہا گیا۔

غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ
نہ وہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہ ہونے والے، جو ہدایت کو پا کے نہ مانیں وہ مغضوب علیہم ہیں اور جو ہدایت پانے کی کوشش نہ کریں وہ ضالین ہیں۔

سُورہ کی تقسیم

اس سُورۂ مبارکہ میں سات آیات ہیں جن کی تقسیم بہت عجیب وغریب ہے۔ پہلی چار آیتوں میں پروردگار عالم کے اوصاف کا بیان ہے۔ یعنی فقط اور فقط اس کے محامد کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ② الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ③ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ④ اور آخری تین آیتوں میں فقط بندے کا تذکرہ ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ⑤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦

ان آیات میں درمیانی آیت "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہے۔ یعنی بندہ کو خدا سے جو چیز مربوط و متصل رکھتی ہے وہ قیامت ہے۔ اگر قیامت آنے والی نہ ہوتی تو بندہ اللہ سے بے نیاز ہو جاتا۔

اسماء کی ہمہ گیری

سورۂ فاتحہ آغاز قرآن ہے اور اس آغاز میں اللہ نے اپنے پانچ اسمائے گرامی ذکر فرمائے ہیں. جو اللہ، رب، رحمٰن، رحیم اور مالک ہیں جب کہ موجودہ ترتیب کے آخری سُورہ میں تین اسمائے گرامی کا تذکرہ ہے جو رب، ملک اور الٰہ ہیں۔ سُورۂ ناس کی اس ترتیب میں یہ لطافت پوشیدہ ہے کہ تربیت کی ضرورت آغاز عمر میں ہوتی ہے، جوانی میں انسان ملازمت اور کسب معاش کی فکر میں رہتا ہے اور بڑھاپے میں عبادت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ وہ انسان کے بچپن میں رب ہے جوانی میں ملک ہے اور بڑھاپے میں الٰہ ہے۔ اس طرح سورۂ حمد میں جو اسماء استعمال ہوئے ان کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ وہ اللہ ہے۔ اس نے انسانوں کو خلق کیا ہے، وہ رب ہے اسی نے پرورش کے وسائل مہیا فرمائے ہیں۔ وہ رحمٰن ہے نافرمانیوں کے باوجود اس دُنیا میں نعمتوں سے سرفراز فرماتا رہے گا، وہ رحیم ہے اگر انسان توبہ کرے تو وہ بخش دے گا۔ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ جب انسان آخرت میں آئے گا تو جزا و سزا بھی اسی کی بارگاہ سے ملے گی۔ اس طرح سُورہ فاتحہ کے یہ پانچ الفاظ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہیں۔

❋

سُورہ کامعاشرتی پہلو

(۱) جب انسان کسی شے کی خوبی بیان کرے یا تعریف کرے تو اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ حمد وثنا فقط اللہ کے لیے ہے کسی شے میں کوئی ذاتی خوبی نہیں ہے، بلکہ ساری خوبیاں اللہ کی ودیعت کی ہوئی ہیں۔

(۲) خدا کسی خاص قوم یا ملک کا پروردگار نہیں ہے بلکہ وہ رب العلمین ہے۔ اس لیے بندے کو بھی کسی قوم یا علاقے کا طرفدار نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ پوری زمین سے محبت کرنی چاہیئے کہ اللہ کی زمین ہے اور ہر بندے سے محبت کرنی چاہیئے کہ اللہ کا بندہ ہے۔

(۳) پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ۔ اخلاق خداوندی سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ رحمانیت اللہ کا ایک خلق حسن ہے۔ لہذا اس صفت کو مدنظر رکھ کر اس کے سارے بندوں سے رحمت کا سلوک کرنا چاہیئے اور فرقہ وارانہ تعصب کو راہ نہیں دینا چاہیئے۔

(۴) اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں فقط اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ تنہا اللہ مستحق عبادت ہے۔ بلکہ اس میں خود انسان کی اپنی عزت وکرامت کا بھی اعلان ہے کہ نہ وہ کسی اور کے آگے جھکتا ہے نہ کسی اور کا غلام ہے اگر یہ بات انسان کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جائے تو پھر وہ کسی کی بھی غلامی نہیں کرے گا۔ نہ سرمایہ ودولت کی، نہ اقتدار وحکومت کی، نہ حُسن وجمال کی اور نہ اپنی خواہش نفس کی غلامی۔

سُورہ کا دُعائیہ اسلُوب

یہ سُورہ کائنات کی اہم ترین دُعا پر مشتمل ہے اسلیئے کہ اس میں ہدایت کی دُعا ہے۔ اس رُخ سے اگر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سُورہ کا بنیادی موضوع یہی ہے اور اس سے قبل ساری آیات اس دُعا کے لیئے تمہید کا کام دے رہی ہیں۔ انسانی دُعا سے اس سُورہ کا رابطہ کیا ہے؟ وہ اس جلیل القدر روایت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

"عَنِ الصَّادِقِؑ عَنْ آبَائِهٖ عَنْ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَؑ قَالَ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ قَسَمْتُ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ

بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ فَنِصْفُهَا لِیْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِیْ وَ لِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ۔"

امام صادقؑ نے اپنے آباء کرام کے ذریعہ امیرالمومنین سے اور انھوں نے رسول اللہؐ سے روایت کی ہے کہ خدا نے فرمایا کہ میں نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کردیا ہے۔ اس میں آدھا میرے لیے اور آدھا میرے بندے کے لیے ہے اور جو مانگے گا اسے دُوں گا۔

وَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ[1]

جب بندہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے۔

"قَالَ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ بَدَأَ عَبْدِیْ بِاسْمِیْ وَحَقٌّ عَلَیَّ اَنْ اُتَمِّمَ لَهٗ اُمُوْرَهٗ وَاُبَارِكَ لَهٗ فِیْ اَحْوَالِهٖ۔"

تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میرے نام سے شروع کیا مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کے کاموں کو اتمام تک پہنچاؤں اور اس کے حالات کو مبارک بنادوں۔

"وَاِذَا قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔"

"اور جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے۔"

"قَالَ جَلَّ جَلَالُهٗ حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ وَعَلِمَ اَنَّ النِّعَمَ الَّتِیْ لَهٗ مِنْ عِنْدِیْ وَاَنَّ الْبَلَایَا الَّتِیْ اِنْدَفَعَتْ عَنْهُ فَبِتَطَوُّلِیْ اَشْهَدُكُمْ فَاِنِّیْ اُضِیْفُ لَهٗ اِلٰی نِعَمِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اَدْفَعُ عَنْهُ بَلَایَا الْاٰخِرَةِ كَمَا دَفَعْتُ عَنْهُ بَلَایَا الدُّنْیَا۔"

تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی وہ جانتا ہے کہ اس کی نعمتیں میری طرف سے ہیں اور بلاؤں کو میں نے اپنی قدرت سے دفع کیا ہے۔ میں تم کو[2] گواہ کرتا ہوں کہ اس کی دُنیا و آخرت کی نعمتوں میں اضافہ کردوں گا اور اس سے آخرت کی بلاؤں کو دُور کردوں گا، جیسا کہ میں نے اس سے دُنیا کی بلاؤں کو دُور کیا ہے۔

"وَاِذَا قَالَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔"

"اور جب بندہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے۔"

---

[1] یہ جملہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ بسملہ جزء سورہ ہے۔

[2] یہ خطاب فرشتوں سے ہے۔

"قَالَ اللہُ جَلَّ جَلَالُہٗ شَھِدَ لِیْ بِاَنِّی الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ . اَشْھِدُکُمْ لَاُوَفِّرَنَّ مِنْ نِعْمَتِہٖ حَظَّہٗ وَلَاُجْزِلَنَّ مِنْ عَطَائِیْ نَصِیْبَہٗ"

تو خدا فرماتا ہے کہ اس نے میرے رحمٰن و رحیم ہونے کی گواہی دی ہے تمہیں گواہ کرتا ہوں میں اسے فراواں نعمت دوں گا اور اپنی عطا سے ایک بھرپور حصّہ دوں گا۔

"فَاِذَا قَالَ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"

اور جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے:

"قَالَ اللہُ تَعَالٰی اُشْھِدُکُمْ کَمَا اعْتَرَفَ بِاَنِّیْ اَنَا الْمَلِکُ یَوْمِ الدِّیْنِ لَاُسَھِّلَنَّ یَوْمَ الْحِسَابِ حِسَابَہٗ لَاَتَقَبَّلَنَّ حَسَنَاتِہٖ وَلَاَتَجَاوَزَنَّ عَنْ سَیِّئَاتِہٖ"

"تو خدا فرماتا ہے کہ میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ جس طرح اس نے میری مالکیت کا اعتراف کیا ہے۔ میں روز حشر اس کے حساب کو سہل کردوں گا۔ اس کے حسنات کو قبول کروں گا اور اس کی برائیوں کو نظر انداز کروں گا"

"فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اِيَّاكَ نَعْبُدُ"

"اور جب بندہ ایاک نعبد کہتا ہے:

"قَالَ اللہُ عَزَّ وَجَلَّ صَدَقَ عَبْدِیْ اِیَّایَ یَعْبُدُ اُشْھِدُکُمْ لَاُثِیْبَنَّہٗ عَلٰی عِبَادَتِہٖ ثَوَابًا یَغْبِطُہٗ کُلُّ مَنْ خَالَفَہٗ فِیْ عِبَادَتِہٖ لِیْ"

"تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا وہ فقط میری ہی عبادت کرتا ہے میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ اس کی عبادت پر اتنا ثواب عطا کروں گا کہ ہر کوئی اس پر رشک کرے گا"

"وَاِذَا قَالَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"

"اور جب بندہ ایاک نستعین کہتا ہے:

قَالَ اللہُ تَعَالٰی بِیْ اسْتَعَانَ وَاِلَیَّ الْتَجَاَ اُشْھِدُکُمْ لَاُعِیْنَنَّہٗ عَلٰی اَمْرِہٖ وَلَاُغِیْثَنَّہٗ فِیْ شَدَائِدِہٖ وَلَآخُذَنَّ بِیَدِہٖ یَوْمَ نَوَائِبِہٖ"

تو خدا فرماتا ہے کہ اس نے مجھ سے مدد مانگی اور میری پناہ میں آیا۔ میں تمہیں گواہ

کرتا ہوں کہ اس کے کام میں مدد اور اس کی مصیبتوں میں فریاد رسی کروں گا اور اس کے سختی کے ایام میں دستگیری کروں گا۔

فَاِذَا قَالَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اِلٰى آخِرِ السُّوْرَةِ۔

اور جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم سے آخر تک پڑھتا ہے:

"قَالَ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ فَقَدِ اسْتَجَبْتُ لِعَبْدِيْ وَاَعْطَيْتُهُ مَا اَمَلَ وَاٰمَنْتُهُ بِمَا مِنْهُ وَجِلَ" [1]

"تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے کی یہ دُعا قبول ہے اور جو مانگے وہ دُوں گا میں نے اس کی دُعا مستجاب کی، جو چاہے گا دُوں گا اور خوف کی جگہ امن عطا کروں گا۔"

اس روایت میں "و لعبدی ماسأل" کا جُملہ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے ایک آغاز روایت میں اور ایک اختتام پر، اور اس جُملہ کا مطلب یہ ہے کہ میرا بندہ جو مانگے گا، وہ دُوں گا۔ اسی ایک جُملے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قبولیت دُعا میں اس سورے کا کردار کیا ہے۔ یعنی جو بھی دُعا سُورۂ حمد کو وسیلہ بنا کر کی جائے گی وہ یقیناً قبول ہوگی۔ یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن دقتِ نگاہ قبولیت دُعا کے ایک نئے افق سے روشناس کراتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سُورے کے اسلوب میں بارگاہِ الٰہی میں دُعا کے مستجاب کروانے کا طریقہ ودلیعت کر دیا گیا ہے۔

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی دُعا سے قبل جو آیات ہیں ان کی تقسیم یوں ہے کہ:

(۱) پہلی آیت بسملہ ہے۔
(۲) دوسری آیت میں حمدِ خدا کا جامع اعتراف ہے۔
(۳) دوسری، تیسری اور چوتھی آیات میں پروردگار کی چار صفات (ربّ العالمین، الرحمٰن، الرحیم، مالکِ یوم الدین) کے ذریعہ حمد و ثنا کی گئی۔
(۴) پانچویں آیت کے دو جُز ہیں، پہلے جُز میں اپنے سجدوں کا مرکز اللہ کو قرار دیا گیا ہے کہ فقط وہی لائقِ عبادت ہے اور دوسرے جُز میں اپنی احتیاج و استعانت کا اعلان ہے کہ حاجت روائی (بالاصالت) فقط اسی کی شان ہے اور پھر اس کے بعد دُعا ہے۔

---

[1] تفسیر سورۂ حمد، محمد حسین اصفہانی صفحہ ۱۶۹ مطبوعہ ۱۳۱۷

اس ترتیب نے یہ سبق دیا کہ اگر خدا سے دُعا قبول کروانی ہو تو دُعا سے پہلے بسملہ کہو، پھر یہ اعتراف کرو کہ ساری حمد اس کی ملکیت ہے، پھر اس کے اسماءِ حسنیٰ سے اُسے یاد کرو، پھر اپنی بندگی کا اظہار کر کے اُس سے وفاداری کا اعلان کرو، پھر اپنی عاجزی و فروتنی اور اپنے فقر و احتیاج کو بیان کرو اور پھر اس کی بارگاہ میں دُعا مانگو تو ضمانت ہے کہ قبول ہو جائے گی۔

دُعا کی اہمیّت

عرفِ عام میں لفظ دُعا کو دو معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلا معنی اللہ سے راز و نیاز کی بات کرنا جسے دوسرے لفظوں میں مناجات بھی کہا جاتا ہے، دوسرا معنی اللہ کے سامنے اپنی کوئی حاجت پیش کرنا اور اس کے برآنے کی تمنّا کرنا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب کوئی شخص کسی پریشانی میں مُبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی پریشانی ختم ہو جائے تو وہ اپنے کسی بااختیار جاننے والے کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ اب وہ شخص کتنا خوش قسمت ہوگا جو اپنی پریشانی بھی اللہ کے سامنے بیان کرے، اپنے دل کا بوجھ بھی اس کے سامنے ہلکا کرے اور مداوا بھی اسی سے چاہے۔

دُعا اللہ سے بلاواسطہ تعلقات پیدا کرنے کا نام ہے، چھوٹے چھوٹے دنیاوی حکمرانوں سے اس لیے تعلقات بڑھائے جاتے ہیں کہ وہ آڑے وقتوں میں کام آئیں تو اب وہ شخص بہت ہی بدقسمت ہوگا، جو مالکِ حقیقی سے تعلقات کو بڑھانا پسند نہ کرے۔ جب کہ دنیاوی حکمرانوں سے تعلقات اس بات کی ضمانت نہیں ہیں کہ وہ حاجتوں کو پورا بھی کریں گے، اس کے برعکس اللہ وعدہ کرتا ہے کہ تم مانگو میں پورا کروں گا۔

(۱) "قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ"۔[1]
اور تمہارے رب نے تم سے کہا کہ تم مجھ سے دُعا مانگو میں تمہاری دُعا کو قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

(۲) وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ

---

[1] سورۂ مؤمن ۶۰۔

یَرْشُدُوْنَ ؎۱

اور جب تم سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو تبلا دو کہ میں نزدیک ہوں

میں دُعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے دُعا مانگتا ہے

پس انھیں چاہیئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پا جائیں۔

(۳) "أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ ؎۲

"وہ کون ہے کہ جب مضطر شخص اسے پکارے تو وہ دُعا کو قبول کرتا ہے، اور مصیبت کو دُور کرتا ہے۔"

ان آیات کی تلخیص یہ ہے کہ دُعا اظہار بندگی اور پوری کائنات کو ٹھکرا کر اس کی بارگاہ میں جانے کا نام ہے۔ وہ غنی مطلق ہونے کے باوجود انسانوں کی پکار سُنتا ہے اور انسانوں سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ میری پکار پر لبیک کہیں گے تو ہدایت پا جائیں گے۔ یعنی اس عمل کا فائدہ اللہ کو نہیں بلکہ انسانوں کو پہنچے گا۔

(۴) "ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ؎۳

"اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دُعا کرو وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

شرائط اجابت

ان آیات میں اجابتِ دُعا کے جو شرائط تبلائے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی شرط

دُعا فقط زبان سے نہ مانگی جائے بلکہ دل سے مانگی جائے اس لیے کہ تضرع کی کیفیت اسی وقت پیدا ہوگی، جب دل آمادہ ہو۔

؎۱ سورۂ بقرہ، ۱۸۶۔

؎۲ سورۂ نمل، ۶۲۔

؎۳ سورۂ اعراف، ۵۵۔

دوسری شرط خفیہ

چپکے سے دُعا مانگی جائے تاکہ اس میں ریا کاری کا شائبہ نہ آئے۔

تیسری شرط

رسماً دُعا نہ مانگے بلکہ واقعتاً دُعا مانگے۔

چوتھی شرط

دُعا اضطرار کی کیفیت میں ہو۔

پانچویں شرط

عبادت سمجھ کے دُعا مانگی جائے۔

چھٹی شرط

دُعا اپنی حیثیت کے مطابق ہو۔

ساتویں شرط

اللہ کے جاری کیے ہوئے قوانینِ فطرت و طبیعت کے خلاف دُعا نہ مانگے۔

تقابلی مطالعہ

مُسلمانوں کی نماز کا اہم ترین جزء سُورہ حمد کی قرارت ہے۔ جب کہ عیسائیوں کی نماز میں انجیل متی کے یہ فقرات پڑھے جاتے ہیں۔

" اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے"۔ (۹)

" تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ زمین پر بھی ہو"۔ (۱۰)

ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ (۱۱)

"اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر۔" (۱۲)
اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں آمین)۔" (۱۳)

الف: انجیل کے یہ فقرے سورۂ حمد کے مقابل حمد و ثنائے الٰہی کی اس جامعیت سے خالی ہیں جو سورۂ حمد کی آیتوں میں پائی جاتی ہے۔

ب: سورۂ حمد میں اللہ کو رب العالمین کہا گیا ہے۔ جب کہ انجیل کے فقروں میں اسے "ہمارے باپ" کے جملے سے یاد کیا گیا ہے۔ باپ انسان کے لیے سبب وجود ہے، لیکن اس کی بقا کا سبب نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے باپ ابتدا ہی میں مرجاتے ہیں اور دوسرے ذرائع سے ان کی پرورش ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں باپ کا رشتہ بیٹے سے خلقت کی حد تک ہے، جب کہ ربوبیت کے معنی ہیں، احتیاجات کو پورا کرنا یعنی رب العالمین بندہ کے ساتھ ایک فعلی رشتہ ہے، کہ اللہ اس کی احتیاجات کو پورا کر رہا ہے۔

ج: انجیل کے فقروں میں اللہ کو مخاطب کرکے کہا گیا "تو جو آسمان پر ہے"۔ یہ جملہ اس کے لیے جگہ کی تعیین کرتا ہے اور جو شے معین جگہ میں ہو وہ محدود ہوتی ہے اور جہات میں گھری ہوئی ہوتی ہے اور جو شے جہات میں گھری ہوئی ہو وہ قابل تقسیم ہوتی ہے اور جو قابل تقسیم ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے۔ یعنی عدم سے وجود میں آتی ہے واجب الوجود نہیں ہوتی[1] یہ ایک مختصر سا جملہ پورے تصور الوہیت کے منافی ہے۔ جب کہ سورۂ حمد میں رب العالمین کہا گیا۔ لیکن اس کے لیے جگہ معین نہیں کی گئی۔

د: انجیل کے ان فقروں میں روز کی روٹی کی دعا مانگی گئی ہے۔ یعنی اشرف ترین عبادت میں بھی بندے کی نگاہ اپنی مادی احتیاج پر ہے۔ جب کہ سورۂ حمد میں اشرف ترین دعا مانگی گئی اور وہ ہے صراط مستقیم کی ہدایت۔

ھ: بندوں کے معاف کرنے کو خدا کے معاف کرنے کی دلیل اور سند قرار دیا گیا ہے، جو فقدان معرفت پر دلیل ہے۔

---

[1] ان مباحث کے تفصیلات فلسفہ اور علم کلام کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

سُورۂ بقرہ

تعارف وفضائل

① سورۂ بقرہ مدنی سورہ ہے جو ہجرت کے بعد اور جنگِ بدر سے قبل نازل ہوا۔
② آیۃ وَاتَّقُوا یَوۡمًا الخ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ (مکہ) میں نازل ہوئی
③ امیرالمومنینؑ سے مروی ہے کہ اس سورہ میں دو سو چھیاسی آیات ہیں۔
④ اس سورہ میں چھ ہزار ایک سو اکیس کلمات اور
⑤ دو لاکھ پانچ ہزار پانچ سو حروف ہیں۔

اس سورہ کے فضائل کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل روایات کا مطالعہ کافی ہوگا۔

سُئِلَ النَّبِیُّ اَیُّ سُوَرِ الْقُرْاٰنِ اَفْضَلُ قَالَ الْبَقَرَۃُ قِیْلَ اَیُّ الْبَقَرَۃِ اَفْضَلُ قَالَ آیَۃُ الْکُرْسِیِّ۔[2]

"رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ قرآن کا کون سا سورہ افضل ہے؟ فرمایا سورہ بقرہ، پھر پوچھا گیا کہ بقرہ میں سے کیا افضل ہے؟ فرمایا آیۃ الکرسی۔

"رَوٰی سَھْلُ ابْنُ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ سَنَامًا وَسَنَامُ الْقُرْاٰنِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَنْ قَرَاَھَا فِیْ بَیْتِہٖ نَھَارًا لَمْ یَدْخُلْ بَیْتَہٗ شَیْطَانٌ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ وَمَنْ قَرَاَھَا فِیْ بَیْتِہٖ لَیْلًا لَمْ یَدْخُلْہُ شَیْطَانٌ ثَلَاثَۃَ لَیَالٍ۔[3]

سہل ابن سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ فرمایا کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہے اور قرآن کی بلندی سورہ بقرہ ہے، جو شخص بھی دن کے

---

[1] ۲۸۱ بقرۃ۔
[2] مجمع البیان صفحہ ۱۳۔
[3] مجمع البیان صفحہ ۱۲۔

وقت اپنے گھر میں اس سورے کی تلاوت کرے گا، شیطان تین دن تک اس کے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ اور اگر رات میں تلاوت کرے گا تو تین راتوں تک اس کے گھر میں شیطان داخل نہیں ہوگا۔

عَنْ عَلِیِّ ابْنِ الْحُسَیْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ مَنْ قَرَأَ اَرْبَعَ آیَاتٍ مِنْ اَوَّلِ الْبَقَرَۃِ وَآیَۃَ الْکُرْسِیِّ وَآیَتَیْنِ بَعْدَهَا وَثَلٰثَ آیَاتٍ مِنْ آخِرِهَا لَمْ یَرَ فِیْ نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ شَیْئًا یُکْرِهُهٗ وَلَا یَقْرَبُهُ الشَّیْطَانُ وَلَا یَنْسَی الْقُرْاٰنَ[۱]

امام زین العابدین ؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی ابتدائی چار آیات پھر آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور آخر بقرہ کی تین آیات پڑھے گا تو وہ اپنے جان و مال کے سلسلہ میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں دیکھے گا اور شیطان اس کے قریب نہیں آئے گا اور وہ قرآن کو نہیں بھولے گا۔

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَۃَ الْبَقَرَۃِ وَآلَ عِمْرَانَ جَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ تُظِلَّانِ بِهٖ عَلٰی رَاْسِهٖ مِثْلَ الْغَیَابَتَیْنِ۔[۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھے گا تو جب وہ قیامت کے دن آئے گا تو یہ دونوں سورے اس کے سر پر سایہ کریں گے۔"

پیغمبر اکرمؐ نے جنگ کے لیے لشکر تیار کیا پھر ایک ایک کو اپنے پاس بلایا اور سوال کیا کہ قرآن میں سے کیا جانتے ہو؟ لوگ جواب دیتے گئے، انھیں میں سے ایک جوان سامنے آیا جو سن و سال میں سب سے چھوٹا تھا اس نے جواب میں کہا کہ فلاں فلاں سورے اور سورۂ بقرہ جانتا ہوں آپ نے لشکر والوں سے فرمایا کہ اب جاؤ اور یہ جوان تمہارا امیر ہوگا۔ لوگوں نے کہا کہ یا رسُول اللہ اس کی عمر سب سے کم ہے اور اسے آپ نے بزرگوں پر امیر بنا دیا؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ جوان سورۂ بقرہ کا عالم ہے۔[۳]

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۲۶۔

[۲][۳] تفسیر مجمع البیان صفحہ ۱۲۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امارت کا منصب سن و سال کی بزرگی پر نہیں بلکہ علم کی بزرگی سے مشروط ہے۔ یہ روایت اختلاف الفاظ کے ساتھ ترمذی کے ابواب فضائل القرآن میں بھی پائی جاتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ۝۱

الف، لام، میم

قرآن مجید کے ایک سو چودہ سوروں میں سے انتیس (۲۹) سوروں کی ابتدا میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ کچھ حروف تہجی استعمال ہوئے ہیں جو تلاوت میں الگ الگ پڑھے جاتے ہیں اور اسی لیے حروف مقطعات کہلاتے ہیں۔ ان حروف تہجی کو فواتح سُور بھی کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے ان کی تشریح میں متعدد اقوال بیان کیے ہیں، جن کی تعداد بیس سے متجاوز ہے۔ ہم ان میں سے چند اقوال نقل کرتے ہیں۔

(۱) یہ خدا کا وہ علم ہے، جس پر اس نے کسی کو مطلع نہیں کیا۔
(۲) یہ فقط حروف ہیں جن سے لفظوں کو تشکیل دیا جاتا ہے۔
(۳) یہ قرآن مجید کے اسماء ہیں۔
(۴) یہ سُوروں کے اسماء ہیں۔
(۵) یہ اللہ کے اسماء مبارکہ کے حروف ہیں جیسے الٓمّٓ کا مفہوم اَنَا اللّٰہُ اَعۡلَمُ۔ اور الٓرٰ کا مفہوم اَنَا اللّٰہُ اَرٰی وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔
(۶) یہ اپنی موجودہ صُورت ہی میں اللہ کے اسماء مبارکہ ہیں، جیسا کہ امیرالمومنینؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اللہ کو اس طرح پکارا یا کٓھٰیٰعٓصٓ یا حٰمٓ عٓسٓقٓ
(۷) یہ رسول اللہ کے اسماء گرامی ہیں جیسے طٰہٰ اور یٰسٓ۔

اقوال کی کثرت ہی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہ مقطعات فہم انسانی کی دسترس سے بہت دُور ہیں۔ یہ بات عقلاء کی سیرت میں قابل مذمت ہے کہ کسی سے ایسی بات کہی جائے جو اسے بتلانی مقصود نہ ہو۔ اس لیے کہ اس عمل پر یہ فطری اعتراض قائم ہوگا کہ جب بات بتلانی مقصود ہی نہ تھی تو کہنے کی کیا ضرورت تھی؛ اگر قرآن مجید کے ان فواتح سُور کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان کا علم کسی کو بھی دینا مقصود نہ تھا تو پھر ان کا عمومی نزول بے مصرف قرار

پائے گا اور اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا[1] کے منشا کی خلاف ورزی ہوگا۔

عرب جو قرآن اور رسولِ اسلام دونوں کے دشمن تھے ان کا کوئی اعتراض ان مقطعات کے سلسلے میں نہیں ملتا کہ یہ پہیلیاں کیا ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس طریقۂ گفتگو سے مانوس تھے اور اپنی استعداد کے مطابق ان کا مقصد نزول سمجھ رہے تھے (اگرچہ وہ ان کے مفاہیم سے نابلد تھے) اب ان کی نگاہ میں ان فواتح کا مقصد جو بھی رہا ہو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کے نزول سے اللہ کی کون سی مصلحت متعلق ہوسکتی ہے؟ کفار و مشرکین کا منصوبہ یہ تھا کہ نہ خود قرآن کو سنیں اور نہ کسی دوسرے کو سننے دیں۔ جس کا ذکر خود قرآن مجید نے بھی کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔[2]

اور کافر ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں غل مچاؤ شاید تم (اس تدبیر سے) غالب آجاؤ۔

پیغمبر اکرمؐ جب قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے تو کفار کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ اسے نہ سننے دیں اس کے لیے وہ بلند آواز سے اشعار پڑھنے لگتے تھے، شور مچاتے تھے اور مختلف طریقوں سے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے پروردگار عالم نے سوروں کی ابتداء میں یہ فواتح رکھے کہ انھیں سن کر وہ حیران ہوں اور یہ سوچنے لگیں کہ یہ حروف کیوں استعمال ہو رہے ہیں؟ ان کا مقصد و مفہوم کیا ہے؟ اور ان سے کیا مراد لیا گیا ہے؟ اور اپنے فطری تجسس کے ردِعمل کے طور پر بعد کی آیتیں بھی سنیں تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے گویا ان حروف کا مقصد یہ تھا کہ عربوں میں بات سننے کے لیے آمادگی پیدا ہو جائے، اور یہ بات ان کے لیے کوئی عجوبہ نہ تھی بلکہ وہ خود بھی بعض حروف کو بعض مفاہیم کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ جیساکہ ائمہ لغت عرب کا خیال ہے کہ:

"وَقَدْ سَمَّتِ الْعَرَبُ بِهٰذِهِ الْحُرُوْفِ اَشْیَاءَ فَسَمَّوْا بِلَامٍ وَالِدَ حَارِثَةَ بْنِ لَامٍ الطَّائِیِّ وَكَقَوْلِهِمْ لِلنُّحَاسِ صَادٌ وَلِلنَّقْدِ عَیْنٌ وَلِلسَّحَابِ غَیْنٌ وَلِلشَّمْسِ

---

[1] سورۂ محمد ۲۴: یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

[2] حٰمٓ سجدہ ۲۶۔

وَلِمَا يُبْصَرُ بِهِ وَمَا يَنْبَعُ مِنْهُ الْمَاءُ عَيْنٌ وَلِلْجَبَلِ قَافٌ
وَلِلْحُوتِ نُونٌ۔[1]

عربوں نے بہت سی اشیاء کے نام انھیں حروف پر رکھے تھے وہ حارثہ کے باپ کو لام طائی اور مس کو صاد اور سونے چاندی کو عین اور بادل کو غین اور سورج کو اور اس سے نظر آنے والی شے کو اور چشمہ کو عین اور پہاڑ کو قاف اور مچھلی کو نون کہا کرتے تھے۔

اور وہ شاعری میں بھی حروفِ تہجی کو استعمال کرتے تھے، جس کی مثال میں مفسرین نے یہ شعر نقل کیا ہے۔

قُلْنَا لَهَا قِفِي لَنَا قَالَتْ قَافْ
لَا تَحْسَبِيْ أَنَّا نَسِيْنَا الْإِيْجَافْ۔[2]

ہم نے اس عورت سے کہا کہ کھڑی ہو جا اس نے کہا میں کھڑی ہو گئی ہم نے اس سے کہا کہ یہ نہ سمجھو کہ ہم تندروی بھول گئے ہیں۔

اس شعر میں وقفت (میں کھڑی ہو گئی) کی جگہ فقط قاف استعمال ہوا ہے۔

ان مقطعات کی دوسری مصلحت سطحِ عمومی پر یہ تھی کہ ان کے ذریعہ منکرین کو متوجہ کیا گیا کہ یہ وہی حروف ہیں جنھیں تم اپنی بات چیت، اپنے اشعار اور اپنے خطبوں میں ترکیب دے کر استعمال کرتے ہو اور انھیں حروف سے ترکیب دے کر یہ کتاب نازل کی جا رہی ہے تو اگر یہ کتاب اللہ کا کلام اور اللہ کا معجزہ نہیں ہے تو تم بھی حروفِ تہجی کو ترکیب دے کر ایسی ہی کوئی کتاب بنا لاؤ، گویا یہ بھی قرآن کی تحدی کا ایک طریقہ ہے اور یہ حروفِ تہجی اپنی ذات میں ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب تک یہ برقرار ہیں اس وقت تک قرآن کا چیلنج بھی برقرار ہے۔

اس سلسلے میں امام حسن عسکری علیہ السلام سے ایک روایت بھی نقل کی گئی ہے۔ جو بقدرِ ضرورت درج کی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

كَذَّبَتْ قُرَيْشٌ وَالْيَهُوْدُ بِالْقُرْآنِ وَقَالُوْا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ
تَقَوَّلَهُ فَقَالَ اللّٰهُ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ أَيْ يَا مُحَمَّدُ
هٰذَا الْكِتَابُ الَّذِيْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ هُوَ بِالْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَةِ

---

[1] تفسیر لوامع التنزیل جلد اوّل صفحہ ۷۰
[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل صفحہ ۶۰

اَلَّتِیْ مِنْهَا اَلِفٌ ، لَامٌ ، مِیْمٌ وَهِیَ بِلُغَتِكُمْ وَحُرُوْفِ هِجَائِكُمْ فَأْتُوْا بِمِثْلِهٖ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ وَاسْتَعِیْنُوْا عَلٰی ذٰلِكَ بِسَائِرِ شُهَدَآئِكُمْ[1]۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قریش اور یہود نے جب قرآن کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ کو نازل کیا، جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ یہ کتاب انہی حروف تہجی پر مشتمل ہے، جنہیں ملا کر تم اپنے ما فی الضمیر کو بیان کرتے ہو۔ انہیں حروف تہجی میں سے یہ الف لام میم بھی ہے تو اگر اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ غیر خدا کا کلام ہے تو انہیں حروف سے ملا کر تم بھی ایسا کلام بنا لاؤ اور اپنے سارے گواہوں سے بھی اس سلسلے میں مدد لے لو۔

ابعاد وجہات

ان فواتح سُور کے نزول کی مصلحت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی حقیقت بس اتنی ہی ہے اور کیا ان میں دوسرے ابعاد وجہات نہیں پائے جاتے؟ اس سوال کا جواب امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے بخوبی مل جاتا ہے کہ:

"الٓمٓ رَمْزٌ وَاِشَارَةٌ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ حَبِیْبِهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ لَا یَطَّلِعَ عَلَیْهِ سِوَاهُمَا بِحُرُوْفٍ بَعُدَتْ عَنْ دَرْكِ الْاِعْتِبَارِ وَظَهَرَ السِّرُّ بَیْنَهُمَا لَا غَیْرُ[2]"

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، الٓمٓ ایک سربستہ راز ہے اور اشاراتی پیغام ہے جو فقط خدا اور رسولؐ کے درمیان ہے اور اللہ نے نہیں چاہا کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی اور اس رمز و اشارہ سے آگاہ ہو سکے۔

اس روایت سے یہ بات بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان متشابہات کا مفہوم رسولؐ اور ان کے وارثانِ علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر کوئی شخص ان کے بیان کردہ نصوص اور ان کے معیّن

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۲۷۔

[2] تفسیر منہج البیان صفحہ ۴۸۷۔

کردہ اصول تفسیر سے ہٹ کر ان کی توجیہات تلاش کرتا ہے تو وہ تفسیر بالرائے کا مرتکب ہو رہا ہے۔ معصومینؑ نے ان مقطعات کے معانی بتلائے ہیں۔ جن کی پوری تفصیل تفسیر انوار القرآن (سورہ بقرہ) میں صفحہ ۵۵ سے ۵۸ تک دیکھی جا سکتی ہے۔ جنھیں ہم قدیم مصادر و مآخذ کے حوالے سے ان شاء اللہ ان کے اصل مقامات پر بیان کریں گے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ وہ بیان شدہ معانی ہی ان مقطّعات کی مکمل حقیقت و ماہیت نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ایک جہت کی نشان دہی کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو لبید مخزومی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے حروف مقطعہ کے سلسلے میں ایک روایت نقل کی ہے۔ [۱] جس میں آپ نے ان کے کچھ اسرار بیان فرمائے ہیں۔ چونکہ محدثین نے اسے مشکل ترین اور متشابہ احادیث میں شمار کیا ہے اس لیے اسے یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ لیکن اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقطعات مختلف ابعاد و جہات پر مشتمل ہیں جن میں ایک بُعد یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ مختلف ائمہ کے زمانہ امامت اور ان کے مختلف واقعات کا استخراج بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح یہ روایت بھی مقطعات کی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ ھُوَ حَرْفٌ مِنْ حُرُوْفِ اِسْمِ اللّٰہِ الْاَعْظَمِ الْمُقَطَّعُ فِی الْقُرْاٰنِ الَّذِیْ یُؤَلِّفُہُ النَّبِیُّ وَالْاِمَامُ فَاِذَا دَعَیٰ بِہٖ اُجِیْبَ۔ [۲]

"امام صادقؑ نے فرمایا کہ الٓمٓ اللہ کے اسم اعظم کے حروف میں سے ایک حرف ہے۔ جو قرآن میں جدا جدا بیان ہوئے ہیں۔ نبی اور امام جب انھیں مرکب کر کے دعا مانگتے ہیں تو مستجاب ہوتی ہے۔"

مقطعات کی جہات میں سے اگر کوئی جہت کسی پر آشکارا ہو جائے اور وہ منصوص اصول تفسیر کے منافی نہ ہو تو اسے بھی قرآنی علوم و معارف اور اسرار و رموز کا ایک معجزہ سمجھ کر قبول کر لینے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حبیب اللہ نوبخت اور ڈاکٹر رشاد خلیفہ کی تحریریں قرآن کے طالب علموں کے لیے دلچسپ اور معنی خیز ثابت ہو سکتی ہیں۔

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۰۹۔

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۶

مقطعات کا جائزہ

گذشتہ اوراق میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قرآن مجید کے انتیس (۲۹) سوروں کے آغاز میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کسی مقام پر یک حرفی ہیں۔ جیسے صٓ کہیں دو حرفی ہیں جیسے طٰہٰ، کہیں تین حرفی ہیں، جیسے الٓمٓ، کہیں چار حرفی ہیں جیسے الٓمٓصٓ اور کہیں پانچ حرفی ہیں جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ۔

ان کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

الٓمٓ، الٓمٓ، الٓمٓصٓ، الٓر، الٓر، الٓر، الٓمٓر، الٓر، الٓر، کٓھٰیٰعٓصٓ، طٰہٰ، طٰسٓمٓ، طٰسٓ، طٰسٓمٓ، الٓمٓ، الٓمٓ، الٓمٓ، الٓمٓ، یٰسٓ، صٓ، حٰمٓ، حٰمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، حٰمٓ، حٰمٓ، حٰمٓ، حٰمٓ، قٓ، نٓ۔

اور یہ بالترتیب مندرجہ ذیل سوروں کے آغاز میں ہیں۔

بقرہ، آلِ عمران، اعراف، یُونس، ھُود، یوسف، رعد، ابراھیم، حجر، مریم، طٰہٰ، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، یٰسٓ، صٓ، مومن، حم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، ق، قلم۔

ان مقطعات میں سے اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو ان کی تعداد چودہ ہے، جو یہ ہے:

الٓمٓ، الٓمٓصٓ، الٓر، الٓمٓر، کٓھٰیٰعٓصٓ، طٰہٰ، طٰسٓمٓ، طٰسٓ، یٰسٓ، صٓ، حٰمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، قٓ، نٓ۔

اور اگر ان چودہ مقطعات کے مکرر حروف کو بھی حذف کر دیا جائے تو چودہ ہی حروف بچتے ہیں جو عربی حروف تہجی کے مکمل نصف ہیں اور وہ یہ ہیں۔

ا، ل، م، ص، ر، ک، ھ، ی، ع، ط، س، ح، ق، ن۔

نظام الدین نیشا پوری نے اپنی تفسیر میں تحریر کیا ہے کہ۔

"سَمِعْتُ بَعْضَ الشِّيْعَةِ يَقُوْلُ هٰذِهِ الْفَوَاتِحُ إِذَا حُذِفَ مِنْهُ الْمُكَرَّرَاتُ يَبْقٰى مَا يُمْكِنُ اَنْ يُّرَكَّبَ مِنْهُ عَلِيٌّ صِرَاطُ حَقٍّ نُمْسِكُهُ وَهٰذَا غَرِيْبٌ وَاِنْ تَكَلَّفَ فَلِهٰذَا اَوْرَدْتُّهُ۔"[1]

---

[1] تفسیر لوامع التنزیل جلد اول صفحہ ۶۸۔

میں نے ایک شیعہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر ان فواتح کے مکررات کو حذف کر دیا جائے تو باقی ماندہ حروف سے جو جملہ بنے گا وہ فقط یہ ہے کہ علیؑ حق کا راستہ ہے ہم اس سے تمسک کرتے ہیں اگرچہ اس میں تکلف ہے۔ لیکن چونکہ عجیب بات ہے اس لیے میں نے اسے یہاں نقل کر دیا ہے"۔[2]

اس بات کو فیض کاشانی نے یوں بیان فرمایا ہے۔ کہ

"وَمِنَ الْاَسْرَارِ الْغَرِیْبَۃِ فِیْ ھٰذِہِ الْمُقَطَّعَاتِ اَنَّھَا تَصِیْرُ بَعْدَ التَّرْکِیْبِ وَحَذْفِ الْمُکَرَّرَاتِ عَلِیٌّ صِرَاطُ حَقٍّ نُمْسِکُہٗ وَصِرَاطُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمْسِکُہٗ"[1]

ان مقطعات کے اسرار میں سے ایک عجیب سر یہ ہے کہ مکررات کے حذف کے بعد حروف کو مرکب کرنے سے یہ بنتا ہے کہ علیؑ حق کا راستہ ہے۔ ہم اس سے تمسک کرتے ہیں، اور علیؑ کا راستہ حق ہے، ہم اس سے تمسک کرتے ہیں۔

یہ کوئی منطقی برہان یا عقلی استدلال نہیں ہے، بلکہ ایک لطیف استخراج ہے اور قرآن مجید کے بطون و اسرار کی طرف ایک ذوقی اشارہ ہے، لیکن محمد عبدہ مصریؒ نے اس استخراج کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور اپنی کتاب المصلح والمقلد کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ لوگوں نے اس کے مقابلے پر جملے تراشے ہیں۔ نگاہ کے سامنے نہ ہونے کے سبب ان جملوں پر کسی قسم کا تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ البتہ دوران مطالعہ کسی کتاب میں یہ جملہ نظر سے گزرا تھا "صَحَّ طَرِیْقُکَ مَعَ السُّنَّۃِ" (تمہارا راستہ سنت کے ساتھ صحیح ہے)۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ جملہ بھونڈا ہے اور طریقک کا مخاطب واضح نہیں ہے، اس جملے کا مفہوم ہمارے ذکر کردہ جملے کے منافی نہیں ہے اس لیے کہ صراط علیؑ سنت رسولؐ ہی کا نقش ثانی ہے۔ جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ (بخاری) (اے علی تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں) اور خود علیؑ نے نہج البلاغہ (خطبہ قاصعہ) میں ارشاد کیا ہے۔ کُنْتُ اَتْبَعُہٗ اِتِّبَاعَ الْفَصِیْلِ اِثْرَ اُمِّہٖ (میں اس طریقے سے رسولؐ کا اتباع کرتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔)

❋

---

[1] تفسیر صافی صفحہ ۲۰۰۔

[2] تفسیر المنار جلد اول صفحہ ۱۲۳۔

الٓمّٓ

اس کی تشریح میں امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے۔

"اَمَّا الٓمّٓ فِی اَوَّلِ الْبَقَرَۃِ فَمَعْنَاہُ اَنَا اللّٰہُ الْمَلِکُ"[1]

"سورۂ بقرہ کے آغاز میں جو الٓمّٓ ہے اس کا مطلب ہے کہ میں اللہ بادشاہ ہوں۔"

اگرچہ اس روایت کی سند ضعیف ہے، لیکن اسے اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے ملتی جلتی بعض قابلِ اعتبار روایات دوسرے مقطعات کے سلسلے میں ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں۔ اگر تسامح سے کام لے کر معصوم کی طرف اس قول کی نسبت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ قول الٓمّٓ کی مکمل حقیقت کی طرف اشارہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کی صرف ایک جہت کا بیان قرار پائے گا جیسا کہ ابعاد وجہات کے ذیل میں الٓمّٓ ہی کے متعلق امام صادق علیہ السلام کی درج شدہ روایت اس کے مفہوم کی ایک دوسری جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۲۶

*

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

یہ عظیم کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، ہدایت ہے متقی لوگوں کے لیے

ذٰلِكَ عربی زبان میں اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے لیے اُردو میں "وہ" استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ھذا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے لیے اردو میں "یہ" استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ نے کہیں قرآن کے لیے "ذٰلِكَ" استعمال فرمایا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کہیں "ھٰذَا" استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ [1]" "اور یہ کتاب جس کو ہم نے نازل کیا ہے مبارک ہے"۔

رُوحانی اعتبار سے کچھ لوگ اللہ سے دُور ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: "فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ [2]" "ظالم اللہ سے دُور ہیں"۔

اور کچھ اس سے قریب ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے: "اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ [3]" "سبقت کرنے والے سبقت کرنے والے ہیں اور خدا کے نزدیک مقرب ہیں"۔ اعمال و عبادات میں قربۃً الی اللہ کی نیت بھی اس پر دلیل ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ مادی اعتبار سے کوئی شے اللہ سے قریب ہو اور کوئی دُور ہو اس لیے کہ یہ بات اسلام کے تصورِ الوہیت کے منافی ہے۔

---

[1] سورۂ انعام، ۶/ ۱۵۵

[2] سورۂ مومنون، ۴۱

[3] سورۂ واقعہ، ۱۰/۱۱۔

اس اشارہ بعید کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں ۔

(۱) ذٰلِکَ اشارہ قریب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

(۲) کسی شے کی شان اور علو مرتبت کے اظہار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔

(۳) وہ شے جو پہلے سے ذہن میں ہو اس کی طرف اشارہ کے لیے بھی مستعمل ہے ۔

یہ ساری توجیہات اس جملے میں درست ہیں "ذٰلِکَ" اشارہ قریب کے مفہوم میں بھی ہے ، قرآن مجید کی عظمت کا اظہار بھی کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اہل کتاب کے شہر میں نازل ہونے والی ابتدائی سورت کا پہلا لفظ ہونے کی حیثیت سے اس بات کی طرف متوجہ بھی کر رہا ہے ، کہ وہ کتاب جس کا ذکر یہ لوگ اپنی کتابوں اور اپنے انبیاءؑ کے ذریعہ سن چکے ہیں ـــــــ یہ وہی کتاب ہے ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم میں یہ مذکور ہے کہ :

" میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا " [1]

مدینے کے یہودی جان رہے تھے کہ بھائیوں یعنی بنی اسماعیل سے اٹھنے والا نبی یہی ہے اور یہ جو کچھ بھی اللہ کا نام (بسملہ) لے کر سنا رہا ہے وہ خدا ہی کا کلام ہے ۔ اسی بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ کلام جو تمہارے علم میں پہلے سے ہے وہ یہی کتاب ہے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے ۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی ایک روایت سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے ۔

" ثُمَّ قَالَ اللّٰهُ الٓمّٓ هُوَ الْقُرْاٰنُ الَّذِیْ افْتَتَحَ بِالٓمّٓ هُوَ ذٰلِکَ الْکِتَابُ الَّذِیْ اَخْبَرْتَ بِهٖ مُوْسٰی فَمَنْ بَعْدِهٖ مِنَ الْاَنْبِیَآءِ فَاَخْبَرُوْا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اِنِّیْ سَاُنْزِلُهٗ عَلَیْکَ یَا مُحَمَّدُ کِتَابًا عَزِیْزًا لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ لَا رَیْبَ فِیْهِ لَا شَکَّ فِیْهِ لِظُهُوْرِهٖ عِنْدَهُمْ کَمَا اَخْبَرَهُمْ اَنْبِیَآءُهُمْ

---

[1] استثنا باب ۱۸، فقرات ۱۸/۱۹ ۔

اَنَّ مُحَمَّدًا یُنْزَلُ عَلَیْهِ کِتَابٌ لَا یَمْحُوْهُ الْبَاطِلُ.[1] (اقتباس)

"خداوندِ عالم کا اس سے منشا یہ تھا کہ یہ قرآن ہے جس کی ابتدا میں الف، لام میم سے کر رہا ہوں۔ یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر میں نے موسیٰ اور ان کے بعد کے انبیاء کو دی تھی اور انھوں نے بنی اسرائیل کو بتلایا تھا کہ میں اے محمدؐ! تم پر ایک محترم کتاب نازل کرنے والا ہوں باطل اس کے پیش و پس سے حملہ نہیں کر سکتا اور وہ صاحب حکمت اور لائق حمد خدا کی تنزیل ہے لَا رَیْبَ فِیْهِ یعنی بنی اسرائیل کو اس کے بارے میں شک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کے انبیاء انھیں بتلا چکے تھے کہ محمدؐ پر ایک کتاب نازل ہوگی جسے باطل مٹا نہیں سکے گا۔"

"لَا رَیْبَ فِیْهِ" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کتاب کے کتابِ خدا ہونے میں شک نہیں ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مکی زندگی میں سورۂ بنی اسرائیل میں اور سورۂ ہود میں چیلنج کیا جا چکا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب انسانی ذہن کی تصنیف ہے تو تم بھی پورے قرآن یا دس سوروں کا جواب لکھ کر لاؤ اب مدنی زندگی میں کہا گیا کہ چونکہ کسی طرف سے بھی چیلنج کے باوجود جواب نہیں آیا۔ اس لیے اب یہ بات تسلیم ہو جانی چاہیئے کہ اس کے کتابِ خدا ہونے میں شک نہیں ہے۔

وہ حقائق جو ماوراء مادہ ہیں، ان کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی انسان کسی قسم کی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا، اور اگر ان حقائق کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان حقائق کے ماہیات و اوصاف اور دیگر تفصیلات کے بارے میں کسی قسم کی کوئی ایسی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی جو شک و شبہہ سے بالا ہو۔ جو کچھ بھی کہا جائے گا وہ ظن و تخمین اور گمان و قیاس کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ماوراء مادہ جو حقائق ہیں انھیں نہ حواس سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ عقل سے سمجھا جا سکتا ہے۔ للٰذا ان کے بارے میں شک و شبہہ سے بالا بات وہی کہہ سکتا ہے، جس کا علم ہر شے پر محیط ہو۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور ماوراء حس و ماوراء مادہ حقائق کا بیان اس کے اہم موضوعات میں شامل ہے۔ اس لیے یہ بات تسلیم کی جانی چاہیئے کہ اس نے جو کچھ بھی ان موضوعات کے ذیل میں بیان فرمایا ہے وہ شک و شبہہ سے بالا ہے اور ریب سے خالی ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

یہ کتاب متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے پانچویں آیت میں فرمایا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۲۸۔

"اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ"

"یہ لوگ اپنے رب کی ہدایت پر قائم ہیں۔"

تو جب یہ پہلے ہی سے ہدایت پر قائم ہیں تو پھر قرآن ان کے لیے کس قسم کی ہدایت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر زینہ اپنے سے پچھلے زینے کے مقابل ایک بلندی ہے، لیکن وہی زینہ اگلے زینے کے مقابل پست ہے۔ یہی صورت حال درجاتِ ہدایت میں بھی ہے۔ درجات تقوےٰ میں بھی ہے، اور قرآن ان سارے درجات میں ہدایت ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کتاب اگرچہ پوری انسانیت کے لیے ہدایت ہے (ھدی للناس) لیکن اگر کوئی شخص ہدایت قبول نہ کرنا چاہے تو زبردستی ہدایت نہیں کرتی عملاً انھیں لوگوں کی ہدایت کرتی ہے جو اس کتاب سے ہدایت قبول کرنا چاہتے ہیں اور یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دل میں خوف خدا ہو اسی خوفِ خدا کا نام تقوےٰ ہے۔

تقویٰ اسم مصدر ہے لغت کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہے اپنے آپ کو پوری قوت کے ساتھ ان چیزوں سے بچانا جو نقصان دہ ہیں۔ اسی کو پارسائی اور پرہیزگاری بھی کہتے ہیں۔ اصطلاح قرآن میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو خدا کے غضب کا شکار بناتی ہیں اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کیفیت تقوای میں مثبت اور منفی دونوں پہلو برابر ہیں۔ یعنی حرام کو ترک کرنا جتنا اہم ہے اتنا ہی اہم واجبات کو بجالانا بھی ہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے، اس میں سے (دوسروں پر) خرچ کرتے ہیں۔

اور جو تم پر نازل ہونے والی اور تم سے قبل نازل ہونے والی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

وہ لوگ اپنے ربّ کی ہدایت پر ہیں اور وہ کامیاب لوگ ہیں۔

پچھلی آیت میں ہدایت کو متقی لوگوں کے ساتھ مشروط کیا گیا تھا۔ اب ان تین آیتوں میں صفات کے ذریعہ ان کی شناخت کرائی گئی اور ان کے انجام کو تبلایا گیا ان کی شناخت میں پانچ بنیادی باتیں تبلائی گئیں۔

ایمان بالغیب
اقامۂ صلوٰۃ
انفاق رزق
تنزیل خدا پر ایمان۔
آخرت پر ایقان

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ متقی لوگ کون ہیں؟ اور یہ کہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے کون کون سی صفات کا انسان میں ہونا ضروری ہے؟ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مذکورہ پانچوں صفتیں جس انسان میں پائی جائیں وہ ہدایتِ ربّ پر قائم ہے اور ارائۃ الطریق[1] کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ اب مطلوب تک پہنچنے کے لیے اسے قرآن سے متمسک رہنا ضروری ہو گا۔

ایمان بالغیب

غیب کے معنی پوشیدہ اور پنہاں کے ہیں۔ ہر وہ شے جو ہمارے دائرۂ محسوسات سے باہر ہے وہ غیب ہے۔ بلکہ اگر نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خود محسوسات بھی حواس کی اضافتوں سے غیب ہیں۔ آنکھ کے لیے منظر شہود ہے۔ لیکن خوشبو غیب ہے، ناک کے لیے خوشبو شہود ہے۔ لیکن منظر غیب ہے، زبان کے لیے ذائقہ شہود ہے لیکن منظر اور خوشبو دونوں غیب ہیں وغیرہ۔ اس اعتبار سے شہود کی دُنیا بہت چھوٹی اور مختصر ہے اور غیب کی کائنات وسیع و بیکراں ہے۔

دین کے حوالے سے سارے بنیادی عقائد غیب ہیں۔ وجود باری اور توحید غیب الغیوب ہیں، قیامت غیب ہے، نبی شہود میں ہوتا ہے، آثار نبوت شہود میں ہوتے ہیں، لیکن خود نبوت غیب ہے اسی طرح امامت بھی غیب ہے، کچھ وہ غیب ہیں جو دلیل عقلی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ جیسے

---

[1] اس کی تشریح سورہ حمد میں بیان کی جاچکی ہے۔

وجودِ باری اور کچھ وہ ہیں جن پر دلیل عقلی قائم نہیں ہوتی۔ جیسے لوح و قلم اور عرش و کرسی وغیرہ، ایسے بھی غیب ہیں جو حواس کی حد میں آ سکتے ہیں۔ لیکن ماضی یا مستقبل میں ہونے کے سبب غیب ہیں، جیسے زمانۂ آدم یا زمانۂ محشر وغیرہ۔ یہ سب لفظ غیب کے مصادیق ہیں لہٰذا دین کے تبلائے ہُوئے جتنے بھی غیب ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔

بعض روایات میں اس غیب سے مہدئ آخرالزمان کی غیبت اور ان کے قیام وغیرہ کو مراد لیا گیا ہے [۱] اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک عام لفظ کو کسی دلیل کے بغیر خاص کر دینا درست نہیں ہے۔ یہ اعتراض اس لیے صحیح نہیں ہے کہ ان روایات میں عام کو خاص نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ تبلایا گیا ہے کہ غیب کے مفہوم عام میں جتنی بھی چیزیں شامل ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

اقامۂ صلوٰۃ

یہ ایک ایسی عبادت ہے جو دین کا ستون اور مؤمن کی معراج ہے اور اتنی اہم ہے کہ اگر یہ قبول ہو جائے تو دوسری عبادتیں بھی قبول ہو جاتی ہیں اگر یہ رد ہو جائے تو دیگر عبادات بھی مسترد ہو جاتی ہیں اس کو بجالانے کی اتنی تاکید ہے کہ خود قرآن نے کہا ہے کہ نماز قائم کرو اور مشرک نہ ہو۔ زیرِ نظر آیت میں فقط نماز پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ نماز قائم کرنے کا تذکرہ ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نمازیں اپنے پورے شرائط و آداب کے ساتھ ادا کی جائیں، ان کے حدود کی حفاظت کی جائے اور ان کے اوقات کا خاص خیال رکھا جائے۔ اقامۂ صلوٰۃ کے لفظ میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

انفاقِ رزق

بعض مفسرین کی رائے میں اس سے مراد اہل وعیال کا نفقہ، بعض کے خیال میں زکات واجب اور بعض کے قول کے مطابق صدقۂ مستحب ہے، اس کے علاوہ بھی اقوال پائے جاتے ہیں لیکن درحقیقت اس حکم کے مزاج میں عمومیت پائی جاتی ہے اور ہر وہ شے جو انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ اس اصطلاح کے دائرے میں آتی ہے، خواہ وہ واجب خرچ ہو یا مستحب

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۳۱/۳۲۔

بلکہ یہ انفاق رزق صرف مال کے سلسلے میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ رزق ہر اس شے کو کہتے ہیں جس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ لہٰذا اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اگر انسان اپنے علم کو خدا کی راہ میں خرچ کرے تو یہ عمل بھی انفاق رزق کے دائرہ میں ہوگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

" وَمِمَّا عَلَّمْنَاهُمْ يَبُثُّونَ " [1]

" ہم نے جو علم انھیں دیا ہے اسے نشر کرتے ہیں۔ "

"مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ" کہ کر اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ انسان جو انفاق کر رہا ہے، وہ اس کا کوئی ذاتی احسان نہیں ہے، بلکہ اس میں سے انفاق کر رہا ہے جو بطور رزق اللہ نے اسے عطا کیا ہے۔

تنزیل خدا پر ایمان

اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ تنزیل ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل ہو چکی ہے اور ایک وہ جو پیغمبر اکرمؐ پر ہوئی ہے۔ آپ پر ہونے والی تنزیل بھی دو قسموں پر منقسم ہے۔ ایک وہ ہے جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے اور دوسری وہ ہے جس کا نام سنتِ رسولؐ ہے۔ اس لیے کہ قولِ رسولؐ کے لیے قرآن میں یہ سند موجود ہے۔

" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى " [2]

" وہ اپنی خواہش سے بولتا بھی نہیں، جو بولتا ہے وہ وحی الٰہی ہے۔"

اسی طرح عمل رسولؐ کے لیے ارشاد ہوا:

"اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ " [3]

" مَیں فقط اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولؐ کے قول و عمل دونوں تابع وحی الٰہی ہیں۔ اور تنزیل ہی کی قسم ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ سے قبل کی تنزیل سے مراد وہ صحیفے اور کتابیں ہیں، جو گزشتہ انبیاءؑ پر نازل ہوئی ہیں لیکن

---

[1] مجمع البیان جلد اوّل صفحہ ۱۶۔

[2] سورۂ نجم، ۳-۴۔

[3] سورۂ یونس، ۱۵۔

حتمی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنے انبیاء و مرسلین پر صحیفوں اور کتابوں کا نزول ہوا ہے۔ اس لیے کہ روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ان انبیاء و مرسلین کی کوئی حتمی فہرست ہماری دسترس میں ہے لہٰذا اس سلسلے میں اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ البتہ جن صحیفوں اور کتابوں کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے ان پر تعیین کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں سے کچھ دستیاب ہیں اور کچھ مفقود ہو چکے ہیں۔

دستیاب کتابوں میں اہم ترین توریت و انجیل ہیں۔ اتنی بات یقینی ہے کہ مذکورہ کتب بالترتیب موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئیں۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے کہ ان میں اب کتنا کلام اللہ کا ہے اور کتنا الحاقی ہے۔ اس موضوع پر ہم کسی مناسب موقع پر گفتگو کریں گے۔

یہ اسلام کی وسعتِ قلب ہے کہ وہ صرف اپنے نبیؐ اور اپنی کتاب کو نہیں منواتا۔ بلکہ انھیں بھی منواتا ہے، جو ماضی میں گزر چکے ہیں اور جن سے اب ہمارا براہِ راست کوئی ربط نہیں ہے۔

آخرت پر ایقان

قرآن مجید میں قیامت کو آخرت، یومِ آخر اور دارِ آخرت اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اس دُنیا کے بعد ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب انسان اپنے انجام کو پہنچے گا۔ بعض عُلماء نے آخرت، نامۂ اعمال، ثواب و عقاب اور متعلقاتِ آخرت پر مشتمل آیات کی تعداد سترہ سو (۱۷۰۰) لکھی ہے۔ قرآن مجید نے دنیا و آخرت کا موازنہ فرماتے ہوئے ارشاد کیا ہے کہ:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ؁ [۱]

"اور یہ دنیاوی زندگی کچھ نہیں ہے سوائے کھیل کود کے اور یقیناً دارِ آخرت ہی حقیقی زندگی ہے۔ کاش یہ لوگ اسے جانتے۔"

یہ حقیقی زندگی ہی کی اہمیت تھی جس کے سبب قرآن مجید کا تقریباً ایک تہائی مضمون اس پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید میں اس کائنات کے لیے مختلف مقامات پر اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ شمس و قمر، زمین و آسمان نظام ہائے شمسی و کہکشانی وغیرہ وغیرہ، یہ سب کے سب ایک معین مدت کے لیے خلق کیے گئے ہیں اور اسے اجلِ مسمّٰی[۲] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جب یہ معین مدت پوری ہو جائے گی اور یہ ساری اشیاء حکمِ الٰہی کے مطابق اپنی اپنی غرضِ تخلیق کی تکمیل کر دیں گی تو ان کا موجودہ کردار بھی ختم ہو جائے گا اور ان کے ساتھ ایک ایسی صورتِ حال رونما ہوگی جو انتہائی

---

[۱] سورہ عنکبوت ۶۴ [۲] سورہ رعد ۲۔ سورہ روم ۸۔ سورہ احقاف ۳۔

دہشت ناک بھی ہے اور عقل وفہم کی گرفت سے باہر بھی[3] قرآن مجید کے معجزات میں سے یہ معجزہ بھی قابل ذکر ہے کہ مختلف مذاہب کی مقدس آسمانی کتابیں جو آج مطالعہ کی دست رس میں ہیں، تکویر شمس انفطار آسمان، انتشار کواکب یا بالفاظ دیگر کائنات کی تباہی و بربادی کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ اسے فقط قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس صورتِ حال کے بعد انسان اٹھائے جائیں گے اور ان کے حساب وکتاب کا سلسلہ ہوگا پھر وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائیں گے اور جنت وجہنم ان کی سکونت گاہ ہوں گے[4]

---

[3] سورہ حاقہ۔ سورہ تکویر۔ سورہ انشقاق۔ [4] سورہ شوریٰ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ
ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾
خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ
وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ﴿٧﴾

وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے برابر
ہے کہ تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔
اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کی سماعت پر مہر
کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے
بہت بڑا عذاب ہے۔

"إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا" عام ہے اور اس میں ہر کافر داخل ہوسکتا ہے لیکن جب یہ
کہ دیا گیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو آغازِ جملہ کا عموم خود بخود ختم ہو گیا اور اس سے وہ کافر سمجھ
میں آئے جو حق کی دشمنی میں اتنے آگے بڑھ چکے تھے کہ اب ان کے واپس پلٹنے کا امکان نہ تھا
یہ تاریخی حقیقت بھی اس جملے کے خاص ہونے کی دلیل ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد

کافروں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا ہے اور سورۂ نصر کا نزول بھی اس کے بعد ہی ہے. جس میں یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ لوگ فوج در فوج دین خدا میں داخل ہوں گے۔

یہاں یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ان کفار کے لیے رسولؐ کا انذار اور عدم انذار دونوں برابر ہیں تو وہ انذار رسولؐ کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے اور رسولؐ کی ہدایت ان سے متعلق نہیں ہوگی اور اگر متعلق ہوگی تو ان کفار کے لیے تکلیف مالا یطاق ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسولؐ کا انذار کفار کے دونوں گروہوں کے لیے ہے۔ ان کے لیے بھی جو ایمان لانے والے ہیں اور ان کے لیے بھی جو ایمان نہیں لانے والے ہیں۔ پہلے گروہ کے لیے انذار سبب ایمان ہوگا اور دوسرے گروہ کے لیے اتمام حجت ہوگا۔ اور یہ تکلیف مالا یطاق اس لیے نہیں ہے کہ خدا کا یہ خبر دینا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ان کے ایمان نہ لانے کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف چونکہ وہ ایمان لانے والے نہیں اس لیے خدا اس بات کی خبر دے رہا ہے۔

وہ لوگ جو کفر اختیار کرکے اپنے مذہبی تشدد کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ان کے ایمان لانے کا امکان نہیں ہے، ان کے لیے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ یعنی مُہر لگانا، ان کے ایمان لانے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ ان کا ایمان نہ لانا مُہر کے لگنے کا سبب ہے۔ مندرجہ ذیل حوالہ بھی اسی بات کی نشان دہی کرتا ہے۔

"وَلٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ"

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ‏۔

اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ۔ [1]

لیکن وہ جو کھلے دل سے کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔

اور وہ اس لیے کہ انھوں نے آخرت پر دنیاوی زندگی کو پسند کیا ہے اور اللہ قوم کافرین کی ہدایت نہیں کرتا۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کی سماعت اور ان کی آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔

---

[1] سورۂ نحل۔ ۱۰۶/۱۰۷/۱۰۸۔

یہاں اگرچہ ختم کی جگہ طبع کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس کے معنی بھی مہر لگانے کے ہیں ، ان آیات سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) کفر کے لیے شرح صدر کرنا موجب غضب الٰہی اور موجب عذاب عظیم ہے۔
(۲) کفر کے لیے شرح صدر وہی کرے گا جو آخرت پر دنیاوی زندگی کو ترجیح دے گا۔
(۳) یہ ترجیح وہ خود دے گا اس میں اللہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ استحبوا کے فاعل وہی شرح صدر کرنے والے کفار ہیں۔
(۴) اللہ ایسی کافر قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔
(۵) یہ وہی لوگ ہیں جن کے قلوب و سمع و ابصار پر اللہ نے مُہر لگادی ہے۔

ان آیات سے بالصراحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کُفر کے لیے شرح صدر کرنا اور دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا مُہر لگنے کے اسباب ہیں۔ یعنی یہ مُہر انسان خود اپنے ارادے اور اپنی خواہش سے لگواتا ہے۔ اب یہ مہر لگنے کا عمل کیا ہے؟ تو اس کا جواب خود اس جُملے میں پوشیدہ ہے۔ کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ۔" یعنی اللہ ان سے ہدایت سلب کر لیتا ہے۔

یہ بحث ایک حتمی نتیجے تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر آیت ختم کے مذکورہ ترجمہ کی جگہ اس ترجمہ کو قبول کر لیا جائے جو قواعد نحویہ کو مدنظر رکھتے ہُوئے اس آیت کی ایک ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اگر غشاوۃ کو مبتدائے مؤخر اور عَلٰی سَمْعِھِمْ کو خبر مقدم اور عَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ کو عَلٰی سَمْعِھِمْ پر عطف مان لیا جائے تو اس صورت میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی سماعت اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اس ترجمہ کی رُو سے مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ انھوں نے اپنے گوش وچشم پر پردہ ڈال لیا ہے۔ اس لیے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔ علم حاصل کرنے کے بہترین ذرائع سماعت و بصارت ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں علمی مواد جمع کر کے قلب کے حوالے کرتی ہیں۔ اب اگر انسان صدائے حق کے مقابل اپنے کانوں کو بند کر لے اور آثار حق کے مقابل اپنی آنکھوں کو میچ لے تو فطری اور قہری طور پر اس کے دل پر مہر لگ جائے گی۔

ایک تیسرا نقطۂ نظر جو بہت دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ کفار کے قلوب پر مہر کا لگنا ، اور ان کا ایمان نہ لانا ، ان دونوں میں علت و معلول کا ربط نہیں ہے ، بلکہ یہ دونوں دو الگ الگ بیانات ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے دلوں پر اللہ نے مہریں لگادی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لیکن یہ دونوں حقیقتیں جدا گانہ ہیں۔

اس کی دلیل یہ آیت ہے۔

" بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ

اِلَّا قَلِيْلًا "[1]

"بلکہ ان کے کفر کے سبب خدا نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے، لہٰذا ان میں سے قلیل افراد کے علاوہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ آیت بہت واضح ہے کہ اگر مہر کرنا ایمان نہ لانے کا سبب ہوتا تو پھر نہ قلیل ایمان لاتے اور نہ کثیر، جب کہ مہر کے باوجود قلیل کا ایمان اس آیت سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مُہر کرنا ایمان لانے کے منافی نہیں ہے۔[2]

---

[1] سورۂ نساء، ۱۵۵

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل صفحہ ۱۷۱۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۞۸

يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۞۹

فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۞۱۰

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

یہ خدا کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکہ دے رہے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس بات کا شعور نہیں رکھتے۔

ان کے دلوں میں مرض ہے تو خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا اور چونکہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

"الٓمّٓ" کے بعد چار آیات میں مومنین کا تذکرہ کیا گیا، پھر دو آیات میں کفار کا ذکر کیا گیا، اب تیرہ آیات پر مشتمل منافقین کا ذکر شروع ہوا۔ قرآن مجید میں ان تینوں گروہوں کے لیے الگ الگ سُورے موجود ہیں، سورۂ مُومنون (۲۳)، سُورۂ منافقون (۶۳) اور سُورۂ الکافرون (۱۰۹)۔ ہم ایمان اور کفر و نفاق پر تفصیلی گفتگو ان شاءاللہ انھیں سُورتوں کے ذیل میں کریں گے۔

ان آیات میں سارے ایمانوں سے فقط ایمان باللہ اور ایمان بِالْیَوْمِ الْاٰخِر کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ یہ اسلامی عقائد کا نقطۂ آغاز اور نقطۂ اختتام ہیں اور سارے عقائد ان کے درمیان ہیں اور یہ بتلایا گیا کہ ان ایمانوں کا زبانی دعوٰے کرنے والے حقیقت میں مؤمن نہیں ہیں، بلکہ یہ لوگ اپنی دانست میں خدا اور مُومنین کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ انجان پن میں خود اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں اور وہ اس طرح کہ اللہ تو دھوکہ کھا نہیں سکتا۔ ان کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ تو جو شخص ایسے کو دھوکہ دے جو اس کے دھوکہ کو خوب سمجھتا ہے وہ خود ہی اپنے اس عمل کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئے مومنین تو ان پر زیادہ دنوں ان کے ظاہری ایمان کا جادُو چلنے والا نہیں ہے، ان کے کُفر کا راز کھُل جائے گا اور وہ اسلامی معاشرے میں ذلیل ہو کر رہ جائیں گے اور آخرت میں اپنے کیے کا بدلہ پالیں گے تو چند روزہ متاعِ دُنیا کے عوض آخرت کی دائمی نعمتوں کو ٹھکرا دینا دھوکہ کھانا نہیں تو اور کیا ہے؟ نفاق ان لوگوں کے دِل کا مرض ہے اور اللہ کی طرف سے ان کے مرض میں اضافہ اس طرح ہو رہا ہے کہ وہ ان کے مرض کا ازالہ نہیں کر رہا ہے اور نہ انھیں دُنیا میں ایسی کوئی سزا دے رہا ہے، جس سے وہ نفاق سے باز آجائیں لہٰذا وہ اپنی کیفیت نفاق پر مطمئن اور شاداں ہیں اور یوں ان کا مرض بڑھتا جا رہا ہے۔

قلب اور نفاق

قرآن نے، عقیدہ کے اعتبار سے انسانوں کی بنیادی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے:

"هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔"[1]

"وہ وہی ہے جس نے تم کو خلق کیا ہے، پھر بھی کچھ تم میں سے کافر ہیں اور کچھ مومن اور اللہ تمہارے ہر عمل کو دیکھتا ہے۔"

---

[1] سُورۂ تغابن۔ ۲۔

یعنی انسانوں کے بنیادی گروہ مؤمن اور کافر ہیں، لیکن زبان و دل کے اعتبار سے یہ تقسیم چار گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔جو اسلامی عقائد کا

(۱) دل اور زبان دونوں سے اقرار کرے وہ مؤمن ہے۔
(۲) دل اور زبان دونوں سے انکار کرے وہ کافر ہے۔
(۳) دل سے انکار کرے اور زبان سے اقرار کرے وہ منافق ہے۔
(۴) دل سے اقرار کرے اور زبان سے انکار کرے وہ تقیہ پر عامل ہے۔

اصطلاحِ قرآنی میں قلب (یعنی دل) سے مراد فقط وہ عضو نہیں ہے، جو انسان کے پہلو میں دھڑک رہا ہے، بلکہ یہ لفظ اکثر انسانی شعور، انسان کی قوتِ عاقلہ اور اس کی قوت ادراک کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اگر انسان کی قوت ادراک خدا اور رسولؐ کی تعلیم کردہ باتوں کو تسلیم کرے تو اسی کا نام ایمان ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے ایمان کی جگہ قلب تبلائی ہے۔

(۱) يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ الخ [۱]

اے رسولؐ جو کفر کی طرف جانے میں جلدی کر رہے ہیں ان کی خاطر تم غمگین نہ ہو ان میں بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور بعض یہودی ہیں۔

(۲) "اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ ۢ بِالْاِيْمَانِ" [۲]

جو شخص (کفر کے لیے) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو اس سے بازپرس نہیں ہوگی۔)

(۳) قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔ [۳]

دیہاتی عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

---

[۱] سورۂ مائدہ، ۴۱۔
[۲] سورۂ نحل ۱۰۶ - یہ وہی انسان ہے جس کا ذکر چوتھے گروہ کے طور پر کیا گیا ہے۔
[۳] سورۂ حجرات، ۱۴۔

۴ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ - ؎۱

یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔

اگر انسان کی طبیعت اپنی اصلی حالت سے ہٹ جائے تو انسان مریض ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کا قلب اپنی حالت اصلی یعنی ایمان سے ہٹ جائے تو مریض کہلائے گا، چونکہ منافقین کے قلب میں کفر بھی تھا، اسلام سے بغض اور رسولِ اسلام سے حسد بھی تھا، اس لیے قرآن نے ان کے قلب کو مریض فرمایا۔ یہ مرضِ کفر ایمان کی ضد ہے اور مرضِ بغض ؎۲ و حسد اسلام اور رسولؐ اسلام سے محبت کی ضد ہے۔ اس لیے جیسے جیسے اللہ اپنے اسلام اور رسولِ اسلام کو تقویت دیتا جا رہا تھا۔ ویسے ہی ویسے ان منافقین کے مرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے مجازاً اضافۂ مرض کو اللہ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

؎۱ سورۂ مجادلہ، ۲۲۔

؎۲ درحقیقت یہ سارے امراض ایک ہیں انھیں وضاحت کے لیے الگ الگ بیان کیا گیا۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡۤا
اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾
اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا
يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾
وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ
قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ
هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

آگاہ رہو کہ یہی لوگ مُفسد ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے کہ اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں، آگاہ رہو کہ یہی بے وقوف ہیں انھیں اس کا علم نہیں ہے۔

ان آیات کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ یہ منافقین احساس برتری کے مارے ہُوئے لوگ ہیں۔ صحیح مشورہ کو قبول کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، ان کی نگاہ میں فساد فی الارض اصلاح ہے اور ایمان لانا بے وقوفی اور حماقت ہے۔ اسی بات کو قرآن مجید نے ارشاد فرمایا کہ جب انھیں فساد سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں۔ اس جُملہ ہی سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی کچھ ایسی ریشہ دوانیاں اور مفسدانہ[1] حرکتیں مسلمانوں کے سامنے آچکی تھیں جو کھُلا ہوا فساد تھیں، لیکن وہ انھیں فساد ماننے پر آمادہ نہ ہوئے تو اللہ نے ان کے مفسد ہونے کا اعلان فرما دیا، اور اس شان کے ساتھ اعلان کیا کہ انھیں اپنے مفسد ہونے کا علم و شعور نہیں ہے۔ وہ لوگ چونکہ اپنے کفر پر باقی تھے اور ظاہری طور پر مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اس لیے ان کی پوری کوشش یہی تھی کہ اسلام ختم ہوجائے اور کفر پھر غالب آجائے اور اسے وہ اصلاح سمجھ رہے تھے اسی بات کو قرآن نے واضح کیا کہ یہ مصلح نہیں مفسد لوگ ہیں۔ اب یہ سوال کہ انھیں یہ کس نے کہا کہ زمین میں فساد مت کرو تو اس کے جواب میں مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ مومنین مدینہ جب ان کی حرکتوں سے چوکنا ہُوے ہوں گے تو انھوں نے باز رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔

پھر ان سے یہ بھی کہا گیا کہ دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو انھوں نے کہا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ یہ استفہام انکاری ہے یعنی ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ جواب خود اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ یہ مشورہ دینے والے مومنین نہیں تھے ورنہ اگر مومنین ہوتے تو مدینہ کے اسلامی سماج میں مومنین کو بے وقوف کہنے والا رہ نہیں سکتا تھا اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ مومنوں سے ملاقات کر کے کہتے تھے کہ ہم مومن ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مومنین کے سامنے اپنے ایمان کا اعلان بھی کریں اور انھیں بے وقوف بھی کہیں تیسری دلیل یہ ہے کہ یہ مشورہ وہی دے سکتا ہے جو ان کے کفر باطنی سے آگاہ ہو، لہٰذا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی آپس کی گفتگو ہے کہ ہم نے بہت دن ظاہری طور پر کلمہ پڑھ کر اور باطنی طور پر اسلام دشمنی کر کے دیکھ لیا اور ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ شوکتِ اسلام روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اور لوگوں کی طرح باطنی طور پر بھی ایمان لے آئیں، اس کا جواب انھیں میں سے کسی نے یہ دیا کہ ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔ البتہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ جب نرم مزاج صلح کل، اور دل سوز مومنین ان سے بطور مشورہ کہتے ہوں گے کہ جیسے اور لوگ ایمان لے آئے تم بھی ایمان لے آؤ تو وہ آپس میں مل بیٹھ کر اس پر تبصرے کے طور پر یہ جُملہ کہتے ہوں گے۔

---

[1] مثلاً مومنوں کو دھوکہ دینا، کافروں کی مدد کرنا، مومنوں کی باتوں کو کافروں تک پہنچا دینا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن نے کہا کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں، لیکن انھیں اپنی بے وقوفی کا علم نہیں ہے وہ جہل مرکب میں گرفتار ہیں۔ بے وقوف کے لیئے سفیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سفیہ اسے کہتے ہیں جسے عقل کی کمی کے سبب اپنے نفع و نقصان کا اندازہ نہ ہو۔ قرآن نے کہا کہ یہ لوگ سفیہ ہیں۔ اگر انھیں اپنے نفع و نقصان کا علم ہوتا تو یہ جنت کے مقابل دنیاوی زندگی کو ترجیح نہ دیتے اور دُنیا کو نفع اور آخرت کو نقصان نہ سمجھتے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی
شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ
مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾
اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ
طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی
فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا
مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾

اور جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ خلوت میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ہم تو ان کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔

اللہ ان کے ساتھ تمسخر کرتا ہے اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی

تو اس تجارت نے انھیں نفع نہیں پہنچایا اور انھیں ہدایت نہیں ملی۔

یہ منافقین دو رُخے ہیں۔ مومنین سے کچھ کہتے ہیں اور شیاطین سے کچھ اور کہتے ہیں۔ شیطان کے معنی سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ قرآن کی رُو سے شیطان جن بھی ہیں اور انسان بھی۔ یہ لفظ جمع کی صورت میں ان سرکش اور بدقماش سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اسلام اور رسولِ اسلامؐ کی دشمنی میں بہت آگے جا چکے تھے اور برآن ان کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ یہ منافقین، جب ایسے سرداروں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہمارے ظاہریِ اسلام سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ ہم تمھارے ہی ساتھ ہیں اور مسلمانوں سے تو فقط مسخرہ پن کر رہے ہیں۔

کہ قرآن نے اس سے قبل مومنوں کے ساتھ منافقوں کی گفتگو نقل کی تھی کہ جب مومنوں نے کہا فسادمت پھیلاؤ، تو جواب دیا کہ ہم تو اصلاح کر رہے ہیں اور اب کافروں سے ان کی گفتگو نقل کی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو مسلمانوں سے مسخرہ پن کر رہے ہیں۔ اس گفتگو سے مؤمنین و کافرین کے مزاج کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور وہ یُوں کہ جب مومنوں نے کہا کہ فساد مت پھیلاؤ تو منافقین جواب میں ان سے یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو کفار کے ساتھ مسخرہ پن کر رہے ہیں، حقیقت میں آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہیں تو کچھ دن ہمیں مسخرہ پن کر لینے دیجیے، لیکن انھوں نے مومنوں کو یہ جواب نہیں دیا اس لیے کہ جانتے تھے کہ مومنوں کا معاشرہ غیرسنجیدہ گفتگو، غیرشائستہ رویہ اور پھکڑپن کو پسند نہیں کرتا یہ خصوصیتیں تو کافر معاشرے کی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے تمسخر و تضحیک کا ذکر کافروں سے کیا۔ اس کے جواب میں اللہ نے ان کے تمسخر کا تذکرہ فرمایا۔

اس دنیا میں مکافاتِ عمل کا قانون جاری ہے اور اسی قانون کے تجربے نے یہ محاورے بنائے ہیں کہ جیسا کرو گے ویسا بھروگے اور انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے یا پھر یہ کہ ؎

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

اس قانون کے تحت جو تمسخر کرے گا اس کا تمسخر اڑایا جائے گا۔ یہ قانونِ مکافاتِ عمل چونکہ الٰہی قانون ہے۔ اس لیے قرآن نے عمل استہزار کی نسبت اللہ کی طرف دی ہے۔ اللہ کے استہزار کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ منافقوں کو ان کے اس عمل کی سزا دینے والا ہے۔ لیکن اگر اس

سے مراد سزا ہی ہے تو پھر یہی لفظ کیوں نہ استعمال فرمایا، وہ لفظ کیوں استعمال کیا جو اس کی شان کے منافی ہے؟ زبان وادب کے محاوروں میں یہ بات عام ہے کہ کسی چیز کے بدلے کو اسی چیز سے یاد کیا جاتا ہے۔ شعرائے عرب کے مندرجہ ذیل اشعار اس کی بہترین مثال ہیں۔

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا
فَنَجْھَلُ فَوْقَ جَھْلِ الْجَاھِلِیْنَا

آگاہ رہو کہ کوئی ہم سے جہالت کی بات نہ کرے ورنہ ہم جاہلوں کی جہالت سے بڑھ کر جہالت کریں گے۔ یعنی ہم اس کی جہالت کا سخت بدلہ لیں گے۔

قَالُوْا اقْتَرِحْ شَیْئًا نُجِدْ لَکَ طَبْخَہٗ
قُلْتُ اطْبُخُوْا لِیْ جُبَّۃً وَّقَمِیْصًا

انھوں نے کہا کہ ہم کو بتاؤ تو ہم تمھارے لیے کوئی اچھی شے پکادیں تو میں نے ان سے کہا کہ میرے لیے ایک جبہ اور ایک قمیص پکادو۔

جُبّہ اور قمیص پکائے نہیں جاتے، لیکن چونکہ پکانے کا تذکرہ تھا۔ اس لیے بدلے میں پکانا ہی استعمال ہوا۔

فَنَکَّبَ عَنْھُمْ دَرْءَ الْاَعَادِیْ
وَدَاوُوْا بِالْجُنُوْنِ مِنَ الْجُنُوْنِ

انھوں نے دشمنوں کے ستم کو دور کیا اور انھوں نے دشمنوں کے جنون کا علاج جنون ہی سے کیا۔

یہاں جنون سے علاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں سے شدت کے ساتھ بدلہ لیا۔ یہ اسلوب گفتگو صنعت مشاکلہ کہلاتا ہے اور قرآن میں اس کا استعمال بکثرت ہے۔

" فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ "[۱]

" تو جو تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم اس پر کردو "

یہ سب جانتے ہیں کہ زیادتی کا بدلہ لینا زیادتی نہیں ہے۔ بلکہ عین عدل ہے، لیکن قرآن نے اسے زیادتی کے نام سے یاد کیا ہے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ ۱۹۴۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا[1]

"اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔"

اور یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ بُرائی کا بدلہ لینا برائی نہیں ہے بلکہ اچھائی ہے۔ لیکن قرآن نے اسے بُرائی کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ استہزار کے بدلے کو قرآن نے اسی لفظ سے ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت اللہ کی طرف دی ہے۔

منافقین کا استہزار دُنیا میں بھی ہوگا اور آخرت میں بھی، دنیا میں مکافات عمل کے طور پر اور آخرت میں حتمی فیصلے کے طور پر۔

مومنین و متقین کی تعریف کے بعد فرمایا گیا تھا کہ وہ لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور وہ کامیاب لوگ ہیں اور اب منافقین کے تذکرے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو کیا پہلے ہدایت ان کے پاس موجود تھی، جسے بیچ کر انھوں نے گمراہی خریدی؟ یہ بھی بیان کا ایک خوبصورت پیرایہ ہے جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ ہر انسان پیدائشی طور پر فطرتِ اسلام پر ہوتا ہے اور بعد میں اس فطرت کو فروخت کر کے کچھ لوگ گمراہی خرید لیتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال مہمل ہوگا، کہ کس کے ہاتھ ہدایت کو فروخت کرتے ہیں؟ اور کس سے گمراہی خریدتے ہیں؟ اس لیئے کہ خرید و فروخت کا تذکرہ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں ہے۔

---

[1] سورۂ شوریٰ آیت ۴۰۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ
فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾
أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَ
رَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ
بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا
أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ روشن کی
تو جب آگ نے گردو پیش اجالا کر دیا تو خدا نے ان کی
روشنی چھین لی اور انھیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا ، وہ دیکھ

نہیں سکتے۔

یہ لوگ بہرے گونگے اندھے ہیں اب یہ واپس نہیں آئیں گے۔

یا ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے آسمان کی بارش، اس میں تاریکیاں بھی ہیں اور رعد و برق بھی، یہ لوگ بجلی کی کڑک سُن کر خوف مرگ سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور اللہ ان کافروں کو گھیرے ہُوئے ہے۔

قریب ہے کہ بجلی ان کی بصارتوں کو چھین لے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو چلتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو رُک جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہے توان کی سماعت اور بصارتوں کو چھین لے۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

دنیا کی کوئی ایسی زبان اور کوئی ایسا ادب نہیں ہے، جس میں امثال نہ ہوں۔ اور ان مثالوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ جو بات بدشواری سمجھ میں آتی ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ اسی لیے قرآن مجید نے مفاہیم کو ذہن انسانی سے قریب تر کرنے کے لیے مثلوں کو استعمال فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔[1] جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے قرآن میں ہر طرح کی مثلیں بیان کر دی ہیں تا کہ لوگ ان مثلوں میں غور و فکر کریں اور ان کے منشار کو معلوم کریں، اور

---

[1] سورۃ زمر، ۲۷

غور و فکر سے جو نتیجہ نکلے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

ان آیات میں منافقین کی جو مثال بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں اپنے گرد و پیش پر نگاہ رکھنے اور خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے روشنی کرتا ہے۔ ابھی روشنی ہو رہی تھی اور وہ ماحول کو دیکھ رہا تھا کہ یک بیک وہ روشنی بجھ گئی اور تاریکیاں اس پر محیط ہو گئیں یہی حال ان منافقین کا ہے کہ ظاہری اسلام کی روشنی ان کی زندگی کو منور تو کر دیتی ہے اور وہ اسلامی معاشرہ میں زندگی گزارنے لگتے ہیں، کہ اتنے میں فرشتۂ اجل آکر ان کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ظاہری اسلام کی روشنی بھی چلی جاتی ہے اور کفر کی تاریکیاں ان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔

پھر فرمایا گیا کہ یہ لوگ بہرے گونگے اندھے ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کم از کم ایک کام وہ کر رہے ہیں یعنی زبان سے توحید و رسالت کی گواہی دے رہے ہیں اور قیامت کو بھی تسلیم کر رہے ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ گونگے ہیں۔ لہٰذا اس کے مفہوم کو سمجھنا ہو گا کہ قرآن کا منشا کیا ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ ان میں سے فقط ایک مقام کی نشان دہی مطلب کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

"لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ" [1]

"ان کے پاس قلوب ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں ہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں ہیں یہ لوگ مویشیوں جیسے ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ حقیقی غافل ہیں۔"

اب اس آیت میں بھی یہی سوال پیدا ہو گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان قلب رکھ کر نہ سوچے اور چشم و گوش رکھ کر نہ دیکھے نہ سنے تو اس کا منشا یہی ہے کہ یہ لوگ ان طاقتوں کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں اسی اعتبار سے زیر نظر آیت میں انھیں بہرا کہا گیا کہ یہ لوگ سننے کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے اور حق سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور گونگا کہا گیا کہ جو بولنے کا تقاضا ہے اسے پورا نہیں کرتے جھوٹ بولتے ہیں یعنی سچائی کے ساتھ حق ان کی زبان پر جاری نہیں ہوتا۔ اسی طرح انھیں اندھا کہا گیا کہ آثارِ حق کو دیکھنے

---

[1] سورۂ اعراف، ۱۷۹۔

کا جو تقاضا ہے اسے پورا نہیں کرتے اور جب یہ اپنی ان توانائیوں کے کسی تقاضے کو پورا نہیں کر رہے ہیں تو اب ان کے پلٹنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

اس کے فوراً بعد دوسری مثال دی اور اس میں بتلایا کہ ایمان و ہدایت ایک بارش کی طرح ہیں۔ جو آسمان سے برس رہی ہو اور لوگ اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہوں۔ لیکن کچھ لوگ اس بارش کی تاریکیوں اور گرج چمک سے خائف ہوں۔ یہی حال منافقین کا ہے کہ وہ اس ایمان و ہدایت والی کتاب کی تہدید و وعید سے خوفزدہ ہیں اور صدائے حق کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ لیکن جہاں ذرا سی روشنی نظر آتی ہے چل پڑتے ہیں۔ یعنی فائدہ دنیوی کی طرف رغبت سے دوڑتے ہیں۔ اور جب پھر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے اپنا احسان جتلایا کہ جب یہ سماعت و بصارت سے کام نہیں لیتے تو اللہ چاہتا تو ان سے سماعت و بصارت کو چھین لیتا، مگر یہ اس کا احسان ہے کہ وہ ان چھینتا نہیں ہے تاکہ وہ ان طاقتوں سے مادی استفادہ کر سکیں۔ قرآن نے ان کی حالت کی منظر کشی اور احسان خداوندی کے تذکرہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ان کے لیے راہ فرار مسدود ہے۔

کافروں پر فقط دو آیات میں تبصرہ کیا گیا تھا، جبکہ منافقین پر تیرہ آیات میں تبصرہ کیا گیا ہے اس تفصیل سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں۔

(۱) منافقین کافروں سے زیادہ غضب الٰہی کا نشانہ ہیں۔

(۲) ان میں صفت کفر کے ساتھ ایک اضافی صفت جھوٹ بھی پائی جاتی ہے۔

(۳) یہ لوگ اسلامی معاشرے کے اندر رہ کر فتنہ و فساد پیدا کر رہے ہیں اس لیے تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا تاکہ مومنین ان صفتوں کے ذریعہ انھیں پہچان لیں۔

مومنین، کفار اور منافقین کے تذکرہ کے بعد اب سارے انسانوں کو مخاطب کیا گیا، یعنی جس طریقے سے سورۂ حمد میں غائب سے حاضر کی طرف ضمیروں کو موڑا گیا تھا، اسی طرح یہ صنعت التفات یہاں بھی برتی گئی کہ پہلے انسانوں کی بنیادی تقسیم بتلائی گئی اور پھر پوری انسانیت کو مخاطب کر کے کہا گیا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ
خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾
الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا
وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ
اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اے انسانو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمھیں
پیدا کیا اور تم سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا، بعید
نہیں ہے کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔
اسی نے تمھارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو
چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے
ذریعہ تمھارے رزق کے لیے پھل پیدا کئے تو تم جانتے
بوجھتے ہوئے کسی کو خدا کا شریک مت بناؤ۔

یہ موجودہ ترتیب کے اعتبار سے قرآن کا پہلا خطاب اور پہلا حکم ہے اور یہ مومنین یا متقین سے نہیں ہے، بلکہ سارے انسانوں سے ہے اس لیے کہ اللہ رب الناس، مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ [1] (پوری انسانیت کا رب ملک اور الٰہ ہے) اور اُس کی یہ کتاب ھدًی لِلنَّاسِ [2] (پوری انسانیت کے لیے ہدایت) ہے اور محمد رسول اللہ کافۃ للناس [3] (پوری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ پہلا خطاب بھی پوری انسانیت سے ہے۔

قرآن کے طریقۂ استدلال کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس بات پر یقین کر لیں کہ وہ نتیجہ دینے کے لیے صغرٰی اور کبرٰی کو مرتب نہیں کرتا اور نہ ذہن انسانی کو قیاسات و اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنساتا ہے بلکہ اس کے پیرایۂ اظہار کی طرح اس کا پیرایۂ استدلال بھی انوکھا اور نرالا ہے، وہ جس فطری سادگی کے ساتھ بات کو بیان کرتا ہے یا کوئی حکم دیتا ہے اسی سادگی کے ساتھ اس بات کی دلیل اور اس دعوٰی کا ثبوت بھی پیش کر دیتا ہے۔ اس بات کو اسی ایک آیت میں پرکھ لیں کہ اس نے انسانوں کو اللہ کی عبادت کا حکم دیا، لیکن لفظ اللہ استعمال نہیں کیا یا اس کے اسماء حسنٰی میں سے کوئی اور لفظ منتخب نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد کیا کہ "اپنے رب کی عبادت کرو" اور اس ربوبیت کی تشریح میں یہ بتلایا کہ وہ خالق بھی ہے، زمین و آسمان کو حیات کے لیے سازگار بنانے والا اور رزق فراہم کرنے والا بھی ہے۔ تو نعمتِ وجود سے لے کر ادنٰی ترین نعمت تک جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ اسی کا بخشا ہوا ہے اور چونکہ نعمت ملنے پر شکر ادا کرنا حیوان و انسان کا ایک جبلی اور فطری رویہ ہے، لہٰذا تم پر اس کے شکر کا وجوب فطری ہے اور شکر ادا کرنے کے طریقہ کا نام عبادت ہے لہٰذا اس کی عبادت کرو۔

تو یہ عبادت درحقیقت اس کی نعمتوں کا شکر ہے۔ اس کی نعمتیں لاتُعد، ولاتُحصٰی ہیں اور ان کے مقابل ہماری عبادتیں محدود ہیں۔ لہٰذا اگر ہم پوری زندگی بھی عبادت میں گزاریں تب بھی اس کا شکر ادا ہونا ممکن نہیں ہے۔ تو جب ہماری ساری زندگی کی عبادتیں اس کے شکر کے مقابلے میں انجام پا رہی ہیں، اور پھر بھی اپنے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہیں تو ہمیں آخرت میں ان کا اجر و ثواب کیسا ملے گا؟ لیکن اس کی رحمانیت کا کمال ہے کہ وعدہ فرماتا ہے کہ اگر عبادت کرو گے تو اجر و ثواب سے نوازوں گا، یعنی پہلی نعمتیں بھی بلا استحقاق ملی تھیں اور اب یہ دوسری نعمتیں بھی بلا استحقاق

---

[1] سورۂ ناس، ۱، ۲، ۳۔

[2] سورۂ بقرہ، ۱۸۵۔

[3] سورۂ سبا، ۲۸

ہی ملیں گی اور یہ اس کے فضل و احسان کا ایک عجیب رُخ ہے

لعل کا استعمال

لعل حروف مشبہہ بفعل میں ہے یہ اپنے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ اس کے معنی امید اور ترجی کے ہیں، چونکہ انسان مستقبل سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے حق ہے کہ وہ اپنے جملوں میں اس کا استعمال کرے، لیکن خدا کیوں استعمال کرتا ہے؟ کیا اسے بھی کسی مستقبل یا کسی انجام کے بارے میں شبہ ہوتا ہے؟ کیا وہ بھی کوئی امید لگاتا ہے؟ اس کے چند جوابات ہیں۔

(۱) وہ کسی شے کی علت بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً

"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" [1]

"پھر ہم نے اس کے بعد تمھیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو"

(۲) جب اسے اللہ استعمال کرے تو اس سے متکلم کی امید نہیں بلکہ صورتِ حال کی امید کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ رسولؐ اللہ کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔

"لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ" [2]

"شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کر بیٹھو کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے"

یعنی جو بھی رسولؐ کی صورتِ حال کو دیکھے گا وہ یہی کہے گا کہ شاید رسولؐ اس راہِ تبلیغ و ہدایت میں اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔ یہی مفہوم زیرِ بحث آیت میں ہے کہ اگر عبادت کرو گے تو ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی کہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ گے۔

(۳) اس کے استعمال کا مقصد انسان کو بیم و رجاء کے درمیان رکھنا ہے۔ اگر حتمی نجات معلوم ہو جائے تو انسان مغرور ہو جائے اور اگر حتمی ہلاکت معلوم ہو جائے تو انسان مایوس ہو جائے اور یہ دونوں ہی کیفیتیں قرآن کی نگاہ میں انتہائی غلط اور ناپسندیدہ ہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں توحید کو حرفِ آغاز قرار دیا گیا ہے اس کے بعد کی آیت میں شرک کی نفی پر آیت کا اختتام کیا گیا ہے اور درمیان میں ایسے جملے رکھے گئے ہیں جو بیک وقت اللہ کے وجود کی دلیل بھی ہیں اور اس کے اوصاف کا بیان بھی تاکہ انسان ان دلائل و اوصاف کے ذریعے سے اللہ کی معرفت حاصل کر سکے اس

---

[1] سورۂ بقرہ ۵۲۔

[2] سورۂ شعراء ۳۔

لیے کہ یہ معرفت لازمۂ عبادت ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ انسان اللہ کو پہچانے یا نہ پہچانے اپنے آپ کو ضرور پہچانتا ہے اور اپنے حوالے سے اپنے آباء و اجداد کو پہچانتا ہے۔ اس زمین کو پہچانتا ہے، جس پر اس کا قیام ہے۔ اس آسمان کو پہچانتا ہے جس کے زیرِ سایہ سانس لے رہا ہے اور اس رزق کو پہچانتا ہے جو بارش کے زیرِ اثر پیدا ہو رہا ہے۔ اس لیے خود انسان ہی کے حوالے سے خدا پر بات کی گئی ہے۔ وہی ہے جس نے

تمھیں خلق کیا
تمھارے آباء و اجداد کو خلق کیا
زمین کو فرش بنایا
آسمان کو چھت بنایا
بارش کے ذریعہ رزق فراہم کیا

ان پانچوں دلیلوں میں دو کا تعلق انفس سے ہے اور تین کا تعلق آفاق سے ہے اور اس میں بھی اہتمام رکھا کہ جو چیز انسان کے قریب تر ہے اسے پہلے بیان کیا اور جو نسبتہً دور ہے اسے بعد میں بیان کیا۔ اس تفصیل کے بعد فرمایا کہ جانتے بوجھتے ہوئے اللہ کے شریک نہ بناؤ۔ یعنی جب تم یہ جانتے ہو کہ مذکورہ باتوں پر اللہ کے علاوہ کوئی قادر نہیں ہے تو پھر شرک مت کرو۔ اس سے قبل کی آیت کے پہلے جزء میں موجودہ ترتیب کا پہلا امر تھا اور اس آیت کے آخری جزء میں موجودہ ترتیب کی پہلی نہی ہے۔

زمین و آسمان

زمین و آسمان اور ان کے درمیان ہونے والی بارش میں نظم اور مقصدیت دونوں پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں وجود باری کے دو عادل گواہ ہیں۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے اس آیت کے ذیل میں اس بات کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زمین کے لیے فرمایا۔

"جَعَلَهَا مُلَائِمَةً لِطَبَائِعِكُمْ مُوَافِقَةً لِأَجْسَادِكُمْ وَلَمْ يَجْعَلْهَا شَدِيدَةَ الْحَمَاءِ وَالْحَرَارَةِ فَتُحْرِقُكُمْ وَلَا شَدِيدَةَ الْبُرُودَةِ فَتُجْمِدُكُمْ وَلَا شَدِيدَ طِيبِ الرِّيحِ فَتُصَدِّعُ هَامَاتِكُمْ وَلَا شَدِيدَ النَّتْنِ فَتُعْطِبُكُمْ وَلَا شَدِيدَةَ اللِّينِ كَالْمَاءِ فَتُغْرِقُكُمْ وَلَا شَدِيدَةَ الصَّلَابَةِ فَتَمْتَنِعُ

عَلَيْكُمْ فِي دُوْرِكُمْ وَاَبْنِيَتِكُمْ وَقُبُوْرِ مَوْتَاكُمْ وَلٰكِنَّهُ عَزَّوَجَلَّ جَعَلَ فِيْهَا مِنَ الْمَتَانَةِ مَا تَنْتَفِعُوْنَ بِهٖ وَ تَتَمَاسَكُوْنَ وَتَتَمَاسَكُ عَلَيْهَا اَبْدَانُكُمْ وَبُنْيَانُكُمْ وَجَعَلَ فِيْهَا مَا تَنْقَادُ بِهٖ لِدُوْرِكُمْ وَقُبُوْرِكُمْ وَ كَثِيْرٍ مِّنْ مَنَافِعِكُمْ فَلِذٰلِكَ جَعَلَ الْاَرْضَ فِرَاشًا لَكُمْ"

"خدا نے زمین کو تمہاری طبیعتوں کے لیے سازگار اور جسموں کے لیے موافق بنایا ہے بہت زیادہ گرم نہیں قرار دیا کہ تمہیں جلا دے اور نہ شدید سرد کہ تمہیں جما دے، اور نہ انتہائی خوشبو دار کہ تمہارے سروں میں درد کر دے اور نہ بہت بدبو دار کہ تمہارے لیے پریشانی کا سبب ہو نہ پانی کی طرح بہت نرم کہ ڈوب جاؤ اور نہ بہت سخت کہ تمہیں مکانات و عمارات بنانے اور قبریں کھودنے سے روک دے، لیکن خدا نے اس میں وہ استحکام رکھا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے جسموں اور اپنی تعمیرات کو باقی رکھ سکو اور اس میں تمہارے گھر اور تمہاری قبریں باقی رہ سکیں اور تمہاری بہت سی منفعتیں اس میں محفوظ رہ سکیں لہٰذا اس نے تمہارے لیے زمین کو فرش قرار دیا ہے۔"

آسمان کے لیے ارشاد فرمایا۔

سَقْفًا مِّنْ فَوْقِكُمْ مَحْفُوْظًا يُدِيْرُ فِيْهَا شَمْسَهَا وَقَمَرَهَا وَنُجُوْمَهَا لِمَنَافِعِكُمْ"

"اسے تمہارے سروں پر محفوظ چھت کی صورت میں قائم کیا اور اس میں سورج چاند اور ستاروں کو تمہاری منفعتوں کے لیے قرار دیا۔"

بارش کے لیے ارشاد فرمایا۔

اَلْمَطَرُ يُنَزِّلُهُ مِنْ اَعْلٰى لِيَبْلُغَ قُلَلَ جِبَالِكُمْ وَ تِلَالِكُمْ وَهِضَابِكُمْ وَاَوْهَادِكُمْ ثُمَّ فَرَّقَهُ رَذَاذًا وَوَابِلًا وَهَطْلًا لِتَنْشِفَهُ اَرْضُوْكُمْ وَلَمْ يَجْعَلْ ذٰلِكَ الْمَطَرَ نَازِلًا عَلَيْكُمْ قِطْعَةً وَاحِدَةً فَيُفْسِدُ اَرْضَكُمْ وَ اَشْجَارَكُمْ وَزُرُوْعَكُمْ وَثِمَارَكُمْ [1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۱۴۱۔

"پانی کو بلندی سے برسایا تاکہ پہاڑوں کی چوٹیوں، پہاڑیوں، بلند زمینوں اور پست علاقوں تک پہنچ جائے، پھر اس کا کچھ حصہ بوندا باندی کچھ موسلا دھار بارش اور کچھ پھوار کی صورت میں اتارا تاکہ زمین خوب سیراب ہو جائے اور اس بارش کے قطروں کو اکٹھا اور جمع کر کے نہیں برسایا، ورنہ تمہاری زمینیں تمہارے درخت تمہاری کھیتیاں اور تمہارے پھل سب برباد ہو جاتے۔"

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ
الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم اس کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کے مثل ایک ہی سورہ بنا لاؤ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے گواہوں کو بھی مدد کے لیے پکار لو اگر سچے ہو۔

اور اگر ایسا نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ سے جو خطاب شروع ہوا ہے۔ اس سے یہ تیسری اور چوتھی آیت ہے یعنی یہ تحدی پوری انسانیت کو ہے۔ یہ آیات اپنے ماقبل سے اس طرح متصل ہیں کہ فرمایا گیا

کہ خدا کو تو جانتے ہو۔ اب اگر اس قرآن کے کتاب خدا ہونے میں شک ہے تو اس کے مثل ایک سُورہ بنا لاؤ۔ اثباتِ توحید کے بعد ان آیات میں رسُولُ اللہ کی نبوت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس میں بھی استدلال کا فطری اور سادہ لب و لہجہ رکھا گیا تاکہ ہر سطحِ فکر کا انسان بات کو آسانی سے سمجھ لے اور دلیل اس کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے — اور وہ یہ ہے کہ منکرین سے کہا گیا کہ اگر تم اس کتاب کو خدا کی کتاب نہیں سمجھتے ہو اور تمہاری نگاہ میں یہ پیغمبرؐ کے اقوال ہیں تو تمہیں تکلف کیا ہے۔ تم بھی ایسے ہی اقوال و کلمات بنا لاؤ۔ اس لیے کہ جس طرح اس بندے نے بنائے ہیں۔ اسی طرح تم بھی ان کے بنانے پر قادر ہو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مرحلہ اول میں ان آیات کے اوّلین مخاطب وہ منکرینِ عرب تھے جو فصاحت و بلاغت میں مشہور زمانہ تھے، حکمت و ادب میں یکتائے روزگار تھے اور غیرت و حمیت ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس کھلی ہوئی تحدّی (چیلنج) نے ان کے ذوق ادب کو بھی للکارا اور ان کے جذبہ حمیت کو بھی بیدار کیا۔ اس کے مقابل ان عربوں نے قتلِ رسُولؐ کی سازشیں کیں، جنگیں لڑیں، قتل ہونا گوارا کیا لیکن وہ آسان کام نہ کیا جو اُن کے قبضۂ قدرت میں تھا۔ یہی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور محمدؐ اللہ کے رسُول ہیں۔

عمیق نظروں سے دیکھا جائے تو ایک آیت میں تین دعوے ہیں۔ پہلا یہ کہ معجزہ ایک حقیقتِ واقعی ہے، دوسرا یہ کہ قرآن ایک معجزہ ہے، اور تیسرا یہ کہ محمدؐ رسول اللہ پروردگارِ عالم کے وہ عبدِ خاص ہیں جو نبوت کے اعزاز کے حامل ہیں اور ان پر یہ قرآن نازل ہو رہا ہے اور ان تینوں دعووں کے سچے ہونے کی حتمی اور یقینی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے بار بار چیلنج کرنے کے باوجود اس کا جواب نہیں لکھا گیا۔ معجزہ کیا ہے؟ اور قرآن کے وجوہِ اعجاز کیا ہیں؟ ان پر اگلے صفحات میں گفتگو کی جائے گی۔

"اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ"

"اگر تم شک میں ہو"

یہ وہی کتاب ہے جس کے لیے آغاز میں لاریب فیہ کہا گیا تھا۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں اس کتاب میں ریب و شک ہے تو اس کے مثل ایک سورہ بنا لاؤ۔ ان دونوں جملوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ تبلانا یہ تھا کہ اصل کتاب میں ایسی کوئی شے نہیں ہے جو قابلِ شک ہو، لہٰذا شک درحقیقت معترض کے ذہن میں ہے اور اسی شک کو دور کرنے کے لیے یہ چیلنج کیا گیا ہے۔

"فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ"

"اس کے مثل ایک سورہ بنا لاؤ۔"

اب سوال یہ ہے کہ "اُس" کی ضمیر کس طرف پلٹ رہی ہے، یعنی کس کے مثل سُورہ بنا لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے؟

پہلا قول یہ ہے کہ "مِنْ مِّثْلِهٖ" سے مراد قرآن ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم قرآن کے سُورں

کی مثل ایسی ہی فصاحت و بلاغت کا حامل اور ایسے ہی مطالب عالیہ پر مشتمل ایک کلام بنا لاؤ۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مثل قرآن جو آسمانی کتب ہیں، جیسے توریت و انجیل تو انھیں میں سے قرآن جیسی کوئی سورت لے آؤ اور اگر نہ لا سکو تو سمجھ لو کہ جب آسمانی کتابیں اس کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو تم کیا کرو گے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس کی ضمیر "عَبْدِنَا" کی طرف پلٹتی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہمارا بندہ جو کسی مکتب میں نہیں گیا اور نہ کسی مدرسہ میں تعلیم کے لیے بیٹھا اس کے باوجود یہ مطالب عالیہ پر مشتمل کلام تمھیں سنا رہا ہے تو تم بھی اس بندے کی مثل بغیر مکتب اور بغیر مدرسہ والا ایک شخص لے آؤ جو اس کی طرح ایک ہی سورۂ سنا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں اقوال اپنے اپنے مقام پر وزن رکھتے ہیں اور چونکہ متضاد نہیں ہیں۔ اس لیے دقت واحد میں ان سب کو مراد لیا جا سکتا ہے۔ پہلے قول کی نسبت سے یہ خطاب ہر منکر سے متعلق ہوگا، دوسرے قول کے حوالے سے یہ اہل کتاب سے متعلق ہوگا اور تیسرے قول کی نسبت سے کفار و منافقین سے متعلق ہوگا۔

" وَلَنْ تَفْعَلُوْا "

" اور ہرگز نہ کر سکو گے "

یہ جملہ ایک مستقل دعوے اور اپنی ذات میں ایک مستقل معجزہ ہے یہ رہتی دنیا اور بہتے پانی تک صداقتِ رسولؐ اور حقانیت قرآن کا اعلان کرتا رہے گا۔

" اَلنَّاسُ وَالْحِجَارَةُ "

" انسان اور پتھر "

انسانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہنم کے مستحق ہیں اور پتھر سے مراد وہ بت ہیں جنھیں مختلف ادوار میں پوجا جاتا رہا ہے۔

جیسا کہ خود قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے۔

" اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ " [1]

" تم اور جن چیزوں کی پوجا کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔

" اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ "

" جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے "

---

[1] سورۂ انبیاء ، ۹۸۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ جہنم کو خلق نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ موجود ہے۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب ضرورت ہوتی جب بنا لیا جاتا اس وقت اس کا فائدہ کیا ہے؟ تو حکیم کوئی عمل بلا مصلحت انجام نہیں دیتا یہ فطرت ہے کہ انسان موجود چیز کا اعتبار اس چیز کے مقابلہ میں زیادہ کرتا ہے جو ابھی موجود نہ ہو اور جس کا فقط وعدہ یا وعید ہو اسی لیے جنت و جہنم دونوں اپنے حقیقی وجود کے ساتھ موجود ہیں اور ایمان بالغیب کے اس دائرہ میں شامل ہیں، جن پر ایمان لانا لازمی ہے۔

عبدِ مطلق

اس آیۂ مبارکہ میں سورۂ محمدﷺ کی آیت کی طرح "عَلٰی مُحَمَّدٍ" نہیں ہے بلکہ "عَلٰی عَبْدِنَا" ہے کہ یہ کتاب ہم نے اپنے عبد پر نازل کی ہے۔ عبد اسے کہتے ہیں جو اپنے مالک کا بے انتہا مطیع اور فرماں بردار ہو، جو اپنے مالک کے ہر حکم کے آگے فروتن ہو اور اپنے آپ کو اس کا غلام اور مملوک سمجھے۔ "عبد" کہ کر اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا "عبد" ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے کلام بنائے اور ہماری طرف منسوب کر دے۔ اس لیے جان لو کہ وہ جن باتوں کی نسبت ہماری طرف دے رہا ہے وہ لفظ بہ لفظ ہماری ہی باتیں ہیں۔ کسی اور کی نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ معبود ہے اور ہر ذی شعور مخلوق اس کے دائرہ عبدیت میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔

"اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا" ؎۲

"آسمان و زمین کا ہر ذی شعور باشندہ رحمٰن کا عبد ہے۔"

لیکن اس اعلان کے باوجود عبدیت کی شان اتنی بلند ہے کہ اللہ نے ہر ایک کو اپنا عبد نہیں کہا بلکہ کچھ خاص شخصیتوں کی عزت افزائی کی اور انھیں خصوصیت کے ساتھ اس لقب سے یاد فرمایا۔

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ؎۳

"بے شک وہ (نوح) ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔"

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ

؎۱ سورۂ محمد، ۲۔

؎۲ سورۂ مریم ۹۳۔

؎۳ سورۂ بنی اسرائیل، ۳۔

عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ" [1]

"براہیم پر سلام ہو، ہم نیک بندوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں بے شک وہ ہمارے مؤمن بندوں میں ہے۔

"نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ" [2]

کیا اچھا بندہ تھا (سلیمان) باربار رجوع کرنے والا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" [3]

"وہ بس ہمارا نعمت یافتہ بندہ ہے اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے مثال قرار دیا۔"

ان چند آیتوں ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ سارے انسان اللہ کے عبد ہیں لیکن خود اللہ اپنا عبد پیغمبروں ہی کو کہتا ہے اور فقط عبد نہیں کہتا، بلکہ صفات کا اضافہ بھی فرماتا ہے ان میں کوئی عبدِ شکور ہے، کوئی عبدِ مؤمن ہے، کوئی عبد اواب ہے، کوئی عبد منعم ہے اس کے برخلاف حبیب رسولِ اکرم کا ذکر فرمایا تو کوئی صفت نہیں لگائی۔ زیرِ نظر آیت میں فرمایا۔ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ [4] سورۂ فرقان میں فرمایا۔ "تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ" [5] اور سورۂ نجم میں فرمایا فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى" [6]

اس کا سبب یہ ہے کہ۔

"تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" [7]

"ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔"

تو کسی رسول میں دوسرے رسولوں کی نسبت شکر زیادہ تھا، اسے عبد شکور کہا، کسی میں ایمان

---

[1] سورۂ صافات ۱۰۹ / ۱۱۰ / ۱۱۱۔

[2] سورۂ ص، ۳۰۔

[3] سورۂ زخرف، ۵۹۔

[4] سورۂ بنی اسرائیل، ۱۔

[5] سورۂ فرقان، ۱۔

[6] سورۂ نجم، ۱۰۔

[7] سورۂ بقرہ، ۲۵۳

زیادہ تھا اسے عبد مومن کہا کسی میں اوابیت زیادہ تھی اسے عبد اواب کہا۔ لیکن آخری رسولؐ صفات وفضائل کی اس بلندی پر ہے کہ ایمان واخلاص اور شکر واوابیت سب درجہ کمال پر ہیں، بلکہ جتنی بھی انسانی صفات کمال ہیں وہ سب کی سب اس عبد کامل میں اپنے کمال پر ہیں تو اب اس کی عبدیت کے اعلان پر یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا کہ کونسی صفت بیان کی جائے اور کسے نظر انداز کیا جائے اس لیے ساری صفات کو ہٹا کر فقط عبدیت کا اعلان کیا گیا۔ یہ بھی اس عبد کی اک فضیلت خاص ہے کہ جو بات دوسرے رسولوں کے لیے فضیلت بنتی ہے وہ اس وجود مبارک کے لیے نقص قرار پاتی ہے۔ یہ ہے وہ عبد مطلق کہ جس پر قرآن کو معجزہ بنا کر نازل کیا گیا۔

ضرورت معجزہ

عقلا کی سیرت یہ ہے کہ وہ کسی دعوے کو دلیل کے بغیر تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اگر یہ رسم بن جائے کہ انسان دعووں کو دلیل کے بغیر تسلیم کر لے تو پھر قیامت تک یہ طے نہیں ہو سکتا کہ کون سا دعوے صحیح ہے اور کون سا غلط ہے۔ انسان کی فطرت میں اقتدار کی خواہش، محبوب خواص و عوام ہونے کی خواہش مسموع الکلمہ ہونے کی خواہش اور حاکم و مطاع ہونے کی خواہش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے فنا پذیر اور زوال آمادہ عہدوں کا خواہش مند رہتا ہے۔ ان کی طلب میں سرگرداں رہتا ہے انھیں پانے کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور ہر جائز و ناجائز وسیلہ استعمال کرتا ہے اور اگر پالے تو انھیں بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ ——— تو وہ عہدے جو خدا کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اور جن کے ڈانڈے عرش و کرسی سے ملے ہوئے ہیں۔ کیا ان گنت دلوں میں ان کے پالینے کی تڑپ نہ ہوگی؟ یہی سبب ہے کہ تاریخ ہدایت کے مختلف ادوار میں ہادیان برحق کے ساتھ جھوٹے مدعیان منصب کی بھی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ اب اگر سچے اور جھوٹے مدعیان منصب کے درمیان کوئی ایسا خط فاصل نہ ہو جو حق و باطل میں تمیز پیدا کر سکے تو ایک طرف خدا کا پورا منصوبہ ہدایت ناکامیاب ہو جائے گا اور دوسری طرف نسل انسانی حیرت و ضلالت کی وادیوں میں قیامت تک سرگشتہ رہے گی اور اسے صراط مستقیم نہ مل سکے گی، لہٰذا ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے افراد ایسی حتمی دلیل لے کر آئیں کہ ان کی صداقت بھی ثابت ہو اور بندوں پر اللہ کی حجت بھی تمام ہو جائے۔ وہ حتمی دلیل معجزہ کہلاتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے نمائندوں کو ایک ایسی طاقت عطا کرتا ہے جو انسانیت کی ساری توانائیوں سے بلند ہوتی ہے اور وہ اسی طاقت کی بنیاد پر ایسے کام انجام دیتے ہیں۔ جن کی انجام دہی سے پوری انسانیت فرداً فرداً بھی عاجز ہو اور مجموعی

طور پر بھی، اور وہ اعمال وافعال عام طبیعی اور فطری قوانین کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور انھیں تحصیل واکتساب کے ذریعے سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔

غیر معمولی افعال

شعبدہ اور سحر بھی ایسے اعمال ہیں، جو بظاہر عام طبیعی قوانین کے خلاف رونما ہوتے ہیں۔ جب کہ سائنس اور ٹکنیالوجی کی ایجادات بھی اسی ذیل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ یہ جملہ کہ کراکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ پھر ان میں اور معجزہ میں کیسے فرق کیا جائے؟ پہلا فرق تو یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں عام طبیعی اور فطری قوانین کے خلاف اس لیے محسوس ہوتی ہیں کہ ہر انسان کی نگاہ ان کے اسباب واقعی تک نہیں پہنچ پاتی، ورنہ درحقیقت وہ بھی اپنے اسباب وعوامل کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ جب کہ معجزہ اس کے برعکس ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ مذکورہ ساری چیزیں اکتسابی ہیں، جنھیں سیکھنے والا سیکھ سکتا ہے۔ شعبدہ بازی اور سحر ایسے علوم دفنون ہیں۔ جن کے ماہرین پائے جاتے ہیں، دُنیا کی مختلف زبانوں میں کتابیں پائی جاتی ہیں اور متمدن ممالک میں ان کے تربیتی ادارے بھی موجود ہیں۔ اسی طرح سائنسی ایجادات متعلقہ علوم کے مروّج قواعد وکلیّات کے تحت وجود میں آتے ہیں اور ان علوم کے ماہرین ان سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں لہٰذا کوئی بھی شخص ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد ان ایجادات پر قادر ہوسکتا ہے۔ جب کہ معجزے میں قواعد وکلیات نہیں ہوتے کہ انھیں حاصل کرنے کے بعد انسان اس جیسا کام کرسکے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی موجد یا ساحر و شعبدہ باز کسی خدائی منصب کا دعوٰی کرتے ہوئے کوئی عجوبہ کام انجام دے تو بہت سے لوگ جو ان علوم دفنون کے ماہرین ہوں گے وہ اس کے جواب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اب اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی شعبدہ باز یا جادوگر نے یا کسی موجد نے ایسا کام کر دکھایا جو محیّر العقول ہو اور دوسرے لوگ بھی اس کی مثل لانے میں عاجز ہوں اور کوئی ایسی بات بھی نگاہوں کے سامنے نہ ہو جو اس کے دعوے کے بطلان کی دلیل ہو تو ایسی صورت میں بربنائے حکمت وعدل خدا پر لازم ہوگا۔ کہ اس کے جھوٹے دعوے کو توڑنے کے لیے یا وہ قوت اس سے سلب کرلے یا کسی دوسرے شخص کے ذریعہ اس کے غیر معمولی عمل کے چیلنج کو باطل کروادے۔ اگلی بحث میں اس پر مزید گفتگو کی جائے گی۔

معجزہ اور اثبات نبوّت

کسی بھی دعوے پر توجہ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قابل سماعت ہو۔ قابل سماعت دعوے

کا مطلب یہ ہے کہ اس میں صداقت کا احتمال پایا جاتا ہو۔ اگر کسی دعوے میں احتمالِ صدق ہی نہ ہو اور اس کا باطل ہونا یقینی طور پر معلوم ہو، تو پھر ایسا دعویٰ قابلِ سماعت اور لائقِ توجہ نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص خدائی کا دعویٰ کر دے یا ایسا دعوےٰ کرے جو محالِ عقل ہو یا محسوسات کے خلاف ہو یا جس کا غلط ہونا پہلے سے ثابت ہو یا مدعی نبوت ایسا دعوےٰ کرے، جس سے پہلے انبیاء کی تکذیب لازم آتی ہو وغیرہ تو ان ساری صورتوں میں مدعی کا دعویٰ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اب اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مدعی ایسا دعویٰ کرے، جو میزانِ عقل کے مطابق ہو اور اس مدعی یا اس کے دعوے میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اسے ناقابلِ سماعت قرار دیتی ہو تو اس پر توجہ دینا لازمی ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ شاید وہ اپنے دعوے میں سچا ہو۔ اگر وہ سچا ہوا تو اس کی تکذیب انسان کو مستحقِ عذاب بنا دے گی۔ لہٰذا دفعِ ضررِ محتمل کے عقلی قاعدے کی رُو سے عقلاً واجب ہوگا کہ اس کے دعوے پر نگاہ کی جائے اور اس کی صداقت کو جانچا جائے۔

انبیاء کے دعووں پر نگاہ کرنے کے لیے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہوگی:

(۱) یہ ثابت ہو کہ فلاں شخص نے دعوائے نبوت کیا ہے اور یہ اسی وقت ثابت ہوگا جب انسان براہِ راست مدعی کی زبان سے اس کا دعویٰ سُنے یا مسلم الثبوت معصوم شخص کی زبان سے اس دعویٰ کا ذکر سُنے یا پھر لوگوں میں یہ خبر بہ عنوان تواتر شہرت پا چکی ہو۔

(۲) یہ ثابت ہو کہ مدعی کا دعویٰ قابلِ سماعت ہے اور یہ معلوم ہو کہ مدعی اوصافِ حسنہ کا حامل ہے اور ان چیزوں سے بری ہے جو نبوت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ سرے سے عہدۂ نبوت کے لائق ہی نہ ہوگا اور اس کے دعوے پر توجہ دینا ایک فعلِ عبث ہوگا۔

جب یہ دونوں چیزیں ثابت ہو جائیں تو اب اس سے مطالبہ ہوگا کہ وہ اپنے نبی ہونے پر دلیل پیش کرے۔ اس مطالبے کے بعد اگر وہ اپنے نبی ہونے کے ثبوت میں کوئی معجزہ دکھلا دے، تو یقینی طور پر اس کی نبوت ثابت ہو جائے گی اور اس کی تصدیق واجب ہوگی یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر مدعی کا حتمی طور پر جھوٹا ہونا اور دعوے کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو اس سے معجزہ کا مطالبہ نہیں ہوگا بلکہ اگر وہ غیر معمولی اور محیر العقول عمل بھی انجام دے دے جب بھی اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی اور نہ اللہ پر یہ لازم آئے گا کہ وہ اس کے دعوے اور عمل کو باطل کرنے کا بندوبست کرے۔

دعوائے نبوّت اور معجزہ کا ربط

پروردگار عالم حکیم اور عادل ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ انسانوں کی تخلیق کی غرض معین کرے۔ اس نے اپنی عبادت کو ان کی تخلیق کی غرض قرار دیا۔ اسی طرح اس کے عدل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ انسانوں کو ان کی غرض تخلیق پر مطلع کرے تاکہ وہ اس کو پورا کر سکیں۔ اسکی تکمیل کے لیے اس نے سلسلہ ہدایت کو جاری فرمایا اب یہ عقلاً ناممکن ہے کہ وہ ایسے امور انجام دے جن سے غرض تخلیق اور منصوبہ ہدایت دونوں برباد ہو جائیں اگر وہ کسی جھوٹے شخص کو معجزہ عطا کر دے تو یہ عمل، خلق کی گمراہی کا سبب ہوگا لہٰذا اگر کوئی شخص خدا کی نمائندگی کا دعویٰ کرے اور محیر العقول اور عاجز کر دینے والا کام انجام دے تو اس کا مطلب یہی ہوگا وہ اس عمل کو اللہ کی بخشی ہوئی طاقت اور اس کے اذن سے انجام دے رہا ہے۔

اب یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ انبیاء و مرسلینؑ ہدایت کے لیے آتے ہیں اور سند و دلیل کے طور پر وہ کام انجام دیتے ہیں جو اگرچہ معجزہ ہے لیکن مطابق دعویٰ نہیں ہے تو ان کے دعوے کو کیوں قبول کیا جائے؟ اس سوال کی مزید تشریح یہ ہے کہ ایک شخص دُنیا کا سب سے بڑا طبیب اور معالج ہونے کا دعویٰ کرے اور جب ثبوت مانگا جائے تو وہ ہوا میں اڑ جائے اور کہے کہ یہ ہے ثبوت تو اگرچہ ظاہری اسباب کے بغیر ہوا میں اُڑنا ایک عجوبہ ہے لیکن اس کا دعوے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء کے دعاوی اور ان کے معجزات میں کوئی ربط نہیں ہوتا یہ سوال ایک مغالطہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کا آسان ترین جواب یہ ہے کہ انبیاء کا یہ دعوٰے ہے کہ وہ اس زمین پر خدائے قادر و علیم کے نمائندے ہیں اور اس کی مرضی کی نشان دہی کے لیے آئے ہیں۔ چونکہ خدائے قادر و علیم کے نمائندے ہیں۔ اس لیے دلیل و سند کے طور پر ایسے کام انجام دیتے ہیں جو قدرت الہی اور علم الٰہی کی نمائندگی کی مکمل دلیل بن سکیں۔

کیفیّت معجزہ

معجزہ نبی کا عمل ہے۔ اس کے ظہور کی طاقت اس کی ذات قدسی میں اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اذن الٰہی کے بغیر اس کام کو کبھی انجام نہیں دیتا۔ جیسا کہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے:

"وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ

قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ - ؎

"اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ اذنِ الٰہی کے بغیر معجزہ دکھلائے، پھر جب حکمِ خدا آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کردیا گیا اور باطل پرست اس وقت گھاٹے میں رہے۔"

اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات میں اتنا مکمل ہو کہ قوم کے عذر کو ختم کردے اور دعوئے نبوت پر بھرپور دلیل کی حیثیت رکھتا ہو اور قولِ نبی کے مطابق ظہور پذیر ہو اس کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً مسیلمہ کذاب نے کسی یک چشم کی دوسری آنکھ کو صحیح کرنے کے لیے ہاتھ پھیرا اور اس کے نتیجہ میں صحیح آنکھ بھی جاتی رہی۔ اسی طرح برکت کے لیے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور ان کے بال جھڑ گئے۔ اگرچہ یہ اعمال بھی خرقِ عادت اور محیرالعقول ہیں، لیکن قول کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے یہ اس کے معجزات قرار نہیں دیئے جائیں گے، بلکہ یہ خدا کی طرف منسوب ہوں گے کہ اس نے ایک جھوٹے مدعیِ نبوت کے فریب اور جھوٹ کو طشت از بام کرنے کے لیے مذکورہ اثرات ظاہر فرما دیے۔

معجزہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دعوے کے پہلے سے ہو یا اس کے ساتھ ساتھ ہو تاکہ لوگوں کے لیے اس کا علم حاصل کرنا آسان ہو، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ مدعی کہے کہ آج مجھے نبی مان لو اور میں دس برس کے بعد معجزہ دکھلاؤں گا تو دس برس تک اس کی حجت تمام نہیں ہوگی۔ البتہ جب دکھلادے تو دیکھنے والوں پر تمام ہو جائے گی۔ معجزہ کے ظہور کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ پوری امتِ دعوت کے سامنے ہو، بلکہ اگر ایک گروہ دیکھ لے اور وہ تعداد میں اتنا ہو کہ بہ طریق تواتر اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا سکے تو یہ کافی ہوگا۔ اسی طرح معجزہ کا بار بار دکھلایا جانا ضروری نہیں ہے اور نہ ہر مطالبہ پر دکھایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ عمل اپنی ہیبت اور اپنا تقدس کھو بیٹھے گا اور کھیل تماشا بن کر رہ جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے بہت سے مطالبوں کو رد فرمایا ہے اور قرآن نے بھی بعض مقامات پر شدت کے ساتھ رد کیا ہے اس لیے کہ ہر مطالبے کا جواب دینا لازم نہیں ہے، اور قرآن یہ فرما چکا ہے کہ حق لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہیں کیا کرتا، لیکن اگر کہیں مصلحت کا تقاضا ہوا ہے تو مزید اتمامِ حجت کے لیے بعض مواقع پر قوم کے مطالبات پورے بھی کیے گئے ہیں۔ جن کا تذکرہ کتبِ سیرت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ معجزہ مطالبے کے عین مطابق ہو، بلکہ صرف اتنا کافی ہے کہ لوگ اس کی مثل لانے سے عاجز ہوں۔

مزید برآں یہ کہ اگر اثباتِ حق کے لیے معجزے کا فقط ایک ہی بار دکھلایا جانا کافی ہو تو زندگیِ نبوت میں ایک ہی بار اس کا ظہور کافی ہوگا۔ لہٰذا اگر سارے انبیاءؑ ایک ہی معجزہ مثلاً احیاءِ موتیٰ پیش کرتے رہتے اور ہر نبی زندگی میں ایک ہی بار پیش کرتا تب بھی کافی تھا۔ یہ اللہ کے انعامات میں سے ایک

؎ سورۂ مومن، ۷۸۔

عظیم انعام ہے کہ وہ حجت و برہان کی تقویت اور اضافۂ ہدایت کے لیے مختلف معجزات کا صدور کرواتا رہا ہے۔

عامۃ الناس جو معجزہ اور سحر و شعبدہ وغیرہ میں بخوبی فرق نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے عقلی طور پر یہ لازم ہوگا کہ وہ ماہرین فن اور عقلائے روزگار کی طرف رجوع کریں۔ اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ عہد معجزہ کا ہر انسان اس کی تصدیق کرے جب اس کی حقانیت ثابت ہو، بلکہ مذکورہ افراد کی تصدیق ہی عامۃ الناس کے لیے حجت ہوگی اور اس کی مثالیں تاریخ انبیاء میں موجود ہیں، فرعون کے جادوگروں نے عصائے موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کی تصدیق کی، زمانۂ مسیح علیہ السلام کے طبیبوں نے احیاء موتیٰ کو دیکھ کر اس کے معجزہ ہونے کی تصدیق کی اور عہد ختم نبوت میں فصحائے عرب نے اعجاز قرآن کی تصدیق کی۔

یہ بھی معجزہ کا ایک لطیف پہلو ہے کہ وہ ہر عہد کے ترقی یافتہ کمال کے مقابل عطا کیا گیا، جیسا کہ گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کی ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ کمالات کو اس لیے مدنظر رکھا گیا کہ مذکورہ علوم و فنون کے صاحبان کمال اس کی تصدیق کریں اور اس طرح قوموں پر حجت تمام ہو جائے۔ یہی بات مندرجہ ذیل روایات سے واضح ہوتی ہے۔

قَالَ ابْنُ السِّكِّيتِ لِأَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا لِمَاذَا بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالَى مُوسَى بْنَ عِمْرَانَ بِيَدِهِ الْبَيْضَاءِ وَالْعَصَاءِ وَآلَةِ السِّحْرِ وَبَعَثَ عِيسَى بِالطِّبِّ وَبَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْكَلَامِ وَالْخُطَبِ فَقَالَ أَبُو الْحَسَنِ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى لَمَّا بَعَثَ مُوسَى كَانَ الْأَغْلَبُ عَلَى أَهْلِ عَصْرِهِ السِّحْرُ فَأَتَاهُمْ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَعَالَى بِمَا لَمْ يَكُنْ مِنْ عِنْدِ الْقَوْمِ وَفِي سَعْيِهِمْ مِثْلُهُ وَبِمَا أَبْطَلَ بِهِ سِحْرَهُمْ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى بَعَثَ عِيسَى فِي وَقْتٍ ظَهَرَتْ فِيهِ الزَّمَانَاتُ وَاحْتَاجَ النَّاسُ إِلَى الطِّبِّ فَأَتَاهُمْ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ بِمَا لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُمْ مِثْلُهُ وَبِمَا أَحْيَى لَهُمُ الْمَوْتَى وَأَبْرَأَ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ وَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى بَعَثَ مُحَمَّدًا فِي وَقْتٍ كَانَ الْأَغْلَبُ عَلَى أَهْلِ عَصْرِهِ الْخُطَبُ وَالْكَلَامُ وَأَظُنُّهُ قَالَ وَالشِّعْرُ فَأَتَاهُمْ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَمَوَاعِظِهِ وَأَحْكَامِهِ مَا أَبْطَلَ بِهِ قَوْلَهُمْ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ الخ[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۳۴

"ابن سکیت نے امام رضاؑ سے پوچھا کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ کو ید بیضا اور عصا اور آلۂ سحر شکن کے ساتھ اور حضرت عیسیٰؑ کو طب کے ساتھ اور رسولؐ اکرم کو کلام نصیح اور خطبوں کے ساتھ کیوں مبعوث کیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے جب موسیٰؑ کو مبعوث کیا تو اس دور کے لوگوں میں جادو کا رواج تھا، وہ اللہ کی طرف سے وہ چیز لائے جو قوم کے پاس نہ تھی اور نہ ان کی استطاعت میں تھی۔ انھوں نے ان کے جادو کو باطل کیا اور ان پر حجت تمام کی اور عیسیٰؑ اس دور میں آئے جب لوگ اپنی پریشانیوں کے سبب طب کے محتاج تھے، تو وہ اللہ کی طرف سے وہ چیز لائے، جس کی مثل ان کی قوم کے پاس نہ تھی اور اسکے ذریعے سے اذن الٰہی سے مُردوں کو زندہ کیا اور جذامی و مبروص کو اچھا کیا اور ان پر اپنی حجت تمام کی اور اللہ نے محمدؐ رسول اللہ کو اس وقت مبعوث کیا، جب ان کی قوم میں خطبوں کا اور کلام فصیح کا زور تھا۔ راوی کہتا ہے کہ شاید شعر کا بھی ذکر کیا تھا تو آپ خدا کی کتاب اور اس کے مواعظ و احکام لائے، جس نے ان کے کلام کو باطل کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔"

معجزات رسول اکرمؐ

انسان کی سوچ ہو یا اس کا رہن سہن، فنون لطیفہ ہوں یا تہذیب و اخلاق یہ سب کے سب اس کی آبائی میراث ہیں اور اس کی زندگی ایک ایسا عجائب خانہ ہے جس میں مختلف غیر معاصر اشیاء ایک ہی وقت میں سجی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انسان نے ماضیٔ قدیم کے کسی گمنام دور میں اپنے سفر کے لیے بیل گاڑی ایجاد کی، پھر یہ انسان رتھوں، گھوڑا گاڑیوں، پالکیوں اور بھینسوں سے گزرتا ہوا ریلوں اور کشتوں کے دور میں داخل ہوا اور ریلوں سے سفر کرتا ہوا کاروں تک جا پہنچا، پھر اس نے زمین چھوڑ دی اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ یہ ساری سواریاں غیر معاصر ہیں لیکن آج ہم اپنے ملک کے کسی بھی بڑے شہر میں ان میں سے بہت سی سواریوں کو ایک ہی وقت میں استعمال ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ فقط ایک مثال پر اکتفا کی گئی ورنہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جس میں غیر معاصر اشیاء ایک ہی وقت میں جمع نہ ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ کے عہد میں تاریخ گزشتگان کی جو غیر معاصر اشیاء جمع تھیں ان میں شعبدہ، جادو، کہانت، طب اور دیگر چیزیں شامل تھیں اس لیے یہ ضروری تھا کہ آپ کے معجزات کے لحاظ بھی مختلف ہوں، شعبدہ اور جادو کے مقابل ایسے معجزات ہوں جو ان کا توڑ کر سکیں، کہانت اور طب کے مقابل ایسے معجزات ہوں، جو معاشرہ سے ان کے اثرات کو ختم کر سکیں اور عربوں کے ادب کے مقابل کوئی ایسا معجزہ ہو، جو اُن کی زبان

دانی کے غرور کو خاک میں ملا سکے، یہی سبب ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے صادر ہونے والے معجزات کی تعداد چار ہزار سے دس ہزار تک نقل کی گئی ہے۔ یہ وہ معجزات ہیں جو کسی وقتی تقاضے یا کسی خاص مصلحت کے تحت ظہور پذیر ہوئے اور آج ان کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

رسالتِ محمدؐ کے ڈانڈے قیامت سے ملے ہوئے ہیں اور اب نہ کسی جدید نبوت کا امکان ہے اور نہ کسی تازہ وحی کے نزول کی گنجائش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی ذہن کا سفر جاری ہے وہ ٹھیٹھ محسوسات کے دائرہ اثر سے آزاد ہو کر معقولات کی وادی میں داخل ہو چکا ہے، اس لیے اسے ایسے معجزات کی ضرورت تھی جو علم و دانش اور عقل و آگہی کی ہر سطح کے لیے معجزہ ہوں ——— جو رسالتِ محمدؐ کے دوش بدوش چلتے رہیں اور قیامت تک آنے والے ہر زمانے میں اس کی صداقت کی گواہی دیتے رہیں، یہی وہ منزل ہے جہاں اعجازِ قرآنی کے دو کردار نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ پہلے کردار کے ذریعے سے اس نے عربوں کی فصاحت و بلاغت کے مقابل اپنے اعجاز کا لوہا منوایا اور اب دوسرے کردار کے ذریعے سے وہ قیامت تک عقل و علم کی ہر بلندی کے مقابل اپنے اعجاز کو ثابت کرتا رہے گا۔ یہ رسالت محمدیہ کے طول و عرض میں ساتھ ساتھ چلنے والا پہلا معجزہ ہے۔

اگر کسی نکتہ رس، ذی شعور اور صاحبِ علم و آگہی سے یہ سوال کیا جائے کہ خدا کی طرف سے نبی و رسولؐ بن کر آنے والے انسان کو کیسا ہونا چاہیئے؟ تو اس کے جواب میں وہ جو کچھ بھی کہے گا کہ اسے فلاں فلاں اوصافِ حمیدہ سے متصف ہونا چاہیئے، حسب و نسب کی برائیوں سے پاک ہونا چاہیئے، اوصافِ رذیلہ سے بری ہونا چاہیئے، اس کی گفتار ایسی ہونی چاہیئے اور اس کا کردار ایسا ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ ——— تو وہ اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا جو پیغمبر اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں نمایاں تھے یعنی نبوت کا جو بھی عظیم ترین تصور عقلِ انسانی کے حصار میں آسکتا ہے، محمدؐ کی سنت اس سے بھی زیادہ عظیم ہے ان کی سنت نبوت کا معیار بھی ہے نبوت کی دلیل بھی ہے اور قرآن کے ہم دوش دوسرا بڑا معجزہ ہے جسے قیامت تک قائم رہنا ہے۔

پوری دنیا کا علم الانساب گواہ ہے کہ آباء کی خصوصیات اپنی پوری عظمت اور معنویت کے ساتھ دو تین نسلوں سے آگے نہیں جاتیں بلکہ یہ بھی نادر الوقوع ہے کہ کوئی سے باپ بیٹے یکساں علم و فضل اور یکساں صلاح و تقویٰ کے حامل ہوں، لیکن پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیت کی صورت میں مسلسل بارہ پشتوں تک ایسے لوگ آتے رہے جن میں علم و دانش، فضل و شرف اور عصمت و تقویٰ کی یکسانی تھی جو ہدایت میں بھی یکساں تھے اور حفاظت دین و شریعت میں بھی یکساں تھے یہ آپؐ کا تیسرا بڑا معجزہ ہے جسے حوضِ کوثر تک قرآن کے ساتھ ساتھ جانا ہے۔

اعجازِ قرآن

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن نے مختلف ادوار میں جواب کے لیے چیلنج کیے اور اس کے باوجود عرب اس کا جواب لانے سے عاجز ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کتاب کا جواب لکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تاریخ میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کی کوششوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہاں فقط دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

خلافت بنی عباس کے ابتدائی عہد میں عربی زبان کے چوٹی کے ادیب عبدالکریم ابن ابی العوجاء، ابو شاکر میمون بن دیصان، عبداللہ ابن المقفع اور عبدالملک بصری موسم حج میں خانہ کعبہ کے قریب جمع ہوئے اور مسلمانوں کے مراسم حج اور ان کے شعائر پر گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ اگر قرآن کا جواب لکھ دیا جائے اور اس کے اغلاط سے لوگوں کو مطلع کر دیا جائے تو اسلام خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چاروں نے ایک ایک چوتھائی جواب لکھنے کا عہد کیا۔ جب دوسرے سال اسی مقام پر جمع ہوئے تو ایک نے دوسرے سے جواب کے متعلق استفسار کیا۔ سب سے پہلے ابن ابی العوجاء نے کہا کہ جب میں جواب لکھنے بیٹھا تو اس آیت نے مجھے دہشت زدہ کر دیا اور میں کچھ نہ لکھ سکا۔

" لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ " [1]

" اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے تو اللہ جو مالک عرش ہے وہ لوگوں کے بیان کردہ اوصاف سے پاک ہے "

میمون ابن دیصان نے کہا کہ میں اس آیت پر پہنچ کر مبہوت ہو گیا اور کچھ نہ لکھ سکا۔

" يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ " [2]

" لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے توجہ سے سنو کہ تم خدا کے علاوہ جنھیں پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگر سب کے سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں، اور

---

[1] سورۂ انبیاء، ۲۲

[2] سورۂ حج ۷۳

اگر کبھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب بھی۔

عبداللہ ابن مقفع نے کہا کہ جب میں طوفان نوح کے سلسلے کی اس آیت تک پہنچا تو میری بھی یہی کیفیت ہوئی

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ [۱]

اور کہا گیا کہ اے زمین اپنے پانی کو جذب کر لے اور اے آسمان رُک جا اور پانی اتر گیا اور کام تمام ہو گیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ظالم قوم کے لیے ہلاکت ہے۔

عبدالملک بصری نے کہا کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ میں جب اس آیت تک پہنچا تو مبہوت ہو گیا اور کچھ نہ لکھ سکا۔

فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُم مَّوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ وَمِن قَبْلُ مَا فَرَّطتُمْ فِي يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔ [۲]

"تو جب یہ لوگ یوسف سے ناامید ہو گئے تو مشورہ کے لیے الگ بیٹھ گئے، ان کے بڑے نے کہا کہ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ تمھارے باپ نے تم سے خدا کے نام پر عہد لیا ہے اور تم اس سے قبل یوسف کے حق میں تقصیر کر چکے ہو تو جب تک مجھے میرے باپ کی اجازت نہ ملے یا خدا میرے لیے فیصلہ صادر کرے اس وقت تک میں یہاں سے حرکت نہیں کروں گا اور اللہ ہی بہترین فیصلہ صادر کرنے والا ہے۔"

یہ ایک سنجیدہ کوشش تھی جس کا نتیجہ روز روشن کی طرح واضح ہے اور اب مسیلمۂ کذاب کی ایک غیر سنجیدہ کوشش بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے مزخرفات مختلف لوگوں نے نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے

اَلْبَاذِرَاتِ زَرْعًا وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا وَالذَّارِيَاتِ قَمْحًا وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خُبْزًا وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا وَاللَّاقِمَاتِ لُقْمًا وغیرہ

وغیرہ فقط یہ دو مثالیں ہی اس بات کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ چیلنج کے باوجود اس کتاب کا جواب نہ لکھا جا سکا۔ قرآن مجید کے وہ چیلنج مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ علماء نے ان میں ترتیب قائم کرنے کی کوشش

---

[۱] سورۂ ہود ۴۴۔

[۲] سورۂ یوسف ۸۰۔

کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ پہلے پوری کتاب کے جواب کا چیلنج کیا گیا (بنی اسرائیل) پھر دس سورتوں کا چیلنج کیا گیا (ہود) پھر ایک سورہ کا چیلنج کیا گیا (بقرہ) پھر ایک مکمل بات لانے کا چیلنج کیا گیا (طور) لیکن غالبا ترتیب نزول اس نظریہ کی تائید نہیں کرتی۔ اس لیے کہ اکثر علماء تفسیر کا خیال ہے کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے سورۂ بنی اسرائیل کا نشان پچاس ہے سورۂ ہود کا باون ہے، سورۂ طور کا نشان چھہتر ہے اور سورۂ بقرہ کا ستاسی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان چیلنجوں میں ترتیب نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے موقع و محل اور مصلحت الٰہی کے تحت مستقل بالذات ہے جنھیں ان شاء اللہ مذکورہ آیات کے ذیل میں زیر بحث لایا جائے گا۔

قرآن نے یہ چیلنج از خود نہیں کیا تھا بلکہ اس کا سرچشمہ بھی مشرکوں کا اعتراض ہے جیسا کہ اسے قرآن مجید نے خود ذکر فرمایا ہے۔

" وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ " [1]

" اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اگر چاہیں تو اس جیسی (بات) کہہ سکتے ہیں یہ اگلوں کے قصوں کے علاوہ کیا ہے ؟"

یہی وہ ریب تھا جو ان کے دلوں میں شروع سے تھا اور اسی ریب کو مٹانے کے لیے بقرہ میں پھر چیلنج کیا گیا کہ اس جیسا ایک ہی سورہ لاؤ۔

وجوہ اعجاز

قرآن مجید کا اعجاز کسی ایک جہت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں اعجاز کی جتنی بھی جہات معلوم کی جاسکتی ہیں ان سب جہتوں سے معجزہ ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ قرآن فصاحت و بلاغت یا کسی اور سبب سے معجزہ نہیں ہے بلکہ ادب کے ماہرین (عرب و غیر عرب) اس جیسا کلام پیش کرنے پر قادر ہیں۔ اس کا سبب اعجاز یہ ہے کہ اللہ نے انھیں اس کا جواب لانے سے روکا ہوا ہے اور ان کی یہ قدرت سلب کی ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی اس کے جواب پر آج تک قادر نہ ہوسکا۔ اس نظریہ کا نام "صرفہ" ہے اس دعویٰ کا نتیجہ یہ ہے کہ خود قرآن معجزہ نہیں ہے بلکہ صرفہ معجزہ ہے۔ یہ دلیل بہت ہی کمزور ہے اس لیے کہ اگر واقعا خدا نے بندوں سے قدرت جواب سلب کی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندوں کے لیے اس کا جواب لکھنا محال ہے اور جب یہ عمل محال ہے تو پھر خدا پر اعتراض ہوگا کہ اس نے بندوں کی طاقت سلب کرنے کے بعد انھیں اس کا جواب لکھنے کا چیلنج کیا ہے

---

[1] سورۂ انفال: ۳۱۔

اور یہ امر اس کے ساحتِ قدس سے بعید ہے۔

علمائے تفسیر نے اس موضوع پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں کہ قرآن کس رُخ سے معجزہ ہے؟ ہر ایک نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں حقیقت وہی ہے جو عرض کی گئی کہ ایک کتاب جتنی بھی جہتوں سے معجزہ ہو سکتی ہے ان ساری جہتوں سے یہ قرآن معجزہ ہے۔ جن میں سے چند جہات مندرجہ ذیل ہیں۔

فصاحت و بلاغت

چونکہ اس کتاب کے پہلے مخاطب عرب تھے اس لیے اس کتاب کا پہلا معجزہ اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کا اسلوب بیان ہے۔ اگرچہ قرآن نے صراحت کے ساتھ اپنی فصاحت و بلاغت کو چیلنج کا موضوع نہیں بنایا ہے لیکن اشاراتی طور پر یہ بات موجود ہے۔

حٰمٓ ۚ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ۚ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ[1]

قسم ہے کتاب مبین کی، ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

"وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" [2]

"اور اسی طرح ہم نے تم پر عربی زبان میں قرآن کی وحی کی"

کئی مقامات پر اس کے لیے لسان عربی مبین کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے، کون نہیں جانتا کہ یہ کتاب عزیز عربی زبان میں ہے تو پھر اسے بار بار جتلانے کی ضرورت کیا تھی؟ تو اسکے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربی زبان میں فصاحت و بلاغت اور معانی و بیان کا جو کچھ بھی سرمایہ ہے اسے ٹٹول لو اور پھر دیکھو کہ یہ کتاب ادب کی کس بلندی پر ہے تو تمھاری سمجھ میں آجائے گا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔

تاثیر

کلام کی بہترین خوبی یہ ہے کہ وہ دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور اس کے اثرات سننے والے پر مرتب ہوں قرآن اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے، جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے۔

---

[1] سورۂ زخرف، ۱، ۲، ۳

[2] سورۂ شوریٰ، ۷

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِیًّا ۔[۱]

"جب خدائے رحمٰن کی آیات ان پر پڑھی جاتی تھیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے تھے۔"

"اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ۔[۲]

"اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ایسی کتاب جس کی باتیں ایک دوسرے سے مشابہ اور دہرائی ہوئی ہیں جو لوگ اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں ان کے جسم اس سے کانپنے لگتے ہیں پھر ان کے جسم اور دل نرم ہو کر ذکر الٰہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔"

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان پر قرآن کی تلاوت یا سماعت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی قابل توجہ بات ہے کہ اگر منکرین قرآن پر اثرات مرتب نہ ہوتے تو وہ اسے کبھی سحر اور جادو نہ کہتے اور اس کے کلام بشر ہونے کی نفی نہ کرتے۔ ایام عرب کے واقعات میں یہ واقعہ موجود ہے کہ جب ولید ابن مغیرہ سے سوال کیا گیا کہ یہ کلام کیسا ہے تو اس نے کہا کہ۔

"لَا یُشْبِهُهٗ شَیْءٌ مِنْ كَلَامِنَا اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ كَلَامِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ عَلَیْهِ لَطَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّ اَصْلَهٗ لَعَزِقٌ وَاِنَّ فَرْعَهٗ لَجَنَاةٌ وَاِنَّهٗ لَیُحَطِّمُ مَا تَحْتَهٗ وَاِنَّهٗ لَیَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی عَلَیْهِ"

"یہ (قرآن) ہمارے کلام سے بالکل مشابہ نہیں ہے اور یہ انس و جن کا کلام نہیں ہے اس میں ایک خاص مٹھاس اور حسن ہے۔ اس کا بلند ثمر دار ہے اور اس کا پست کثیر المنفعت ہے، اس کا تنا مضبوط ہے۔ اور شاخ گھنیری ہے۔ اور یہ کلام اپنے سے پست کلام کو توڑ دینے والا ہے یہ کلام بذاتِ خود بلند ہونے والا ہے اور اس پر کوئی کلام بلندی حاصل نہیں کر سکتا۔"

اسی طرح یہ واقعہ بھی ایام عرب کی زینت ہے کہ عتبہ ابن ربیع کو قریش نے رسول اللہ کے پاس بھیجا کہ وہ انھیں

---

[۱] سورۂ مریم۔ ۵۸۔ یہ آیت اگرچہ سیاق و سباق کے اعتبار سے عہد ماضی کے انعام یافتگان کے متعلق ہے لیکن آیات الرحمٰن کے مفہوم عام کے تحت قرآن مجید ان میں داخل ہے۔

[۲] سورۂ زمر: ۲۳۔

دعوتِ اسلام سے روک دے۔ اس نے گفتگو کے دوران بعض آیاتِ قرآنی بھی سنیں۔ جب وہ واپس آیا تو لوگوں کے سوال کے جواب میں کہنے لگا۔

اِنِّیْ سَمِعْتُ قَوْلاً وَاللّٰہِ مَا سَمِعْتُ مِثْلَہٗ قَطُّ وَاللّٰہِ مَا ھُوَ بِالشِّعْرِ وَلَا بِالسِّحْرِ وَلَا بِالْکَھَانَۃِ۔

"میں نے ایسا کلام سُنا ہے کہ خدا کی قسم اس سے قبل ایسا نہیں سُنا تھا بخدا نہ وہ شعر ہے نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے۔"

پھر کہا کہ اے گروہ قریش! میری بات مان لو اور اس مرد کو اور اس کی دعوت کو چھوڑ دو اور اس سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ خدا کی قسم میں نے جو کلام اس سے سُنا ہے اس کی خبر مستقبل میں عظیم ہونے والی ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے واقعات قرآن مجید کی اثر انگیزی کے سلسلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

جامعیت

کسی موضوع کی بہترین کتاب اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو اس موضوع کے سارے مسائل کی جامع ہو لیکن قرآن کسی خاص موضوع کی کتاب نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ بات مسلمات میں شامل ہے کہ موضوع ہمیشہ بڑا ہوتا ہے اور کتاب اس کے مقابل چھوٹی ہوتی ہے۔ کسی بھی موضوع پر نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس موضوع پر ہزاروں اور لاکھوں کتابیں دستیاب ہوں گی۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ موضوع کا حق ایک یا چند کتابوں سے ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اگر کسی خاص موضوع کی کتاب ہوتا تو یہی صورت پیش آتی کہ موضوع بڑا رہتا اور کتاب چھوٹی ہو جاتی۔ جب کہ قرآن کی صفت یہ ہے۔ کہ:

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ۔[1]

"ہم نے کتاب میں کسی شے کو نہیں چھوڑا۔"

"مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔"[2]

"یہ کوئی گڑھی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ (پچھلی) موجود مقدس کتابوں کی تصدیق ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے اس میں ہر شے کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت موجود ہے۔"

---

[1] سورۃ انعام، ۳۸۔

[2] سورۃ یوسف، ۱۱۱۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔[1]

"اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی اس میں ہر شے کا کھلا بیان ہے۔"

یہ اس کتاب کے اعجاز کی ایک جہت ہے کہ جس طرح تخم میں پورا درخت پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں کائنات کے سارے علوم پوشیدہ ہیں اور جس طرح تخم ہمیشہ صالح زمین میں سرسبز و شاداب ہوتا ہے اور برگ و بار پہنچتے ہیں۔ اسی طرح صالح سینوں میں کتاب الٰہی کے برگ و بار سرسبز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران کے آغاز میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ[2] (اس کی تاویل اللہ اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا)۔

اگر یہ ضروری ہو کہ ہر کتاب کے لیے موضوع معین کیا جائے تو پھر قرآن کا موضوع علم الٰہی کا بیان ہوگا۔ وہ بیان اس کتاب میں اس شان کے ساتھ ہے کہ جس موضوع پر بھی گفتگو فرمائی ہے اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جُز کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور مختصر ترین لفظوں میں سارے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔

ہم نے اس مقام پر فقط دعویٰ پیش کیا ہے اس کی دلیل نہیں دی اور اس کا سبب یہ ہے کہ دلیل کو بیان کرنے کے لیے ہزاروں صفحات پر مشتمل جواب لکھنا پڑتا جو ہماری غرض تحریر سے خارج ہے۔ البتہ آگے آنے والی بحثوں سے قاری کو وقتاً فوقتاً اس دعوے کی دلیلیں ملتی رہیں گی۔ اس کی دلیل میں وہ واقعات بھی دیکھے جا سکتے ہیں جن میں آلِ محمدؑ علیہم السلام سے مختلف مسائل کے بارے میں سوال کیا گیا کہ قرآن میں کہاں ہیں اور ان حضرات نے جوابات عطا فرمائے ایسے واقعات معصومینؑ کی کتب سیرت میں بکثرت مذکور ہیں۔ مزید براں یہ کہ اس دعوے کی ایک بہت ہی مختصر دلیل اگلے عنوان کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گی۔

کائناتی انکشافات

قرآن کے اعجاز کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ حقائق و دقائق جو عصور متأخرہ میں دریافت ہو رہے ہیں انھیں قرآن نے بہت پہلے ہی اپنے اشاراتی اسلوب کے ذریعہ بیان کر دیا تھا۔ اس موضوع پر مستقل اور غیر مستقل کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں۔ حنفی احمد کی التفسیر العلمی للآیات الکونیہ، عبدالرزاق نوفل کی القرآن و العلم الحدیث اور مورس بکائی کی بائبل، قرآن اور سائنس قابل مطالعہ ہیں۔ قرآن مجید میں کائنات سے متعلق آیات کی تعداد سات سو پچاس کے لگ بھگ ہے۔ یہاں ہم فقط چند اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا

---

[1] سورۂ نحل ۸۹۔ [2] سورۂ آل عمران ۷۔

يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ۔ [1]

"اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے سینے کو ایسا تنگ بنا دیتا ہے کہ گویا وہ آسمانوں میں پرواز کر رہا ہے۔"

اس آیت میں واضح طریقے سے کہا گیا ہے کہ بلندیوں میں سانس اور سینے میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بلندیوں اور آسمانوں میں آکسیجن کی کمی ہے۔

(۲) "وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ" [2]

"اور گھوڑے اور خچر اور گدھے خلق کیے تاکہ تم سواری کرو اور انھیں اپنی زینت قرار دو اور وہ ایسی چیزیں بھی خلق کرے گا۔ جنہیں تم نہیں جانتے۔"

اس آیت میں ان وسائل نقل و حمل کا تذکرہ ہے جو گمنام ماضی سے عہد نزول قرآن تک رائج تھے مگر آج جبکہ نت نئی سواریاں ایجاد ہو چکی ہیں۔ فقط ان کا تذکرہ ناکافی محسوس ہوتا اگر یہ جملہ نہ ہوتا کہ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ اب یہ جملہ عہد حال اور مستقبل کی ہر سواری پر محیط ہے۔

(۳) "وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ" [3]

"اور ہم ہی نے ہوائیں بھیجیں جو (پانی سے) بھری ہوئی ہیں۔"

نباتات میں نر و مادہ کا ہونا اور نر کے مادۂ تخلیق کا ہوا کے ذریعے مادہ تک منتقل ہونا جدید انکشاف ہے۔

(۴) وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۔ [4]

"اور تم پہاڑوں کو جامد خیال کرتے ہو حالانکہ وہ بادل کی طرح حرکت کر رہے ہیں یہ اللہ کی صنعت ہے، جس نے ہر شے کو استحکام عطا کیا ہے۔"

اس آیۂ مبارکہ میں پہاڑ کی حرکت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین ساکن ہے اور اس پر پہاڑ حرکت کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بات خلاف عقل اور خلاف مشاہدہ ہے۔ یہ درحقیقت حرکتِ ارض کی طرف اشارہ ہے اگر مذکورہ بالا آیت کو اس آیت کے ساتھ رکھ کر پڑھا جائے۔

---

[1] سورۂ انعام، ۱۲۵۔

[2] سورۂ نحل، ۸۔

[3] سورۂ حجر، ۲۲۔

[4] سورۂ نمل، ۸۸۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا لہ (وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا) تو اِس سے اندازہ ہو جائے گا کہ جس طرح بچّہ کے لیے گہوارہ کی جنبش آرام کا سبب بنتی ہے اسی طرح زمین کی جنبش بھی انسانوں کے آرام کا سبب ہے۔

(۵) "اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ۔ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ" ؎۲

" کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے، کیوں نہیں۔ ہم اس کی انگلی کی پور بنانے پر قادر ہیں"۔

انگلیوں کی پور میں جو باریک لکیریں ہیں ان میں عجیب بات یہ ہے کسی ایک انسان کی لکیریں دوسرے انسان سے نہیں ملتیں اس کا انکشاف برطانیہ میں ۱۸۸۴ء میں ہوا اور وہیں پہلی مرتبہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

عدمِ اختلاف

انسان کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے تجربات، نظریات اور افکار تبدیل ہوتے رہتے ہیں حد یہ ہے کہ لفظوں کا وہ ذخیرہ جنہیں وہ استعمال کرتا رہتا ہے، وہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان ایک زمانے میں کسی نظریہ کو اچھا سمجھتا ہے اور اس کی تائید میں دلیلیں فراہم کرتا رہتا ہے، پھر وہی انسان اس نظریہ کو رد کر کے اس کے خلاف دلیلیں قائم کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی شاعروں اور مفکروں کی تخلیقات میں بکثرت تضادات نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ علم ایک مجرد حقیقت ہے اور دُنیا کا کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مجرد حقیقت کی کُنہ تک پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا جب اس پر کسی نظریہ کی خرابی منکشف ہو جاتی ہے تو وہ اسے رد کر دیتا ہے اور جب تک منکشف نہیں ہوتی اسے قبول کیے رہتا ہے۔ انسان کے لب و لہجہ اور نظریے میں تبدیلی کا یہ عمل ایک طویل مدت کا عمل ہے جو تجربات اور اضافۂ علم کے سبب ظہور پذیر ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے بڑے مفکرین و محققین نے جو کتابیں ایک ہی زمانی وحدت میں تحریر کی ہیں، ان میں بھی پوری حزم و احتیاط کے باوجود اختلاف رائے اور تناقض پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید تیئس سال سے کچھ اُوپر کی طویل مدت میں نازل ہوا۔ لیکن نہ اس کا لب لہجہ تبدیل ہوا نہ کسی

لہ سورۂ طٰہٰ - ۵۳-

؎۲ سُورۃ القیامۃ: ۳-۴-

نظریے میں تبدیلی رونما ہوئی اور نہ کوئی اختلافِ رائے ظاہر ہُوا یہ خود اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ کتاب اس ذاتِ اقدس کی تصنیف ہے جو حقیقتِ علم کی بھی خالق ہے اور کُنہ علم کی بھی۔ اسی لیے قرآن نے بیانگِ دُہل یہ اعلان کیا۔

"لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" [1]

"اگر یہ کتاب غیر خدا کی ہوتی تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔"

اخبار بالغیب

قرآن مجید کے وجوہ اعجاز میں ایک بڑی وجہ وہ غیب کی خبریں ہیں جو بے کم و کاست لفظ بہ لفظ پوری ہوئیں دنیا میں مختلف علوم و فنون کے ذریعہ پیشین گوئیاں کرنے کا رواج رہا ہے اور آج بھی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی علم یا فن یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی پیشین گوئیاں سو فیصد پوری اتریں گی۔ اس کے برعکس قرآن نے جس حتمیت اور قطعیت کے ساتھ اخبار بالغیب کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

① مکہ کے بُت پرست سماج میں خون آشام دشمنوں کے درمیان جب رسُولِ اسلام نے اعلان نبوّت فرمایا تو کیا کوئی یہ گمان کر سکتا تھا کہ یتیم عبداللہ اور اس کے مُٹھی بھر ماننے والے پورے عرب پر غالب آجائیں گے؟ غالب آنا تو درکنار رہا کیا یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہ اپنے قسیّ القلب اور بے مروت دشمنوں سے اپنی جانوں کو بچالیں گے؟ لیکن اس وقت اللہ نے اپنے رسُولؐ سے یہ وعدہ فرمایا۔

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ" [2]

"جس کا حکم دیا گیا ہے اس کا کھُل کر اعلان کر دو اور مشرکوں سے روگردانی کرو ہم تمھیں استہزاء کرنے والوں سے بچانے کے لیے کافی ہیں۔"

مکّی زندگی کے ابتدائی زمانے کو فتح مکہ کے دن سے ملا کر دیکھا جائے تو ان آیات کا اعجاز روشن ہو جاتا ہے۔

② روم کے اہل کتاب ایران کے آتش پرستوں سے شکست کھا چکے تھے اور یہ بات مشرکین بطور طنز مسلمانوں کے سامنے دہرایا کرتے تھے۔ اس وقت کون یہ سوچ سکتا تھا کہ پٹے ہُوئے کمزور اور

---

[1] سُورۂ نساء، ۸۲۔

[2] سورۂ حجر، ۹۴/۹۵۔

شکست خوردہ رومی مضبوط، بلند حوصلہ اور فاتح ایرانیوں کو شکست دیدیں گے۔ لیکن قرآن نے اعلان فرمایا۔

"غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ" [1]

"رُومی عربوں کے قریب ترین علاقے میں مغلوب ہوگئے اور وہ مغلوب ہونے کے بعد چند برسوں میں پھر غالب آجائیں گے۔"

اور لفظ بہ لفظ ایسا ہی ہوا جیسا کہ قرآن نے فرمایا تھا۔

(۳) رسُولِ اکرمؐ پر مقطوع النسل ہونے کا الزام لگا تو تسلّی کے لیے سُورۂ کوثر نازل ہوا جس میں رسُولؐ کی کثرتِ نسل کی پیش گوئی کی گئی اور آپ کے دشمن کے مقطوع النسل ہونے کا اعلان کیا گیا کثرتِ نسل رسُولؐ سب پر عیاں ہے اور وہ لوگ جنہوں نے آپ پر الزام لگایا تھا ان کی نسلیں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتیں۔

(۴) ابولہب کے سلسلے میں فیصلہ صادر کر دیا گیا کہ نہ وہ ایمان لائے گا اور نہ اس کی عورت ایمان لائے گی اس سُورہ کے نزُول کے بعد جو خطرہ پیدا ہوا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اگر نزُول کے بعد ابولہب اور اس کی بیوی، دونوں رسُولؐ کے پاس آجاتے اور منافقت کے ساتھ کہتے کہ یا رسُولَ اللّٰہؐ ہم ایمان لے آئے تو سورۂ لہب کی تکذیب ہو جاتی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا اور یہ صرف اس لیے مول لیا کہ یہ کلام اس علام الغیوب کا ہے جو دلوں کے اسرار سے بھی واقف ہے۔ وہ جان رہا تھا کہ یہ دونوں کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

(۵) اسی سے ملتی جلتی صُورتِ حال سُورۂ جمعہ میں ہے جہاں اللہ نے یہودیوں کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا" (یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے) یہاں بھی وہی خطرہ تھا کہ کوئی یہودی تمنائے موت کرتا ہوا رسُولؐ کی خدمت میں آجاتا تو آیت کی تکذیب ہو جاتی اور یہ خطرہ فقط اسی وقت نہیں تھا بلکہ جب تک یہ آیت قرآن میں مُوجود ہے۔ اس وقت تک خطرہ بھی باقی ہے۔ لیکن یہی جُملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور جسے دُنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی۔

وجوہِ اعجازِ قرآنی پر ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ مزید معلومات کے لیے اس موضوع پر لکھی جانے والی تفصیلی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] سورۂ روم۔ ۲۰ - ۳۰۲۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ
لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا
رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ
فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور انھیں خوشخبری سنا دو جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے گھنیرے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جب بھی انھیں ان میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے حالانکہ انھیں ملتا جلتا پھل دیا جائے گا اور ان کے لیے ان (باغوں) میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

اس سے قبل کی آیت میں کفار کی سزا کا تذکرہ تھا اور اب مؤمنین کی جزا کا ذکر فرمایا گیا۔ یہاں استحقاق جنت کی دو شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح۔ میری نگاہ قاصر میں پورے قرآن مجید میں (ماسوائے سورۂ یونس کے) فلاح و کامیابی اور استحقاق جنت کو ان دونوں شرطوں کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ایمان کا تعلق قلب سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جن باتوں کو منوانا چاہتا ہے انسان اسے مانے اور اعمالِ صالحہ کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے یعنی اللہ جو کروانا چاہتا ہے انسان اسے کرے اگر انسان اِن

دونوں معیاروں پر پورا اُترتا ہے تو مستحق جنّت ہے۔

جنّات جنّت کی جمع ہے اور اس کے معنی باغ کے ہیں۔لیکن اصطلاح قرآنی میں اس سے مُراد وہ مقام ہے جو آخرت میں ان لوگوں کو عطا کیا جائے گا جو ایمان و عمل صالح کے خدائی معیار پر پُورے اُتریں گے۔جمع کا صیغہ استعمال کرنے کی دو وجہیں ہیں۔پہلی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ایک ایک مستحق جزار کو بہت سے باغات عطا ہوں گے اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ ایمان اورعمل صالح کے درجات مختلف ہیں اس لیے انھیں کی مناسبت سے جنتیں عطا ہوں گی اور ان جنتوں میں ملنے والے پھل اپنی شکل وصُورت اور ذائقہ میں دُنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور اہلِ جنّت کی بیویاں ایسی عورتیں ہوں گی جو ظاہر و باطن اور جسم و رُوح کے سارے عیوب سے پاک ہونگی

اس آیۂ مبارکہ میں خلود اور ہمیشگی کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ زوال نعمت کا تصور خود ایک ذہنی کوفت ہے۔جو جنت کے تصور کے منافی ہے۔اس لیے تسلی دی گئی کہ وہاں چھن جانے والی نعمتیں نہیں عطا ہوں گی بلکہ پائیدار ہوں گی۔

جہاں جہاں بھی قرآن مجید نے جنت کی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اگر ان سب کو جمع کرلیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی مادی زندگی ہوگی جو دائمی اور ناآشنائے زوال ہوگی لیکن یہ صورتِ حال تقربِ مفہوم کے لیے ہے ورنہ جنّت کی نعمتوں اور لذتوں کی حقیقت و ماہیت کو اس دُنیا میں سمجھ لینا ایک امرِ محال ہے۔ اسی بات کو فرمایا گیا ہے۔

"فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ [1]"

"کوئی شخص اس کو نہیں جان سکتا کہ ان (انسانوں) کے لیے کیا کیا نعمتیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں جو انھیں اعمال کی جزا میں ملیں گی۔"

[1] سورۂ سجدہ ۱۵/۱۷۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً
فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ
أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا
فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ
بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ
بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

اللہ کو شرم نہیں آتی کہ وہ مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی شے کی مثال بیان کرے، سو ایمان لانے والے جانتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا، اس مثل کے بیان کرنے سے کیا منشا ہے وہ بہتوں کو اس کے ذریعہ گمراہ قرار دیتا ہے اور بہتوں کی اس کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے اور وہ ان کے ذریعہ نافرمانوں کے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں قرار دیتا۔

کفار کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ (قرآن) خدا کا کلام ہوتا تو اس کتاب میں فقط ان چیزوں کا ذکر ہوتا جو اپنی عظمت و جسامت کے اعتبار سے عالی شان اور پرشکوہ ہیں۔ اس میں مکڑی، مکھی اور چیونٹی جیسی حقیر مخلوقات کا تذکرہ نہ ہوتا۔ اس کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ کو مچھر یا حقارت میں اس سے بھی بڑھ کر کسی شے کی مثال دینے میں کوئی شرم نہیں آتی۔ اس لیے کہ حقیر سے حقیر مخلوق بھی اس خالق کی قوت تخلیق کا شاہکار ہے جس نے عظیم مخلوقات کو خلق کیا ہے اسے سمجھنے کے لیے ہاتھی کی جسامت کے مقابلے پر مچھر کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ جو اعضاء و جوارح ہاتھی کو عطا ہوئے ہیں، بعینہٖ وہی اعضاء و جوارح مچھر کے پاس بھی ہیں اور اس چھوٹی سی مخلوق میں دو پروں کا اضافہ بھی فرمایا ہے جو اس بڑے جانور کے پاس نہیں ہیں۔[1]

غضب اور محبت کی طرح شرم و حیا بھی انسانی جذبے کی ایک قسم ہے۔ چونکہ خداوند عالم محل حوادث نہیں ہے لہذا یہ الفاظ جب خدا کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا وہ مفہوم نہیں ہوتا جو انسانوں کے لیے معین ہے بلکہ ان جذبوں سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ نتائج اللہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ حیا ایک ایسی کیفیت ہے جو کسی برے فعل کے سبب انسان میں رونما ہوتی ہے اور نتیجۃً یہی حیا اس برے فعل کو ترک کرنے کا سبب بن جاتی ہے تو اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ کو مچھر وغیرہ کی مثال بیان کرنے سے شرم نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ترک نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی غرض ہدایت ہے اب یہ غرض جس چیز سے بھی پوری ہو وہی اس موقع کے لیے برمحل اور مناسب ترین ہے۔

آیت کے آخری جزء سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ ہی گمراہ کرتا ہے اس لیے کہ رسولوں کی بعثت، کتابوں کا نزول اور ہدایت کے دیگر سارے طریقے مومن و کافر دونوں کے لیے مساوی ہیں اور اب یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ ہدایت کو قبول کرے یا اس کا انکار کردے، جیسا کہ قرآن کی صریحی آیات سے ثابت ہے خصوصاً یہ آیۂ مبارکہ اس موضوع پر نص صریح ہے۔

"اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔"[2]

اسی لیے ہم نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ وہ "گمراہ کرتا ہے" بلکہ یہ ترجمہ کیا ہے کہ وہ گمراہ قرار دیتا ہے اور یہ مفہوم خود آیت میں پوشیدہ ہے اس لیے کہ آیت کے اختتام پر یہ فرمایا گیا کہ اللہ یہ عمل نافرمان لوگوں کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ نافرمان لوگ کہ کر یہ بتلا دیا کہ وہ پہلے ہی سے گمراہ ہیں لہذا فطری ردعمل کے طور پر اللہ کی توفیق ان سے سلب ہو جاتی اور وہ انھیں گمراہ قرار دیتا ہے اب اس کے بعد ان نافرمان لوگوں کے اوصاف بیان فرمائے۔

---

[1] اقتباس از قول امام جعفر صادق علیہ السلام بحوالہ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۵

[2] سورۂ دہر ۳۔

الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِؕ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو عہد الٰہی کے مستحکم ہونے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جسے وصل کرنے کا حکم دیا ہے، اسے کاٹ دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں مذکورہ افراد کی تین خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور انھیں صاحبانِ خسارہ قرار دیا گیا ہے ان کی تین صفات مندرجہ ذیل ہیں۔

عہد الٰہی کو استحکام کے بعد توڑنا

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اللہ کے عہد اور میثاق پر گفتگو فرمائی ہے اور مفسرین نے اس سے مختلف عہد مراد لیے ہیں۔ سرسری جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ ذیل آیتوں پر توجہ کی جاسکتی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْؕ قَالُوْا بَلٰىۚۛ شَهِدْنَاۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ

هٰذَا غَافِلِيْنَ ۝ [1]

"اور یاد کرو جب تمھارے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے ان کی نسلوں کو نکالا اور ان پر انھیں کو گواہ بنایا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں۔ سب نے کہا کیوں نہیں ہم اس پر گواہ ہیں یہ اس لیے کیا کہ تم قیامت میں نہ کہو کہ ہم اس بات سے غافل تھے۔"

"اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝" [2]

"اے بنی آدم کیا میں نے تم پر یہ عہد نہیں باندھا تھا کہ شیطان کی عبادت نہیں کرو گے وہ یقیناً تمھارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرو گے یہی سیدھا راستہ ہے۔"

" وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ" [3]

"اور یاد کرو جب خدا نے اہلِ کتاب سے عہد لیا کہ تم اس (کتاب) کو لوگوں کے لیے واضح طریقے سے بیان کرو گے اور اسے پوشیدہ نہیں کرو گے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) عہدِ الٰہی سے مراد فطرت و عقل کی وہ قائم شدہ دلیلیں ہیں جو توحید و نبوت وغیرہ کے سلسلے میں ثابت ہو چکی ہیں اور نقضِ عہد سے مراد انھیں تسلیم نہ کرنا ہے۔

(۲) عہدِ الٰہی سے مراد فقط اللہ کی عبادت کرنا ہے اور عبادتِ شیطان سے بچنا ہے اور نقضِ عہد سے مُراد عبادتِ شیطان کرنا اور عبادتِ خدا کو ترک کرنا ہے۔

(۳) عہدِ الٰہی سے مراد پیغمبرِ اسلام کی لائی ہوئی ساری باتوں کو تسلیم کرنا ہے اور نقض سے مراد ان ساری باتوں سے انکار ہے۔

ان مفاہیم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ساری باتیں جن کا تعلق ایمان اور عمل صالح سے ہے وہ عہدِ الٰہی ہیں جن کی تفصیل عقاید و اعمال کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس عہد کے ذیل میں توحید، نبوتِ رسولِ اکرمؐ، امامتِ علی ابن ابی طالبؑ اور پیروانِ صالح کی محبت کو ذکر فرمایا ہے۔[4]

---

[1] سورۂ اعراف، ۱۷۲۔

[2] سورۂ یٰسٓ ۶۰/۶۱۔

[3] آلِ عمران، ۱۸۷۔

[4] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۱، (دوسری حدیث)

قطع تعلق

اللہ نے جن باتوں کو مربُوط قرار دیا ہے انھیں توڑ دیا جائے اور جن رشتوں کو متصل قرار دیا ہے۔ انھیں کاٹ دیا جائے یہ ہے وہ قطع تعلق جس کا تذکرہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے، اس میں وہ سارے تعلقات شامل ہیں جن کا تعلق فرد، خاندان، معاشرہ اور بین الاقوامی معاشروں سے ہے، اس میں صلۂ رحم، حقُوق والدین، اطاعتِ رسُول اور اطاعتِ صاحبِ امر وغیرہ سب شامل ہیں۔

فساد فی الارض

اس سے مراد اسلامی عقاید و اعمال کا استہزاء، مسلمانوں کا تمسخر اور ایسے نظام کو پسند کرنا اور اس کے نفاذ کی کوشش کرنا ہے جو منکرات کی ترویج کرتا ہو اور قوانین الٰہیہ کی خلاف ورزی کرتا ہو۔
نافرمان لوگوں کے یہ اوصاف کسی خاص عہد سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ہر عہد کے مزاجِ نافرمانی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

*

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم مُردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندہ کیا، پھر وہ تمھیں موت دے گا پھر تمھیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

کیف (کیسے) اگرچہ کیفیت اور حالت کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں مقام تعجب یا ملامت میں استعمال ہوا ہے کہ خدا کے وجود پر واضح ترین دلیلوں کے موجود ہونے کے باوجود تم کیسے اس کا انکار کرتے ہو؟ یہ تعجب یا ملامت خود اس بات کی دلیل ہے کہ کفر انسان کا اختیاری عمل ہے۔ اگر یہ کفر ہدایت کی طرح خدا کی طرف سے انسان کو ودیعت ہوتا تو تعجب یا ملامت دونوں بے محل ہوتے بلکہ یہ تعجب خود قابلِ تعجب ہو جاتا کہ اللہ کفر دینے کے بعد تعجب کیوں کر رہا ہے اور یہ ملامت خود قابل ملامت قرار پاتی۔ مزید برآں یہ کہ اس آیت میں کفر کرنے کی نسبت کافروں کی طرف دی گئی ہے، اگر کفر خدا کی طرف سے ہوتا تو اللہ اسے کافروں کی طرف منسوب نہ فرماتا۔

اس آیت میں انسان کے پانچ ادوار ہیں۔ "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا" (تم مردہ تھے) "فَاَحْيَاكُمْ" (تو اس نے تمھیں زندہ کیا) "ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ" (پھر وہ تمھیں موت دے گا) "ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ" (پھر تمھیں زندہ کرے گا) "ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ" (پھر تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے)۔ پہلے دور سے مراد دنیا میں آنے سے قبل کا وہ عہد ہے، جب انسان اصلاب آبا یا ارحام امہات میں تھا۔ دوسرے

دوسرے سے مراد اس دُنیا کی زندگی ہے۔ تیسرے دور سے مراد موت کا وقت ہے، چوتھے دور سے متعلق تین اقوال ملتے ہیں۔

قبر کی وہ مختصر زندگی، جس میں سوال و جواب ہوگا۔

زمانۂ رجعت

قیامت کی زندگی۔

تیسرا قول اس صورت میں قابلِ قبول ہوگا جب " ثُمَّ يُحْيِيكُمْ "" ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ " کے مفہوم کو ایک تسلیم کیا جائے۔ آخری اور پانچواں دور قیامت ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں یہ بتلایا گیا کہ اگر کا فر خود اپنی ذات میں غور کرے تو اس پر ایک خالق کا وجود آشکار ہو جائے گا اور وہ اس طرح کہ ـــــ شکل، وصف، جہت اور زمان و مکان وغیرہ کے گنبدِ بے در کا یہ اسیر اپنے وجود اور اپنی بقا میں ایک ایسے خالق کا مرہونِ منت ہے جو مذکورہ اشیاء سے ماوراء ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میزانِ وجود و عدم کے برابر کے دو پلّوں میں سے وجود کے پلڑے کا جھک جانا کس عقلی بنیاد پر ہے؟ اور جسمِ انسانی میں دقیق ترین مادّی، نفسیاتی اور روحانی نظاموں کا پایا جانا مادّے کے کس وصف کا اظہار ہے؟ اس آیت میں نعمتِ وجود پر گفتگو فرمائی گئی اور وجود پر اس تصرفِ کامل کا اظہار کیا گیا، جو فقط ذاتِ الوہیت ہی میں پایا جاتا ہے، اس بیان کے بعد نعمتِ بقا کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ زمین پر نسلِ انسانی کا باقی رہنا بھی اسی ذاتِ مقدس کے منصوبے کا ایک حصہ ہے اسی لئے زمین و آسمان کو انسانی سکونت کا ممد و معاون قرار دیا گیا ہے۔

✿

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ
ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

وہ وہی ہے، جس نے تمھارے لیے زمین میں جو کچھ ہے وہ سب پیدا کیا پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انھیں سات آسمانوں کی صورت میں بہترین بنایا اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے ۔

اس آیۂ مبارکہ میں یہ کلیہ بیان کیا گیا کہ زمین کی ہر شے انسانوں کے فائدے کے لیے ہے یعنی اس زمین کی کوئی شے عبث، فضول یا نقصان دہ نہیں ہے، مجموعی طور پر سب کچھ نوع انسان کے لیے منفعت بخش ہے۔ لہذا اگر بظاہر کوئی شے کسی انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے تو وہ یقیناً کسی دوسرے انسان کے لیے مفید بھی ہے۔ ورنہ غرض تخلیق میں نقص پیدا ہو جائے گا بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ انسان کا علم ناقص ہے، جس کے سبب وہ کسی بھی شے کے سارے اغراض و مصالح پر مطلع نہیں ہے۔ لیکن وہ جو ہر شے کا بہترین جاننے والا ہے اسے معلوم ہے کہ ہر شے انسانی منفعت کے لیے ہے۔

اس آیت سے فقہاء نے یہ قاعدہ کلیہ استخراج کیا ہے کہ زمین کی ساری اشیاء سارے انسانوں کے لیے حلال اور مباح ہیں لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ پھر کوئی شے حرام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مجموعی طور پر ساری اشیاء مجموعی طور پر سارے انسانوں کے لیے حلال ہیں لیکن اس آیت

میں یہ مذکور نہیں ہے کہ کونسی شے کس انسان کے لیے اور کن شرائط کے ساتھ حلال ہے۔ لہٰذا اسے معلوم کرنے کے لیے کسی دلیل خارجی کی ضرورت ہوگی اس بحث کی تفصیلات کو فقہ و اصولِ فقہ کی مبسوط کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ارض و سماوات

لفظ ارض قرآن مجید میں ۴۶۱ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور یہ ہمیشہ مفرد ہی آیا ہے اس کی جمع ارضون یا اراضی کہیں استعمال نہیں ہوئی اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں انسان موجود ہے وہ ارض ہے اور اس کے علاوہ باقی سب سماوات ہے البتہ تعددِ ارض پر اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

"اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ" [1]

"اللہ وہی ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور زمین کو بھی انہیں کی مثل (پیدا کیا ہے)"

اگر اس مثلیت سے تعداد مراد ہے تو پھر زمین کی تعداد بھی سات ہی ہوگی اور اس سے وہ کرّات آسمانی مراد ہوں گے جو اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے حیات و بقاء کے لیے ساز گار ہوں اور اگر یہ مثلیت کسی اور شے میں ہے تو پھر زمین کی تعداد کے سلسلے میں سُنّت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آلِ محمدؐ علیہم السّلام کے خطبات و اقوال و ادعیہ میں ارض کی جمع (ارضون، ارضین) استعمال ہوئی ہے لیکن جس طرح پانی بوند، گھونٹ، دریا اور سمندر سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ ارض زمین کے ہر حصے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جمع کی صورت میں اس کے مختلف قطعے مراد ہوں گے لیکن بعض مقامات پر سات آسمانوں کے ساتھ سات زمینوں کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ اس جملے میں ہے۔

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْاَرَضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا فِيْهِنَّ وَمَا بَيْنَهُنَّ ؕ" [2]

"کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو سات آسمانوں کا رب ہے اور سات زمینوں کا رب ہے اور جو ان میں ہے اور ان کے درمیان ہے اُن سب کا رب ہے۔"

---

[1] سورۂ طلاق، ۱۲۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۰۷۔

سات زمینوں کا تذکرہ سات آسمانوں کی ردیف میں کیا گیا ہے، جس سے تعدد ارض پر دلیل قائم کی جاسکتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ شہرستانی کی معرکۃ الآراء کتاب الہیئۃ والاسلام کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

لفظ 'سماوات' قرآن مجید میں ۱۹۰ (ایک سو نوے) مرتبہ استعمال ہوا ہے، اس کا واحد 'سماء' ہے یہ ایک سو بیس دفعہ استعمال ہوا ہے[1] سماء کے معنی ہیں بلندی اور سماوات کے معنی ہیں بلندیاں۔ زمین کے اُوپر جن بلندیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سات ہیں۔ جیسا کہ زیرِ نظر آیت میں "سبع سمٰوٰت" کا لفظ موجود ہے۔ "سبع سمٰوٰت" کی یہ ترکیب قرآن مجید میں آٹھ مقامات پر استعمال ہوئی ہے[2] گمان غالب یہ ہے کہ اس سے زمین کے اُوپر کی فضاؤں اور ہواؤں کے مختلف طبقات مراد ہیں اور یہ طبقات سات ہیں۔ اگرچہ جدید تحقیقات کی روشنی میں فضا کے پانچ طبقات منکشف ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ آئندہ دو اور منکشف ہو جائیں۔ بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ لفظ "سبع" سے واقعاً سات کی تعداد مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس لفظ سے آسمانوں کی کثرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ بات اگرچہ مفہوم عدد کی روشنی میں قابلِ توجہ ہے۔ لیکن آسمانوں سے متعلق ساری آیات کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے کثرت نہیں بلکہ واقعی تعداد مراد ہے۔

خلقت سماوات و ارض

زیرِ نظر آیت میں خلقت ارض کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ما فی الارض کی خلقت کا ذکر ہے یعنی یہ اس عہد کی بات ہے۔ جب زمین خلق ہو چکی تھی اور اسے مخلوقات کے انتفاع کے قابل بنایا جا رہا تھا پھر "ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ" فرما کر یہ بتلایا کہ آسمان بھی پہلے بن چکا تھا۔ لیکن ابھی اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی، جب زمین قابلِ انتفاع ہو گئی تو پھر آسمان کو سات مختلف طبقوں میں تقسیم کیا گیا۔

تخلیق کے ابتدائی مرحلے میں آسمان و زمین ایک تھے، جیسا کہ ارشاد ہوا۔

"أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا"[3]

---

[1] المعجم المفہرس۔

[2] المعجم المفہرس، جس میں سے ایک مقام پر "سبع طرائق" (سات راستے) ہے۔

[3] سورۂ انبیاء: ۳۰۔

"کیا کافروں نے نظر نہیں کی کہ آسمان وزمین باہم پیوستہ تھے تو ہم نے انھیں پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔"

قرآن مجید نے اس آیت میں دو لفظ استعمال فرمائے۔ "رتق اور فتق"۔ رتق کے معنی بند اور پیوستہ کے ہیں۔ جب کہ فتق کے معنی کھولنے اور علیحدہ کرنے کے ہیں۔ اس بیان کے مطابق زمین و آسمان کی مادی وحدت ٹوٹی اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو کر عالمین کی تشکیل میں مشغول ہوئے۔ اب یہ تشکیل کس طرح ہوئی؟ اس کی تشریح کے لیے ان آیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

"قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ"

"کہ دو کہ کیا تم اس کا انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو دنوں میں خلق کیا اور تم اس کے ہم سر بناتے ہو؟ وہی عالمین کا پروردگار ہے۔"

"وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔"

"اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت دی اور اسی میں اس کی غذاؤں کی چار دنوں میں تقدیر کی جو سب مانگنے والوں کے لیے مساوی ہیں۔"

"ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ۔"

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی یا کراہت سے آؤ دونوں نے کہا کہ خوشی سے حاضر ہیں۔"

"فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ"[1]

"پھر اس نے دو دنوں میں ان کو سات آسمان بنا دیا اور ہر آسمان کے کام کو اس پر وحی کیا، اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے سجایا اور اس کے علاوہ حفاظت کے لیے۔ یہ اس کی تقدیر ہے جو صاحب عزت و علم ہے۔"

حٰم سجدہ کی نویں آیت میں فرمایا گیا کہ زمین کی خلقت دو دنوں[2] میں ہوئی، دسویں آیت میں فرمایا

---

[1] حٰم سجدہ ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲

[2] دنوں سے مراد مخصوص زمانی وحدتیں ہیں۔

گیا کہ زمین کو چار دنوں میں قابلِ انتفاع بنایا گیا اور بارہویں آیت میں ارشاد ہوا کہ سات آسمانوں کی تشکیل دو دنوں میں ہوئی۔ یہ سارے دن اگر جوڑے جائیں تو آٹھ بنتے ہیں۔ جب کہ دوسرے مقامات پر بالصراحت اس کے خلاف موجود ہے۔

"اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ" [1]

" تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں خلق فرمایا۔"

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سات آسمانوں کی تشکیل کے دو دن ان چھ دنوں میں داخل ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تشکیل چھ دنوں میں سے کن دنوں میں ہوئی؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم پھر زیرِ بحث آیت کی طرف واپس چلتے ہیں، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے زمین کو رزق اور روزی کے قابل بنایا پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے سورۂ حٰمٓ سجدہ کی گیارھویں آیت کے ساتھ رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک آسمان دھویں کی صورت میں تھا اور زمین کی تشکیل کے فوراً بعد زمین و آسمان دونوں کو ایک ساتھ حکم دے کر ایک طرف زمین کو رزق و انتفاع کے منصوبوں پر عمل کرنے کا حکم دیا اور دوسری طرف آسمانوں کو سات کی تعداد پر قائم کیا۔ یہ دونوں کام ایک ساتھ اور ایک ہی زمانی وحدت کے عرصے میں ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے مقام [2] پر آسمان و زمین کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے چند نکات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا۔

"آیا تم خلقت کے اعتبار سے سخت تر ہو یا آسمان کہ اسے خدا نے بنایا۔"

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔

" اس کی چھت بلند رکھی اور اسے ہموار کیا۔"

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۔

" اور اس کی رات کو تاریک کیا اور اس کی دھوپ کو نکالا۔"

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔

" اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا۔"

"دحو" کے معنی پھیلانا، بچھانا، نیچے کی طرف پھینکنا اور لڑھکا دینا ہیں۔ ان آیات میں زمین کا دحو آسمان کی خلقت کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ اس سے تین مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔

---

[1] سورۂ اعراف ۵۴، سورۂ یونس ۳۔ اس کے علاوہ ہود، فرقان، سجدہ، ق اور حدید میں بھی یہ تذکرہ موجود ہے۔

[2] سورۂ النّٰزعٰت: ۲۷ تا ۳۰۔

(۱) آسمان دھوئیں کی صورت میں تھا، جب زمین کو بچھایا گیا۔
(۲) آسمان دھوئیں کی صورت میں تھا، جب زمین کو لڑھکایا گیا۔ اس مفہوم کے اعتبار سے زمین کی دو حرکتیں ثابت ہوتی ہیں۔
(۳) اس آسمان سے مراد زمین کا آسمان نہیں ہے، بلکہ نظام شمسی کا آسمان ہے۔ جو زمین کے دحو سے قبل بن چکا تھا۔

تیسرا مفہوم حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

"لَكُمْ" کی اہمیت

"هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيْعًا" میں جو "لكم" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے "تمہارے لیے" یہ خطاب انسانوں سے ہے، جس میں یہ بتلایا گیا کہ زمین میں جو کچھ ہے وہ انسانوں کے لیے ہے۔ اس مفہوم کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے۔ ہم ان میں سے چند کو فقط ایک سورے سے نقل کرتے ہیں۔

" وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ " الخ
" اس نے چوپایوں کو تمہارے لیے خلق کیا "
" وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ " الخ
ان کی وجہ سے تمہارے لیے حسن وجمال ہے۔
" هُوَ الَّذِىْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ "
" وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا "
" يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ " الخ
" وہ اس پانی سے تمہارے لیے کھیتیاں وغیرہ اگاتا ہے۔
" وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ " الخ
" اس نے تمہارے لیے رات اور دن وغیرہ کو مسخر کیا "
" وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِى الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ "[1]
اور اس نے جو کچھ تمہارے لیئے زمین میں پیدا کیا ہے۔ وہ رنگوں میں مختلف ہے۔

---

[1] سورۂ نحل۔ ۵، ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳

ایک ہی سورے کی ان چند آیتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمین کا مرکزی کردار انسان ہے۔ یہ روز و شب کا تسلسل، یہ نیلگوں آسمان، یہ آسمان میں ستاروں کی مینا کاری، صبح و شام چراگاہوں میں مویشیوں کی چہل پہل، برستا ہوا پانی، سفر کرتے ہوئے بادل، اُگتے ہوئے پھل پھول، مختلف رنگوں کے بیل بوٹے ــــ غرض دنیا کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں اس انسان کے لیے ہیں۔ جو اس زمین کا خلیفہ ہے۔ اس بات کو اگلی آیات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى
الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ
يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ
نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ
اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٣٠﴾
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ
عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿٣١﴾
قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ
اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿٣٢﴾
قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ
بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ
غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا
تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿٣٣﴾

اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، تو وہ بولے کہ کیا تو زمین میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے اور خوں ریزیاں کرے، حالانکہ ہم حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں، فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔

اور اس نے آدم کو سارے نام سکھلا دیئے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ان (لوگوں) کے نام بتلاؤ۔

وہ بولے تو بے عیب ہے، جو تو نے بتلا دیا ہے اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی علم نہیں ہے، بے شک تو ہی صاحب علم و حکمت ہے۔

فرمایا کہ اے آدم تم فرشتوں کو ان کے نام بتلا دو، پھر جب آدم نے فرشتوں کو ان کے نام بتلا دیئے، تو فرمایا

کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور وہ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔

آیت کا آغاز "اِذْ" سے ہے، جس کی دلالت صیغہ ماضی پر ہے اور اس سے قبل ایک فعل محذوف ہے جو اُذْکُرْ ہے یعنی یاد کرو۔ اس امر کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں، پہلا مفہوم یہ ہے کہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ اُذْکُرْ یَا مُحَمَّدُ (اے رسُول تم اس وقت کو یاد کرو) اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اُذْکُرْ لَھُمْ (تم دوسروں سے اس کا ذکر کرو)۔ چونکہ دونوں مفہوموں کی بازگشت ایک ہی ہے لہذا یہ بحث چنداں مفید نہیں ہے۔

ان آیات میں مندرجہ ذیل مسائل پر گفتگو کی گئی ہے:

۱۔ خلقت آدم (دبنی آدم) کا مقصد،

۲۔ فرشتوں کا رویّہ۔

۳۔ اللہ کا انہیں مطمئن کرنا۔

اس سے قبل کی آیت میں انسان کو یہ تلایا گیا تھا کہ آسمان وزمین اور اس کے درمیان کی اشیا تمہارے فائدے کے لیے خلق ہوئی ہیں۔ یہ حقیقت بہت واضح ہے کہ ان مذکورہ اشیاء سے مکمل اور بھرپور فائدہ نہ فرشتے اٹھا سکتے تھے، نہ جنات اور نہ جانور اس لیے ایک ایسی مخلوق کی ضرورت تھی جو اس کائنات کی توانائیوں سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکے لہذا آدم کو خلق کیا گیا اور انہیں اس کرۂ ارض کی خلافت عطا کی گئی اور چونکہ فرشتے اللہ کی طرف سے تدبیر امر کے فریضوں پر مامور ہیں، اس لیے انھیں آدم کی اطاعت (سجدہ) پر مامور کیا گیا، جیسا کہ اگلی آیات میں بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ وضاحت موجود نہیں ہے کہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کا اعلان تخلیق آدم سے قبل کا ہے، یا تخلیق کے بعد فرمایا گیا ہے۔ سورہ حجر کی ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اعلان تخلیق سے قبل ہوا تھا۔

"وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" ۲۸

فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ﴿۲۹﴾

"جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے کھنکھناتے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔"

"جب میں اسے نوک پلک سے سنوار لوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو تم اسے سجدہ کرنا۔"

اس مرحلہ پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ جب آدم کو بنا لیتا جب فرشتوں سے کہتا کہ یہ خلیفہ ہے۔ اسے سجدہ کرو، یہ قبلِ تخلیق اعلان کا مقصد کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس اعلان کا مقصد فرشتوں سے مشورہ لینا نہیں تھا، بلکہ ان میں خلیفۃ اللہ کے لیے ایک سنجیدہ حالتِ انتظار پیدا کرنی تھی اور ان کے ایمان بالغیب کو مزید استحکام عطا کرنا تھا۔ گزشتہ اقوام میں یہ حالتِ انتظار پیغمبرِ اکرمؐ کے لیے پیدا کروائی گئی۔ جیسا کہ ادیانِ عالم کی مقدس کتابوں میں درج شدہ پیشین گوئیوں سے پتہ چلتا ہے اور ملتِ اسلامیہ میں یہی حالتِ انتظار مہدی آخر الزمانؑ کے لیے پیدا کروائی گئی ہے۔

فرشتوں کی نورانی طینت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اللہ پر اعتراض کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ان کے جو اوصاف قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، اُن سے اُنکی عصمت بخوبی ثابت ہوتی ہے، لہٰذا ان کی معصوم فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ تشریحِ مطلب کے لیے سوال کریں اور اس عمل کی حکمت و مصلحت کو معلوم کر کے اپنے علم میں اضافہ کریں کہ اللہ ایسی مخلوق کیوں پیدا کر رہا ہے، جس سے زمین میں فتنہ و فساد کے پھیلنے کا امکان ہے، جب کہ وہ ان جیسی تسبیح و تقدیس کرنے والی مخلوق پیدا کر چکا ہے۔ البتہ یہاں یہ بات یقیناً غور طلب ہے کہ فرشتوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ مخلوق خوں ریزی اور فساد فی الارض کی مرتکب ہوگی! اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) جسمِ آدم کے متضاد عناصر کو دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ یہ مخلوق زمین پر امن و سکون سے زندگی نہیں گزارے گی۔

(۲) خود اس اعلان میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ ایسی مخلوق اس زمین پر آباد کی جا رہی ہے جو فساد کرے گی، اس لیے کہ اگر زمین کے باشندے امن و اطمینان، بقائے باہمی اور اطاعتِ الٰہی کے مطابق زندگی گزار رہے ہوں تو انھیں نہ کسی خلیفہ کی ضرورت ہوگی نہ حکمران کی۔ خلیفہ معین کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فساد کرنے والی مخلوق ہوگی۔

(۳) فرشتوں نے قبلِ آدم کی اقوام (جنات و نسناس وغیرہ) کی خرابیوں اور فسادات کو دیکھ کر

یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ قول روایات آلِ محمدؐ سے بھی ثابت ہے۔ ؎۱

آیۂ مبارکہ میں غور کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ فرشتوں کا سوال خود آدم کے سلسلے میں نہیں تھا اس لیے کہ مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ کو اللہ نے رد نہیں فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خلقت سے فقط ایک شخص کو خلق کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ نوع البشر کا خلق کرنا مقصود تھا، جس میں سے خلیفہ بھی ہوں گے اور یہ نوع مجموعی طور پر، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، حکومت الٰہیہ کی اہلیت رکھتی ہوگی۔

فرشتوں کے قول میں حمد کے ساتھ تسبیح کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن مجید میں تسبیح و حمد کا ایک ساتھ تذکرہ بہت سے مقامات پر ہے۔ تسبیح سے مراد ہے عیوب و نقائص سے بری قرار دینا اور حمد سے مراد ہے اوصاف حسنہ کی تعریف کرنا۔ خداوند عالم کی تسبیح سے مراد ان صفات کا ذکر ہے جن سے وہ بری ہے، مثلاً وہ جسم نہیں ہے، کسی مکان میں نہیں ہے، محل حوادث نہیں ہے وغیرہ وغیرہ اور حمد سے مراد ان اوصاف کا بیان ہے جن سے وہ متصف ہے، مثلاً علم و قدرت وغیرہ، جن سے وہ بری ہے وہ صفات سلبیہ کہلاتی ہیں اور جو اس میں پائی جاتی ہیں وہ صفات ثبوتیہ کہلاتی ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کا جامع ذکر وہ ہوگا جس میں اس کے اوصاف حسنہ کا اثبات اور اوصاف قبیحہ سے تنزیہ کا اظہار ہو۔

فرشتوں نے اپنی بات چھپائی نہیں تھی، بلکہ انہوں نے مخلوقِ تازہ کے نقائص کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا اور اپنی برتری کی طرف بھی۔ اس کے باوجود اللہ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ظاہر و باطن دونوں کو جانتا ہوں، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال تھا کہ وہ اس مخلوق سے افضل ہیں اور انہی کو خلافت ملنی چاہیئے۔ اسی کا جواب "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ" میں دیا گیا ہے۔

وہ اسماء جو آدم علیہ السلام کو تعلیم دیئے گئے ان کے بارے میں مختلف آراء ہیں:

(۱) وہ ساری زبانیں سکھلا دی گئیں جو نسل آدم میں بولی جانے والی تھیں۔
(۲) اسماء سے مراد اسماء کے معانی ہیں اس لیے کہ معنی کے بغیر تنہا اسم تبلانا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔
(۳) تمام موجودات عالم، صنعت و تعمیر، طعام و دوا، معدنیات و نباتات اور بشری ضروریات کی ہر شے کے نام تبلائے گئے۔ ؎۲
(۴) ہادیانِ برحق کے اسماء گرامی تبلائے گئے اور ان کی روحیں فرشتوں کے سامنے پیش

؎۱ تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۱۔
؎۲ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۷۲/۴۰

کی گئیں۔[1]

مذکورہ بالا اقوال میں چونکہ تصادم نہیں ہے۔ اس لیے سب مراد ہیں۔ خصوصًا تیسرا اور چوتھا قول امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، ان دونوں اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان سب چیزوں کے نام بتلائے گئے، جن کی ضرورت نوعِ انسان کو اس دُنیا میں پڑ سکتی تھی، لیکن فرشتوں کے سامنے صرف ہادیانِ برحق کو پیش کیا گیا، جبھی "ثُمَّ عَرَضَهُمْ" (ان لوگوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا) استعمال ہوا ہے۔

فرشتے

ملائکہ "مَلَک" (میم ولام کے فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ "الوک" سے مشتق ہوا ہے اور اس کے معنی پیغامبری کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں مفرد تیرہ (۱۳) مرتبہ، تثنیہ دو (۲) مرتبہ اور بہ صورتِ جمع اڑسٹھ (۶۸) بار استعمال ہوا ہے۔ اس مخلوق کے بارے میں ہماری معلومات کا سارا دار و مدار وحی الٰہی پر ہے۔ اس لیے کہ یہ وجود انسانی مشاہدے، تجربے اور عقل کے دائرے سے باہر ہے۔

یہ فرشتے ایسی مخلوق ہیں جو لطیف اور نورانی عنصر سے خلق ہوئی ہے۔ یہ مختلف شکلوں میں متشکل ہو سکتے ہیں۔ جب ملائکہ کو قوم لوطؑ پر عذاب کا حکم ہوا تو وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور انہیں ولادتِ اسحاقؑ کی خوش خبری سنائی، چونکہ پیکرِ بشری میں آئے تھے اس لیے حضرت ابراہیمؑ انہیں شناخت نہ کر سکے، ان کے سامنے بھنا ہوا دُنبہ لا کر رکھا، جب انھوں نے نہ کھایا تو آپ خوفزدہ ہوئے۔ فرشتوں نے بتلایا کہ مت ڈرو ہم فرشتے ہیں اور قوم لوطؑ پر عذاب کے لیے آئے ہیں۔[2] پھر حضرت لوطؑ کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم فرشتے ہیں۔ اسی طرح جبریلؑ جناب مریمؑ کے پاس بصورتِ بشری تشریف لائے تھے۔[3]

عصمت

کتاب و سنت سے فرشتوں کا معصوم ہونا ثابت ہے، بلکہ قرآن مجید میں واضح اشارات

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۸/۷۳
[2] سورۂ ہود، ۶۹-۸۱۔
[3] سورۂ مریم، ۱۹۔

موجود ہیں کہ ان کی عصمت جبری نہیں بلکہ اختیاری ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ○ [1]

"اے ایمان لانے والو! اپنے کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، اور اس پر تند خو، سخت مزاج فرشتے معیّن ہیں۔ خدا جس کا حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔"

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿۲۹﴾ [2]

"(کافر) کہتے ہیں کہ رحمان اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ پاک ہے بلکہ (وہ فرشتے) محترم بندے ہیں۔
وہ بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔
خدا وہ سب جانتا ہے جو ان کے سامنے اور پس پشت ہے اور وہ اس شخص کے علاوہ جسے خدا پسند کرے کسی کی سفارش نہیں کرتے اور وہ اس (کے جبروت) سے ڈرتے رہتے ہیں۔
اور ان میں سے اگر کوئی یہ کہہ دے کہ خدا کے بجائے میں خدا ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے اور ظالموں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔"

ان آیات میں جن جملوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے کوئی مشینی مخلوق نہیں ہیں، بلکہ

---

[1] سورۂ تحریم ۶۔

[2] سورۂ انبیاء ۲۶ تا ۲۹۔

صاحب اختیار وارادہ ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔
خدا جس بات کا حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔
جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔
وہ بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے۔
اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔
اور ان میں سے اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں خدا کے بجائے خدا ہوں الخ

فطرس ایک فرشتہ تھا، جس کے سلسلے میں سفینۃ البحار[1] میں امام صادق علیہ السّلام سے یہ مروی ہے کہ اس سے کسی امر میں فروگذاشت ہوگئی تھی الخ یہ واقعہ اگرچہ فرشتوں کے اختیار پر دلیل ہے، لیکن وہ ساری صفات جو آیات میں مذکور ہوئی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ فروگذاشت امرالٰہی کا عصیان یا سبقت بالقول وغیرہ نہیں تھی بلکہ معمولی سی چوک تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں کی ماموریت

فرشتے مختلف کاموں پر مامور ہیں، جن میں سے بعض امور کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے۔

قبض روح

"قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ"[2]

"کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر معین ہے، وہی تمہاری روحیں قبض کرتا ہے، پھر تم سب اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

وحی لانا

"يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ"[3]

---

[1] لفظ فطرس کے ذیل میں جامع بزنطی سے یہ روایت نقل کی گئی ہے
[2] سورۂ سجدہ/۱۱۔
[3] سورۂ نحل/۲۔

" وہی اپنے امر سے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے،
نازل کرتا ہے۔"

حفاظت

" وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ "[1]

" وہ اپنے بندوں پر مسلط ہے اور تم پر حفاظت کرنے والے فرشتوں کو بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) تم کو موت دیتے ہیں اور وہ (امر میں) کوتاہی نہیں کرتے۔"

استغفار

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ "[2]

" اور (فرشتے) مومنوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تیرے رحمت و علم ہر شے پر محیط ہیں، سو جو لوگ تائب ہوئے اور تیری راہ پر چلے ان کو بخش دے اور عذاب جہنم سے بچا لے۔"

حمل عرش

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ "[3]

" جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں (وہ) حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔"

---

[1] سورۂ انعام / ۶۱۔

[2] سورۂ مومن / ۷۔

[3] سورہ مومن / ۷۔ بظاہر اس آیت سے مراد کائنات کے انتظامی امور کی انجام دہی اور نگہداشت ہے

اعمال نویسی

"وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ"[1]

"اور تم پر حفاظت کرنے والے معین ہیں معزز (اعمال) لکھنے والے (فرشتے) وہ تمہارے سارے اعمال کو جانتے ہیں"۔

یہ فرشتوں کی ماہیت اور ماموریت پر ایک مختصر ترین تبصرہ تھا۔ گزشتہ سطور میں تحریر کیا گیا کہ اس مخلوق کے سلسلے میں ہمارے پاس جو ذریعہ علم و معرفت ہے وہ فقط اور فقط وحی الٰہی ہے۔ لہٰذا کتاب و سنّت میں ان مباحث کے تفصیلات دیکھے جا سکتے ہیں۔ امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ نے دامن نبوّت کے پرورش یافتہ اور مکتب رسالت کے شاگرد اوّل ہونے کے ناطے ان موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موقع پر نہج البلاغہ کا ایک اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

نہج البلاغہ سے اقتباس

"ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلَا فَمَلَأَهُنَّ أَطْوَارًا مِنْ مَلَائِكَتِهِ فَمِنْهُمْ سُجُودٌ لَا يَرْكَعُونَ وَرُكُوعٌ لَا يَنْتَصِبُونَ وَصَافُّونَ لَا يَتَزَايَلُونَ وَمُسَبِّحُونَ لَا يَسْأَمُونَ لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُونِ وَلَا سَهْوُ الْعُقُولِ وَلَا فَتْرَةُ الْأَبْدَانِ وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ وَمِنْهُمْ أُمَنَاءُ عَلَى وَحْيِهِ وَأَلْسِنَةٌ إِلَى رُسُلِهِ وَمُخْتَلِفُونَ بِقَضَائِهِ وَأَمْرِهِ وَمِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهِ وَالسَّدَنَةُ لِأَبْوَابِ جِنَانِهِ وَمِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْأَرَضِينَ السُّفْلَى أَقْدَامُهُمْ وَالْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَاءِ الْعُلْيَا أَعْنَاقُهُمْ وَالْخَارِجَةُ مِنَ الْأَقْطَارِ أَرْكَانُهُمْ وَالْمُنَاسِبَةُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ أَكْتَافُهُمْ نَاكِسَةٌ دُونَهُ أَبْصَارُهُمْ مُتَلَفِّعُونَ تَحْتَهُ بِأَجْنِحَتِهِمْ مَضْرُوبَةٌ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَنْ دُونَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ وَأَسْتَارُ الْقُدْرَةِ لَا يَتَوَهَّمُونَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيرِ وَلَا يُجْرُونَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوعِينَ وَلَا يَحُدُّونَهُ بِالْأَمَاكِنِ وَلَا يُشِيرُونَ إِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ"[2]

---

[1] سورۃ انفطار/۱۰، ۱۱، ۱۲۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ اوّل۔

"پھر اونچے آسمانوں کے درمیان کو پھاڑا اور انھیں مختلف قسموں کے فرشتوں سے بھر دیا تو ان میں سے کچھ ایسے ہیں، جو فقط سجدے میں ہیں رکوع نہیں کرتے، کچھ رکوع میں ہیں وہ قیام نہیں کرتے، کچھ صف بستہ ہیں وہ اپنے مقام سے سرکتے نہیں ہیں ایسے تسبیح کرنے والے ہیں کہ تھکتے نہیں نہ ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ عقلوں پر سہو کا۔ نہ ان کے جسموں میں سستی ہوتی ہے اور نہ ان پر نسیان کی غشی طاری ہوتی ہے۔ انھیں میں سے وہ بھی ہیں جو وحی الٰہی کے امین اور رسولوں کے لیے لسان اللہ ہیں وہ خدا کے حکم و امر کو لے کر زمین پر آتے جاتے رہتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو بندگان خدا کے محافظ ہیں کچھ جنت کے دروازوں کے پاسبان، کچھ ایسے ہیں جن کے پاؤں تحت الثریٰ میں اور سر بلند ترین آسمان سے بھی اُوپر ہیں ان کے اعضاء جہات سے باہر اور شانے عرش کے پایوں کے برابر ہیں۔ اس کی بارگاہ میں نگاہیں جھکائے ہوئے اور بازو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور اللہ کے درمیان عزت و قدرت کے پردے ہیں نہ وہ اپنے ذہن میں اپنے رب کی شکل معین کرتے ہیں اور نہ مخلوقات کی صفات سے اسے متصف کرتے ہیں۔ نہ مکانوں میں اسے محدود کرتے ہیں اور نہ نگاہوں سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔"

خلیفہ

خلیفہ کے معنی نائب اور جانشین کے ہیں خلافت غیر کی نیابت کا نام ہے چاہے وہ غیر کی موجودگی میں ہو، یا اس کی موت کے بعد ہو، یا اس کے معذور ہونے کی صورت میں ہو، یا یہ نیابت نائب کی عزت افزائی اور اظہار احترام کے لیے ہو۔ (اقرب الموارد، مفردات راغب اصفہانی)۔ آدمؑ کو اللہ کی نیابت آخری قسم کے اعتبار سے حاصل ہوئی ہے۔

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" کا مفہوم ہی یہ ہے کہ خلیفہ بنانا فقط اور فقط اللہ کا کام ہے نہ انسان خود خلیفہ بن سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا انسان کسی انسان کو خلیفہ بنا سکتا ہے، اس مفہوم پر مندرجہ ذیل دو آیتیں بھی نص صریح ہیں۔

"یَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ"[1]

---

[1] سورۂ ص ۲۶/

" اے داؤد ! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ " [1]

" تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں سے اللہ کا وعدہ ہے، کہ انہیں یقیناً زمین میں خلیفہ بنائے گا، جیسے ان سے پہلے والوں کو بنایا تھا۔"

خلیفہ کیسا ہونا چاہیئے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بشریت کے باوجود اس میں ایسی صفات موجود ہوں جن کی بنا پر اس پر خلیفۃ اللہ کا مفہوم صادق آسکے۔

آدم

یہ لفظ عربی نہیں ہے، بلکہ قدیم سریانی زبان سے عربی میں منتقل ہوا ہے۔ اسے قرآن مجید نے آدم اور بنی آدم کی صورت میں پچیس (۲۵) بار استعمال فرمایا ہے۔ اس سے مراد وہ پہلا انسان ہے جو عرصہ وجود میں آیا اور موجودہ انسان اسی کی نسل میں ہیں۔ یہ نام انسانِ اوّل کو خدا نے عطا فرمایا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں " یٰٓاٰدَمُ " [2] کہہ کر خطاب کیا ہے، اسی طرح توریت، کتاب پیدائش میں مذکور ہے کہ آدمؑ کی پیدائش کے دن ان کا نام اللہ نے آدم رکھا [3] یہ انسانِ اوّل براہِ راست مٹی سے خلق ہوا ہے۔ جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے۔

" اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ "

" اس نے ہر شے کو بہترین خلق کیا اور انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز کیا۔"

" ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ "

" پھر ایک ایسے نچوڑ سے اس کی نسل چلائی جو حقیر پانی ہے۔"

" ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ " [4]

" پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی جانب سے رُوح پھونک دی۔"

---

[1] سورۂ نور/۵۵۔

[2] سورۂ بقرۃ/۳۳

[3] باب ۵ فقرہ ۲۔

[4] سورۂ سجدہ/۷، ۸، ۹۔

" اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔[1]

" اللہ کے نزدیک عیسٰی کی مثال آدم کی مثال ہے کہ ان کو مٹی سے خلق کیا پھر اس سے کہا کہ ہو جا، پس وہ ہو گیا۔"

بعض حلقوں میں آدم علیہ السلام کی نبوت اور عدم نبوت پر بھی بحث رہی ہے، لیکن قرآن مجید کی بعض آیات سے ان کی نبوت کا اظہار ہوتا ہے۔

" اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ[2]

" بے شک اللہ نے سارے جہان میں سے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو منتخب کیا ہے۔"

" ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى "[3]

" پھر ان کے رب نے انہیں برگزیدہ کیا، پھر ان کی توبہ قبول کی اور ہدایت کی۔"

ایک لفظ اصطفاء کے ذیل میں آدم و نوح کا تذکرہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ آدم علیہ السلام نبی تھے۔ اسی طرح ان کا اجتباء اور خداوند عالم کا ان سے خطاب فرمانا بھی ان کے دلائل نبوت میں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے عہد کا نظام ابتدائی نوعیت کا اور انتہائی سادہ تھا، یہی سبب ہے کہ جب قرآن مجید نے شریعت کا تذکرہ فرمایا ہے تو اس کا آغاز عہد نوح علیہ السلام سے بتلایا ہے۔[4]

اس زمین پر کتنے آدم گزر چکے ہیں اور موجودہ نسل انسانی کس آدم کی اولاد ہے؟ یہ سوالات ابھی تشنۂ تحقیق ہیں۔ ممکن ہے کسی نتیجہ تک پہنچنے کے بعد ان پر آئندہ گفتگو کی جائے۔

---

[1] سورۂ آلِ عمران / ۵۹۔

[2] سورۂ آلِ عمران / ۳۳۔

[3] سورۂ طٰہٰ / ۱۲۲۔

[4] سورۂ شوریٰ / ۱۳۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

لغت میں سُجُود کا معنی خضوع اور فروتنی کا اظہار ہے اور اصطلاح شرع میں اس سے رکوع وقنوت وغیرہ کی طرح نماز کا ایک مخصوص عمل مراد ہے اور وہ پیشانی کا زمین پر رکھنا ہے[1] اس سجدے کے متعلق ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ وہ سجدۂ عبادت تھا اور اللہ ہی کے لیے تھا، آدم فقط قبلہ تھے، دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ سجدہ اللہ ہی کو تھا اور فرشتوں کو حکم تھا کہ آدم کی اقتدا میں سجدہ کرو، چونکہ وہ امام تھے اس لیے کہہ دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تیسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ یہ سجدۂ تعظیم تھا اور آدم ہی کو کروایا گیا تھا۔ یہی آخری قول درست ہے اس لیے کہ اگر یہ سجدہ آدم کو نہ ہوتا، وہ فقط قبلہ ہوتے تو ابلیس اس سجدہ سے انکار نہ کرتا۔" وَاخْتُلِفَ فِىْ سُجُوْدِ الْمَلٰٓئِكَةِ لِاٰدَمَ عَلٰٓى اَىِّ وَجْهٍ كَانَ فَالْمَرْوِىُّ عَنْ اَئِمَّتِنَآ اَنَّهٗ عَلٰى وَجْهِ التَّكْرِمَةِ لِاٰدَمَ[2] الخ (اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں کے اس سجدے کی نوعیت کیا تھی۔ روایاتِ آئمہؑ سے پتا چلتا ہے، کہ یہ

---

[1] مجمع البیان جلد اوّل صفحہ ۴۴۔
[2] مجمع البیان جلد اوّل صفحہ ۴۴۔

بہ عنوانِ تکریم آدم تھا)۔

لفظ ابلیس قرآن مجید میں گیارہ (۱۱) بار استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کو بہت سے ماہرین لغت اور صاحبان تفسیر نے ابلس (یئس) سے مشتق قرار دیا ہے۔ ابوالفتوح رازی نے کہا ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے اور غیر مشتق ہے [۱] صاحب مجمع البیان کا موقف بھی یہی ہے [۲] یہ بات خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا۔ بلکہ جن تھا" وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَؕ كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ۔ [۳] (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنوں میں سے تھا۔ بس اس نے اپنے رب کے امر کی نافرمانی کی)۔ اس کے متعلق یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ حکم سجدہ فرشتوں کے لیے تھا یہ ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کا ذکر درمیان میں کہاں سے آگیا؟ اس کا جواب دوسرے مقام پر خود قرآن ہی میں موجود ہے۔ "قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ [۴] (اللہ نے کہا کہ تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہ کرے، جب کہ میں نے تجھے حکم دیا) مذکورہ دونوں آیات کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ابلیس جن تھا اور بوجوہ فرشتوں کی صفوں میں موجود تھا، جس کی وجہ سے حکم سجدہ اس سے بھی متعلق ہوا [۵]

علم و قدرت

اس سجدۂ تعظیم کی مصلحت یہ تھی کہ فرشتے جو کائنات کے انتظامی امور پر مامور ہیں وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے تابع فرمان ہو جائیں۔ اس سے قبل اس بات کا تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ آدم کو علم اسمار تعلیم کیا گیا۔ یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ فرشتوں کو علم اسمار نہیں دیا گیا، اگر انھیں بھی دے

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اول صفحہ ۱۳۸۔

[۲] مجمع البیان جلد اول صفحہ ۲۳۔

[۳] سورۂ کہف/ ۵۰۔

[۴] سورۂ اعراف/ ۱۲۔

[۵] سورۂ بنی اسرائیل (۶۱) میں ہے کہ "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے کہا کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے خلق کیا ہے؟ اس کا یہ جواب مختلف سوروں میں نقل ہوا ہے اس جواب سے خود یہ واضح ہوتا ہے کہ ابلیس اپنے آپ کو اس حکم میں شامل سمجھتا تھا، ورنہ آسان جواب یہ تھا کہ تو نے فرشتوں کو سجدہ کے لیے کہا ہے جب کہ میں جن ہوں، لہٰذا یہ حکم مجھ سے متعلق ہی نہیں ہے یہ جواب نہ دینا دلیل ہے کہ اس حکم میں ابلیس شامل تھا۔

دیا جاتا تو آدم کی برتری نہ رہتی وہ بھی آدم کے برابر ہو جاتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ " لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا " (ہمارے پاس تو بس اتنا ہی علم ہے، جتنا تو نے ہمیں دے دیا ہے) یہ بتلاتا ہے کہ فرشتوں کو بھی اللہ نے علم عطا کیا تھا، لیکن اس علم میں معلومات سے مجہولات تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں تھی، جب کہ آدم میں استخراج مسائل کی صلاحیت تھی تو درحقیقت تعلیم میں دونوں برابر تھے، لیکن اپنی فطری ساخت کے فرق کے سبب آدم کو فرشتوں پر علم میں بہر حال ترجیح حاصل ہوئی۔

خداوند عالم کی صفات کی تلخیص دو صفتوں میں ہوتی ہے اور وہ ہیں علم و قدرت۔ یعنی خلق، رزق، احیاء، اماتت وغیرہ ان ساری صفات کی بازگشت انھیں دو صفتوں کی طرف ہے۔ اس واقعے کی رو سے اللہ نے آدم کو علم میں فوقیت دی اور انھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کو صفات علم و قدرت میں بقدر ظرف مظہر الٰہی ہونا چاہیے۔

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا
كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ
اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

اور ہم نے کہا اے آدم اپنی زوجہ کے ساتھ جنت میں رہو اور جس طرح جی چاہے بے فکری سے کھاؤ اور تم دونوں اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

پس شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور وہ جہاں تھے وہاں سے نکلوا دیا اور ہم نے کہا کہ تم اتر

جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمہارے لیے زمین میں ایک مدت تک کے لیے ٹھکانا اور سامانِ حیات ہے۔

اب آدم علیہ السلام کے ساتھ ان کی زوجہ کا بھی ذکر ہوا۔ یہاں قرآن نے لفظ زوج استعمال کیا جو جوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ میاں اور بیوی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ زوجہ سے مراد حضرت حوّا ہیں جو آدم علیہ السلام کی طینت کے باقی ماندہ اجزاء سے خلق ہوئیں۔ بعض روایات میں آدم کی پسلی سے بھی خلق ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔[1]

وہ جنۃ الخلد (ہمیشگی کی جنت) جو ایمان اور عمل صالح کی پاداش میں قیامت کے دن ملے گی۔ اس جنت سے کوئی نکالا نہیں جائے گا۔ اس لیے کہ قرآن میں ہے کہ "وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ"[2] (اور وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے) اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ آدمؑ کو جنت سے نکلنا پڑا۔ اب یہاں یہ بات تحقیق طلب ہے کہ آدم جنت الخلد سے نکلے یا وہ کوئی اور جنت تھی؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ دُنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا، بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ بہشت آسمانوں میں تھی؟ لیکن یہ جنت الخلد کے علاوہ تھی، ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ واقعہ جنت الخلد ہی میں ہوا۔ اس آخری قول کی تائید میں نہج البلاغہ (خطبہ اوّل) کا یہ جملہ بھی پیش کیا گیا ہے "وَوَعَدَهُ الْمَرَدَّ اِلٰى جَنَّتِهٖ"[3]۔ لیکن اس کے برخلاف بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ جنت الخلد کے علاوہ تھی۔ "عَنْ اَبِىْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَئَلْتُهُ عَنْ جَنَّةِ آدَمَ فَقَالَ جَنَّةُ آدَمَ مِنْ جِنَانِ الدُّنْيَا تَطْلَعُ فِيْهَا الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَلَوْ كَانَتْ مِنْ جِنَانِ الْخُلْدِ مَا خَرَجَ مِنْهَا اَبَدًا"[4] (امام جعفر صادق علیہ السلام سے جنت آدم کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جنت آدم دُنیا کی جنتوں میں سے تھی جس میں شمس و قمر طلوع ہوتے ہیں۔ اگر وہ جنت الخلد ہوتی

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل صفحہ ۱۴۰۔

[2] سورۂ حجر ۴۸

[3] اور اللہ نے آدم سے وعدہ کیا کہ انہیں ان کی جنت میں پلٹائے گا۔

[4] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۸۱۔ اس موضوع کی مزید دو روایات اس صفحہ پر موجود ہیں۔

تو ہرگز آدم اس میں سے خارج نہ ہوتے)۔ مجلسیؒ نے ان روایات کی یوں توجیہ فرمائی ہے کہ وہ بہشت جس سے آدم نکلے وہ زمین ہی پر تھی اور یہ وہ ہے، جس میں مومنین کی ارواح عالم برزخ میں رہتی ہیں[1] یعنی اسی جنت میں آدم خلق ہوئے، اسی سے باہر نکلے اور مرنے کے بعد اسی میں پلٹائے گئے اور قیامت کے بعد جنت الخلد میں جائیں گے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جنت اس کرۂ ارض پر ہی ہے ہو سکتا ہے کسی اور ستارے میں ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جس درخت کا پھل کھانے سے آدم و حوّا کو منع کیا گیا، اس کے سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں مثلاً گندم، انگور، انجیر، کافور وغیرہ، توریت نے اسے شجر علم و معرفت قرار دیا ہے[2] قرآن مجید میں اس کی وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کیا تھا، لیکن اس کے اثرات کا بیان ملتا ہے" فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" یعنی اس کا پھل کھانے کے بعد تم دونوں ظالم ہو جاؤ گے۔ " رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا " (اعراف ۲۳) یعنی آدم و حوا نے اعتراف کیا کہ ہم دونوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا" فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (اعراف ۲۲) پس جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان کے عیوب ان پر ظاہر ہو گئے۔" يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (اعراف ۲۷) یعنی شیطان نے آدم و حوا کا لباس اتروا دیا تاکہ انہیں ان کا عیب دکھلائے۔ یہ ساری آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس درخت کا پھل کھانے کے بعد آدم و حوّا پریشانیوں کا شکار ہو گئے، ان کے لباس اُتر گئے اور ان کے مقامات شرم آشکارا ہو گئے۔

شیطان سے ہر سرکش اور متمرد مراد ہے۔ اس آیت میں آدم کو ورغلانے والے کا نام شیطان بیان کیا گیا ہے، جب کہ سجدے سے انکار کرنے والے کا نام ابلیس ہے (جیسا کہ گزر چکا) جہاں جہاں قصہ آدم و ابلیس مذکور ہوا ہے وہاں ابلیس و شیطان کے استعمال کی یہی صورت نظر آتی ہے۔ ابلیس اس شخصیت کا ذاتی نام ہے اور شیطان صفتی نام ہے، یہاں بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی صفت کے ذریعہ اس کا تذکرہ کیا جائے۔

" اِهْبِطُوْا" جمع کا صیغہ ہے اس سے مراد آدمؑ حوّا اور ابلیس ہیں۔ اگرچہ ابلیس جنت سے پہلے ہی نکالا جا چکا تھا، لیکن ابھی اتارا نہیں گیا تھا۔ اس حکم کے ذریعہ اب اسے عملاً اتار بھی دیا گیا۔

"بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" یہ کلام حکم سابق کے ذیل میں نہیں ہے کہ تم نیچے اُترو اور ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرو، اسی لیے کہ دشمنی کا حکم دینا خداوند عالم کی حکمت اور مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۴۔

[2] اس سلسلے میں کم و بیش سولہ اقوال پائے جاتے ہیں۔

یہ ایک اطلاع ہے کہ ابلیس آدم سے (بوجہ حسد)، آدم ابلیس سے (بوجہ گمراہی) اور بنی آدم اپنے ابنائے نوع سے (بوجہ مفادات) دشمنی کریں گے۔ مزید برآں یہ کہ لفظِ "بعض" رکھ کر یہ تلایا گیا ہے کہ یہ کلیہ نہیں ہے بلکہ ایک مزاج ہے، جس کا اظہار ہوتا رہے گا۔

جائزہ

زیرِ بحث آیات کے علاوہ بھی قرآن مجید نے اس قصہ کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے ہم انھیں ایک مقام پر نقل کر رہے ہیں، تاکہ صاحبانِ تحقیق کی نگاہ میں اس واقعہ کے تفصیلی نقوش اُجاگر ہو سکیں۔

سورۂ اعراف

" وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾

" اور یقیناً ہم نے تمھیں خلق کیا پھر ہم نے تمھاری شکلیں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔"

" قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

" اللہ نے کہا تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہ کرے، جب کہ میں نے تجھے حکم دیا، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔"

" قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

" فرمایا بس تو یہاں سے اتر جا تیری یہ مجال نہیں ہے کہ تو یہاں تکبر کرے تو نکل جا، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے۔"

" قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾

"کہا مجھے اس دن تک کی مہلت دے جب لوگ اُٹھائے جائیں۔"

"قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ⑮"

"فرمایا تو مہلت پانے والوں میں سے ہے۔"

"قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ⑯"

"کہا چونکہ تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے تو اب میں یقیناً صراطِ مستقیم پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا۔"

"ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ⑰"

"یقیناً پھر میں ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور ان کے داہنے سے اور ان کے بائیں سے ان کی طرف آؤں گا اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا۔"

"قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ⑱"

"فرمایا یہاں سے نکل جا ذلیل اور راندہ درگاہ ہوکر ان میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو یقیناً میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔"

"وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ⑲"

"اور اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

"فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ⑳"

"پھر شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ کیا تاکہ ان کے لیے وہ عیوب کھول دے جو چھپائے گئے تھے اور کہا تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔"

"وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ㉑"

"اوران دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں ہوں۔"

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

"پس دھوکہ سے انہیں گرا دیا پھر جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان کے عیوب ان پر کھل گئے اور وہ جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے اور ان کے ربّ نے انھیں پکارا، کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہیں روکا تھا اور تمھیں نہیں کہا تھا، کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

"انھوں نے کہا کہ اے ہمارے ربّ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کھائے تو ہم یقیناً گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔"

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

"فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین ایک مدت تک ٹھکانا اور سامان ہے۔"

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

"فرمایا اسی میں جیوگے اور اسی میں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔"

سورۂ حجر

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

"اور جب تمھارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں سوکھی ہوئی سیاہ کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔"

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

"تو جب میں اسے سنوار لوں اور اس میں اپنی (جانب سے) روح پھونک دوں تو تم

سب اس کے لیے سجدہ میں گر جانا۔"
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾
"پس سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔"
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾
"سوائے ابلیس کے، اس نے سجدہ گزاروں میں شامل ہونے سے انکار کیا۔"
قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾
"فرمایا اے ابلیس کیا بات ہے کہ تو سجدہ گزاروں میں شامل نہیں ہوتا۔"
قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾
"کہا میں ایسے بشر کو سجدہ نہیں کر سکتا جسے تو نے سوکھی ہوئی سیاہ کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔"
"قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾
"فرمایا پس تو یہاں سے نکل جا اس لیے کہ تو راندہ ہے۔"
"وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾
"اور تجھ پر روزِ جزا تک لعنت ہے۔"
"قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾
"کہا میرے رب مجھے اس دن تک کی مہلت دے جب لوگ اٹھائیں جائیں گے"
"قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾
"فرمایا تو یقیناً مہلت پانے والوں میں سے ہے۔"
"اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾
"وقتِ معلوم کے دن تک۔"
"قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾
"کہا میرے رب تو نے مجھے گمراہ قرار دیا میں ان کے لیے (گناہ کو) زمین میں خوبصورت بنا دوں گا اور ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔"
"اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ" ﴿۴۰﴾
"سوائے تیرے ان بندوں کے جو خالص کیے گئے ہیں۔"

"قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾
"فرمایا یہ صراطِ مستقیم میری طرف ہے۔"
"اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾
"میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہیں ہے، سوائے ان گمراہوں کے جو تیرے پیچھے چلے۔"

سورۂ طٰہٰ

"وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾
"اور ہم نے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تھا پس وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔"
"وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾
"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا۔"
"فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾
"پس ہم نے کہا اے آدم یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے، کہیں یہ تمھیں جنت سے نکلوا نہ دے اور تم پریشانیوں میں گرفتار ہو جاؤ۔"
"اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾
"اور اس (جنت) میں نہ تم بھوکے رہتے ہو اور نہ بے لباس۔"
"وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾
"اور اس میں نہ تم پیاسے ہوتے ہو اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔"
فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰي شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾
"پس شیطان نے اسے وسوسہ کیا، کہا اے آدم تم کو ہمیشگی کا درخت بتلا دوں اور ایسی حکومت جو کہنہ نہ ہو۔"
"فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا

مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۡ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

"پس ان دونوں نے اس (درخت) سے کھایا تو ان پر پوشیدہ رہنے والی چیزیں ظاہر ہو گئیں اور وہ جنت کے پتوں سے چھپانے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گئے۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

"پھر ان کے ربّ نے انھیں برگزیدہ کیا پھر ان کی توبہ قبول کی اور ہدایت کی۔"

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

"فرمایا تم دونوں یہاں سے اُتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پس اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ ہلاکت میں پڑے گا۔"

سورۂ صٓ

"اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾

"جب تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر خلق کرنے والا ہوں۔"

"فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾

"تو جب میں اُسے سنوار لوں اور اپنی (جانب سے) رُوح اس میں پھونک دُوں تو تم سجدے میں گر جانا۔"

"فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾

"پس سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔"

"اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

"سوائے ابلیس کے اس نے تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔"

"قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾

"فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے اسے سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے

دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے، کیا تو نے تکبر کیا یا تو عالین میں سے تھا "
" قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝۷۶
کہا مَیں اس سے بہتر ہوں۔ (کہ) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے خلق کیا۔
" قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۝۷۷
" فرمایا یہاں سے نکل جا اس لیے کہ تو راندہ ہے"۔
" وَّ اِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۷۸
"اور تجھ پر روزِ جزا تک میری لعنت ہے "
" قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝۷۹
" کہا میرے رب مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن لوگ اُٹھائے جائیں گے۔
" قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ " ۝۸۰
" فرمایا تو مہلت پانے والوں میں ہے "
"اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝۸۱
" وقتِ معلوم کے دن تک "
" قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۸۲
" کہا پس تیری عزت کی قسم، اِن سب کو بہکاؤں گا "
" اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۸۳
"سوائے تیرے اِن بندوں کے جو خالص کیے گئے ہیں"
" قَالَ فَالْحَقُّ ؗ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ۝۸۴
" فرمایا حق یہ ہے، اور مَیں حق ہی کہتا ہوں کہ
" لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۸۵
" مَیں تجھ سے اور تیری پیروی کرنے والوں سے، سب سے جہنم کو بھر دوں گا"

تبصرہ

نبی اس انسانِ کامل کو کہتے ہیں، جسے اللہ اس لیے مبعوث کرتا رہا کہ وہ انسانوں کو صلاح و فلاح کی راہوں سے آشنا کرے، انھیں دُنیا و آخرت کے نقصانات سے محفوظ رہنے کے طریقے بتلائے، انھیں نیک و بد اور خیر و شر کی تمیز کروا دے، گناہوں سے بچنے کی تلقین کرے

اور عبادت واطاعت ومعرفت کی راہوں پر گامزن کرے۔ ایسے انسان کامل سے اگر کوئی گناہ، فعل قبیح یا خلافِ شرع کوئی عمل صادر ہو تو اللہ کا سارا منصوبۂ ہدایت درہم وبرہم ہوجائے گا، اس لیے کہ:

(۱) برائیوں سے روکنے والا اگر خود برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے لہجے میں وہ طاقت اور توانائی نہیں رہے گی اور جو دوسروں کو برائیوں سے روک سکے۔

(۲) برائیوں سے رُکنا تو درکنار رہا انسان اسے دیکھ کر برائیاں کرنے میں اور جری ہوجائیں گے؛

(۳) اس کے کسی قول وفعل پر اعتماد نہ رہے گا اور پورا دین مشکوک ہوکر رہ جائے گا۔

لہٰذا عقلاً نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ آدمؑ پہلے نبی ہیں اس لئے معصوم ہیں۔

نقل شدہ ساری آیات کے مطالعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے عمل معصیت انجام دیا اس لیے کہ اللہ نے انہیں درخت کے قریب جانے اور کھانے سے منع فرمایا تھا، لیکن اس کے برخلاف انھوں نے وسوسۂ شیطانی کے زیرِ اثر اس درخت سے کھالیا، جس کے سبب جنت سے خارج ہوئے اور قرآن نے ان کے لیے ظلم، عصیان اور غوایت جیسے الفاظ استعمال فرمائے، پھر آدمؑ پشیمان ہوئے، خدا کی بارگاہ میں توبہ کی اور وہ قبول ہوئی۔

اس مسئلہ کے حل کی کلید وہ نہی (ممانعت) ہے جو آدم کو کی گئی تھی یعنی "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" (اس درخت کے قریب بھی نہ جانا)، یہ نہی نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی (اگرچہ بعض مفسرین کو اس کے تحریمی یا تنزیہی ہونے کا گمان ہوا ہے) بلکہ ارشادی ہے۔

نہی تحریمی وہ ممانعت ہے کہ جس کے خلاف کرنے والا عتاب کا مستحق بن جاتا ہے۔

نہی تنزیہی وہ ممانعت ہے کہ جس کے خلاف کرنے والا مستحق عتاب نہیں بنتا، لیکن اگر اس نہی کے مطابق عمل کرے تو نگاہ خالق میں پسندیدہ قرار پاتا ہے۔

نہی ارشادی وہ ممانعت ہے کہ جس میں نہی کا سبب بتلا دیا جاتا ہے، مثلاً انسان سے کہا گیا کہ یہ نہ کرو اگر یہ کروگے تو پھر اس کا نتیجہ ایسا ہوگا۔ اب اگر انسان "ایسا ہوگا" کے لیے تیار ہے تو پھر نہی کرنے والے کو اس پر کوئی شدید اعتراض نہ ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی ذات نہی کر رہی ہے، جو صاحب حکمت و دانائی ہے تو یقیناً ترک میں فائدہ ہوگا اور کرنے میں نقصان ہوگا۔ کبھی یہ نقصان ایسا ہوتا ہے کہ عقل اس کا پتا لگا سکتی ہے۔ نہی ارشادی کے ذریعہ انسان کو اسی حکم عقل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، گویا یہ ایک قسم کا مشورہ ہوتا ہے جو انسان کو دیا جاتا ہے۔ اس میں نیک و بد کو سمجھا دیا جاتا ہے اور ماننا نہ ماننا انسان پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں عام طور سے یہ مثال دی جاتی ہے کہ معالج اپنے

مریض کو جن چیزوں سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے اُن سے پرہیز کا مشورہ ہی نہی ارشادی ہے۔ قرآن مجید نے اس واقعے میں اسی طریقِ کار کو اختیار فرمایا ہے۔ "پس ہم نے کہا اے آدم یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے کہیں یہ تمھیں جنّت سے نکلوا نہ دے اور تم پریشانیوں میں گرفتار ہو جاؤ اور اس (جنت) میں نہ تم بھوکے رہتے ہو اور نہ بے لباس اور اس میں نہ تم پیاسے ہوتے ہو اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔" خطاب کا یہ انداز خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نہی ارشادی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس واقعے میں آدم و حوّا دونوں کو درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا جب کہ عصیان اور غوایت جیسے الفاظ صرف آدم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوئے، جنابِ حوّا کے سلسلے میں آیات خاموش ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر وہ عمل خلافِ انسانیت (گناہ) ہوتا تو آدم کی طرح حوّا بھی ماخوذ ہوتیں، لہٰذا پتہ چلا کہ وہ عمل خلافِ انسانیت نہیں، بلکہ فقط خلافِ شانِ نبوّت (ترکِ اولیٰ) تھا جبھی حوّا کا تذکرہ نہیں کیا گیا، اس دلیل کو مزید تقویت اگلی آیت سے ملتی ہے۔ کہ فقط آدمؑ نے توبہ کی، حوا کا تذکرہ کسی مقام پر نہیں ملتا۔[1]

جنّت کے متعلق اجماعی فیصلہ ہے کہ وہ جہانِ تکلیف نہیں ہے کہ وہاں کسی پر وجوب و حُرمت والے احکام نافذ ہوں، لہٰذا جنّت میں اوامر و نواہی کی وہ نوعیت نہیں ہو سکتی جو اس عالمِ تکلیف میں ہے اس اعتبار سے بھی یہ نہی، نہی ارشادی ہی قرار پاتی ہے۔

اب یہ سوال قابلِ غور ہے کہ جب یہ نہی ارشادی تھی تو پھر اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں آدم کے لیے ظلم، عصیان اور غوایت جیسے الفاظ کیوں استعمال ہوئے؟ اور اگر یہ کوئی بہت اہم بات نہ تھی تو آدم کو توبہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

قرآن مجید نے اپنی آیات کی تقسیم محکم اور متشابہ پر کی ہے[2] اور متشابہات کو ذہنِ انسانی کے لیے ایک قسم کا امتحان قرار دیا ہے۔ انہیں حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ محکمات کو سامنے رکھ کر متشابہ آیتوں کی اس طرح تاویل کی جائے کہ وہ محکمات کے عین مطابق ہو جائیں۔ آیۂ اصطفاء اور دیگر آیاتِ قرآنی کی روشنی میں آدم علیہ السلام کا معصوم ہونا قطعی طور پہ ثابت ہے۔ لہٰذا ان الفاظ کے ایسے معانی طے کرنے ہوں گے جو عصمتِ آدم کے خلاف نہ ہوں، اس واقعے میں ظلم کا معنی بے محل کام کو انجام دینا ہوگا عصیان کے معنی مشورہ کو نہ ماننا ہوگا اور غوایت کے معنی سہولتوں سے محروم ہو جانا ہوگا۔ ان کے علاوہ بھی

---

[1] البتہ سورۂ اعراف کی تیئسویں آیت میں دونوں کا اعتراف ذکر ہوا ہے۔ لیکن چونکہ نافرمانی کے سلسلے میں قرآن نے حوا، کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے ان کا اعتراف آدم کا اتباع قرار پائے گا۔

[2] سورہ آلِ عمران، ۷۔

بہت سے الفاظ ہیں جنہیں ان کے محل پر سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

توبۂ آدمؑ کے سلسلے میں فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس نہی ارشادی سے اتنا پتا تو بہر حال چل رہا تھا کہ خداوندِ عالم کی خواہش کیا ہے۔ اس خواہش کے پورا نہ کر سکنے پر آدم کو پشیمانی لاحق ہوئی اور انہوں نے توبہ کی۔

اس پورے واقعے میں جنت سے آدم کے نکلنے کا سبب شیطان کو تبلایا گیا ہے کہ اس نے انھیں جنت سے نکلوا دیا، جب کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ سجدۂ آدم کا انکار کرنے والا ابلیس تھا۔ تو کیا یہ دو جداگانہ وجود ہیں؟ یا ایک ہی ذات کے دو رُخ ہیں؟ نقل شدہ ساری آیات کے بغور مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان آیات میں ابلیس ہی کو شیطان کہا گیا ہے، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جب ابلیس سے عمل شیطنت کا اظہار ہوا تو اسے شیطان کے نام سے یاد کیا گیا، لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راندہ درگاہ ہونے اور نکالے جانے کے بعد وہ اپنی اصلی صورت میں آدم علیہ السلام کو وسوسہ کا شکار نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس کے لیے اسے کسی ذریعہ کی ضرورت ہوئی ہوگی، وہ ذریعہ ابلیس کے ساتھ مل کر شیطان کہلایا (واللہ اعلم بالصواب)

اس سلسلے میں ایک روایت تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ پر موجود ہے کہ کس ذریعہ سے ابلیس حضرت آدم تک پہنچ سکا تھا۔ اس مفہوم کی روایت کثرت کے ساتھ تفسیروں میں نقل ہوئی ہے۔

ابلیس نے جب سجدہ سے انکار کیا تو اسے ہبوط کا حکم ہو گیا " قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ (اعراف/۱۲)

پھر دوسرا حکم ہبوط اس وقت ہوا جب وہ آدمؑ کو وسوسہ کر چکا اور دونوں کے لباس اُتر چکے یہ حکم ہبوط اجتماعی تھا۔

" وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (بقرہ/۳۶)

" قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (اعراف/۲۴)

" قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (طٰہٰ/۱۲۳)

یعنی ابلیس نے یہ وسوسہ ہبوط کے دونوں حکموں کے درمیان کیا ہے۔ اس نے پہلے حکم ہبوط کی بھی نافرمانی کی اور جنت سے نکل کر اس کے اطراف میں موجود رہا (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہبوط کا حکم اوّل تشریعی تھا) اور یوں اسے وسوسہ کا موقع ملا، امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ جنت کے پاس سے نکالا گیا تھا۔

ابلیس کو وسوسہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ تخلیق آدم ہی کے وقت سے اس کا حسد اور اس

کی دشمنی دونوں آشکارا ہو چکے تھے، پھر اس کا یہ احساس برتری کہ آگ مٹی سے افضل ہے آدمؑ کی دشمنی پر اُسے اُکسائے ہوئے تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ دعویٰ ہی بے بنیاد ہے کہ آگ خاک سے افضل ہو اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، جب کہ اس کے خلاف پر دلیل موجود ہے، لیکن اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ ناری مخلوق خاکی سے افضل ہے تو اس کا "اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ" کہنا ایک مغالطہ تھا، اس لیے کہ برتری صلاحیت واستعداد کی بنیاد پر ہوتی ہے (مادۂ تخلیق کی بنیاد پر نہیں) اور خلافت کی صلاحیت واستعدادِ آدمؑ میں تھی اور اس میں نہ تھی۔

انکارِ سجدہ کی گستاخی پر اسے نکال دیا گیا، پھر اس نے مہلت مانگی تو جواب میں کہا گیا، "اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ" اس جملہ کا ایک مقصد تو یہ ہو سکتا ہے کہ تیرے وجود کی ساخت ایسی ہے کہ تو طویل مدت کی عمر پانے والوں میں شامل ہے اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے تجھے مہلت دی۔

مہلت ملنے کے بعد اس نے آدم کو وسوسہ کیا لیکن اب ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ کہ آدم کیونکر وسوسہ میں مبتلا ہو گئے؟ جب کہ شیطان کا جادو اللہ کے مخلص بندوں پر نہیں چلتا۔ اس کا جواب عصمت نبی کے ذیل میں دیا جا چکا ہے، لیکن دوسرا جواب یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ۝ ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی" (۱۲۱/۱۲۲)

ان آیات میں ترکِ اولیٰ کا عمل پہلے ہے اور آدم کے مجتبیٰ ہونے کا عمل بعد میں ہے اس لیے یہ بات قرینِ امکان ہے کہ قبلِ اجتباء اور قبلِ نبوت ان میں وہ ملکہ نہ پایا جاتا ہو جو شیطان کے حملہ کو روک سکے۔ امام علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام سے ایک طویل روایت میں یہ جملہ بھی مروی ہے کہ "وَکَانَ ذٰلِکَ مِنْ اٰدَمَ قَبْلَ النُّبُوَّۃِ"[1] (آدم سے وہ عمل نبوت پانے سے قبل ہوا تھا)۔

بلا تبصرہ

اس واقعہ سے متعلق توریت کی کچھ سطریں نقل کی جاتی ہیں تاکہ صاحبانِ فکر ونظر قرآن

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۵۹۔

مجید کے مضامینِ عالیہ سے ان وضعی جملوں کا موازنہ کر سکیں، اور اُن غلطیوں کو محسُوس کر سکیں جو موجُودہ محرف توریت میں پائی جاتی ہیں، اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غلطیوں کی نشاندہی سے گریز کیا گیا ہے۔

کتاب پیدائش باب دوم نفقرات ۷-۹

اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا، تو انسان جیتی جان ہُوا اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لیے اچھا تھا زمین سے اُگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا بھی درخت لگایا۔

نفقرات ۱۵ — ۱۷

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا، کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔

باب سوم ۱ — ۱۳

اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا۔ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں۔ پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے۔ اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے، بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمھاری آنکھیں کھُل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خُوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھُل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے

لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا۔ سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اس نے کہا، تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔

۲۲—۲۳

اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ اس زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾
قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ
مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

پھر آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمے سیکھے پس اس نے ان کی توبہ قبول کی، وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

ہم نے کہا یہاں سے تم سب اُتر جاؤ تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے (اور حتماً آئے گی) تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا ایسے لوگوں کیلئے خوف

و حزن نہ ہو گا۔
اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات کا مطالعہ کرنے سے قبل پچھلی آیت پر نگاہ کرنا ضروری ہے۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔ (پس شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور وہ جہاں تھے وہاں سے نکلوا دیا اور ہم نے کہا کہ تم اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمھارے لیے زمین میں ایک مدت تک کے لیے ٹھکانا اور سامانِ حیات ہے) اس کے فوراً بعد یہ ذکر ہے کہ آدم نے رب کی طرف سے کلمات سیکھے، یعنی یہ کلمات عصیان کے بعد اور ہبوط سے قبل سیکھے اور ان کی توبہ بھی ہبوط سے قبل قبول ہوئی، لیکن اس توبہ کے باوجود زمین پر اتار دیئے گئے یعنی آدم کے لیے یہ حکم ہبوط سزا کے طور پر نہ تھا ورنہ توبہ کے بعد ساقط ہو جاتا۔ یہ خلافت فی الارض کی طرف اشارہ ہے کہ تمھیں زمین کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے زمین پر جاؤ۔

وہ کلمات کیا تھے جن کے ذریعہ آدم کی دُعا قبول ہوئی؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ یہ جملہ تھا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف ۲۳) لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جُملہ قالا سے شروع ہوتا ہے۔ جب اللہ نے ان سے فرمایا کہ کیا میں نے تمھیں منع نہیں کیا تھا الخ تو اس کے جواب میں انھوں نے یہ جُملہ کہا۔ یعنی یہ جُملہ اللہ کا سکھلایا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ کے سوال کا جواب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس جُملہ کے بعد سُورۂ اعراف میں یہ آیت ہے۔ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (اعراف ۲۴) اور بعینہٖ یہی حکم سُورۂ بقرہ میں آیۂ زیر بحث سے قبل ہے، ابھی یہ آیت نقل کی گئی تھی کہ کہ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (بقرہ ۳۶) اور اس کے بعد کلمات کے سیکھنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کا جُملہ آدم نے اُن کلمات کو سیکھنے سے قبل فرمایا تھا، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی اعتراف کے بعد انھیں وہ کلمات سکھلائے گئے۔

اب پھر یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ کلمات کیا تھے؟ مختلف اقوال میں سب سے زیادہ جس پر روایتیں ملتی ہیں وہ یہ ہے کہ وہ کلمات اسماء پنج تن ہیں۔ چند روایات درج کی جاتی ہیں:۔

"اِبْنُ الْمُغَازِلِیْ بِسَنَدِہٖ عَنْ سَعِیْدِ ابْنِ جُبَیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ عَنِ الْکَلِمَاتِ الَّتِیْ تَلَقَّاھَا آدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ فَتَابَ عَلَیْہِ قَالَ سَئَلَہٗ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَعَلِیٍّ وَفَاطِمَۃَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ فَتَابَ عَلَیْہِ وَغَفَرَلَہٗ۔[1]

"ابن مغازلی نے اپنی سند کے ذریعہ سعید ابن جبیر سے اور انہوں نے عبداللہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی اکرمؐ سے سوال کیا گیا کہ وہ کلمات کیا تھے، جنہیں آدم نے اللہ سے سیکھا تو اس نے توبہ قبول کی؟ فرمایا انہوں نے محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین کے حق کے وسیلے سے دُعا مانگی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول اور ان کی مغفرت کی۔

" فَعَلَیْکَ بِھٰؤُلَاءِ الْکَلِمَاتِ فَاِنَّ اللّٰہَ قَابِلٌ تَوْبَتَکَ وَغَافِرٌ ذَنْبَکَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ سُبْحَانَکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ سُبْحَانَکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ فَھٰؤُلَاءِ الْکَلِمَاتُ الَّتِیْ تَلَقّٰھَا آدَمُ[2]

(جبریلؑ نے آدم سے کہا) تم ان کلمات کو پڑھو اللہ تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہاری خطا کو بخش دے گا بار الہا میں تجھے محمد و آل محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں تو ہر عیب سے بری ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے بُرا کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا تو مجھے معاف کر دے، یقیناً تو ہی معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، بار الہا میں تجھے محمد و آل محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے مانگتا ہوں تو ہر عیب سے بری ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے بُرا کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا۔ پس میری توبہ قبول فرما، یقینا تو ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے تو یہی وہ کلمات ہیں، جنہیں آدمؑ نے سیکھا تھا۔

---

[1] ینابیع المودۃ باب ۲۴ صفحہ ۹۷۔
[2] تفسیر درمنثور جلد اول صفحہ ۶۱۔

وَاَخْرَجَ ابْنُ النَّجَّارِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ عَنِ الْکَلِمَاتِ الَّتِیْ تَلَقَّاهَا آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ فَتَابَ عَلَیْهِ قَالَ سَئَلَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّعَلِیٍّ وَّفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ اِلَّا تُبْتَ عَلَیَّ فَتَابَ عَلَیْهِ۔[1]

"ابن النجار نے ابن عباس سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے ان کلمات کے بارے میں پوچھا جو آدم نے اپنے رب سے سیکھے تھے اور اس نے ان کی توبہ قبول کی تھی، فرمایا کہ انہوں نے محمد، علی، فاطمہ، حسن، اور حسین کے حق کا واسطہ دے کر کہا کہ میری توبہ قبول فرما، تو اس نے آدم کی توبہ قبول کر لی۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی روایات ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے ناموں کے ذریعہ آدم علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی تھی[2]۔ ان ساری روایات سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ یہی نام آدم علیہ السلام کو سکھلائے گئے تھے اور انہیں کا نوری وجود فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔[3]

قبولیت توبہ کے بعد حکم ہبوط دیا گیا، جب کہ اس سے قبل چھتیسویں (۳۶ ویں) آیہ مبارکہ میں حکم ہبوط ہو چکا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے حکم ہبوط سے مراد جنت کو خالی کر دینا اور زمین کو آباد کرنا ہے، جب کہ دوسرے حکم ہبوط میں یہ فرمایا گیا کہ جاؤ تاکہ زمین پر سلسلۂ ہدایت قائم ہو سکے۔

"فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی" کا ترجمہ یہ کیا گیا کہ اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے (اور حتماً آئے گی) تو بین کی عبارت "یاتینکم" کے نون تاکید کا ترجمہ ہے۔

اس ہدایت کو فقط قبول نہیں کرنا ہے، بلکہ اس کا اتباع کرنا ہے، اتباع ہدایت سے قبل کا مرحلہ یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اس کا مطلب یہ ہوا کہ صاحبانِ ایمان و اتباع کو کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔

خوف کے معنی ڈر اور کسی ناپسندیدہ شے کے واقع ہونے کا اندیشہ ہیں (مفردات) اور حزن کے معنی غم و اندوہ کے ہیں (قاموس) جیسا کہ قرآن مجید نے حضرت یعقوب کے لیے فرمایا وَابْیَضَّتْ عَیْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (سورۂ یوسف ۸۴) ان کی دونوں آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں۔ ان معانی سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ حزن کا تعلق ماضی سے ہے اور خوف کا تعلق مستقبل سے ہے، قیامت کے

---

[1] تفسیر درمنثور جلد اول صفحہ ۶۱۔

[2] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۶۔

[3] تفسیر الفرقان جلد اول صفحہ ۲۲۳۔

دن گمراہ اور گناہ گار اپنے ماضی کے سبب حزن میں ہوں گے اور اپنے مستقبل کے خوف میں مبتلا ہوں گے، اس کے برعکس اتباعِ ہدایت کرنے والے اس خوف و حزن سے محفوظ ہوں گے۔

اتباعِ ہدایت کرنے والوں کے تذکرے کے فوراً بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا گیا جو کافر اور تکذیبِ آیات کرنے والے لوگ ہیں ان کا جہنم میں رہنا ہمیشہ ہوگا۔ اس زمرے میں ہر وہ شخص شامل ہے جو ضروریاتِ دین میں سے کسی شے کا انکار کرے اور آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرے۔

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِيٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمھیں عطا کی تھی اور میرے عہد کو پورا کرو تو میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔

کفر اور تکذیب آیات کے انجام کو بتلا کر ایک ایسی قوم کا تذکرہ شروع کیا گیا جو سرزمین نزول قرآن سے گہرا ربط رکھتی تھی اسے مخاطب کر کے کہا گیا کہ خدا کی نعمت کو یاد کرو۔

اس نعمت سے وہ تمام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو اس قوم کو عطا ہوئی تھیں اگرچہ یہاں نعمت واحد ہے لیکن اسم جنس ہونے کے سبب سب نعمتوں کو شامل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے "وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا"[۱] (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں گن نہیں سکو گے)۔ اور ممکن ہے کہ اس سے کسی مخصوص نعمت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو جیسا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں تذکرہ ملتا ہے۔

"وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتٰكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعٰلَمِينَ"[۲]

---

[۱] سورۃ ابراہیم آیت ۳۴۔

[۲] سورۃ مائدہ آیت ۲۰۔

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم والو تم لوگ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر اُتاری کہ اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو جہانوں میں کسی کو نہیں دیا تھا۔

وہ عہد کیا ہے جس کے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔

(١) وہ عہد مراد ہے جو خدا نے اس آیت میں فرمایا ہے،

"خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ" [۱]

"جو کتاب ہم نے تمھیں دی ہے اسے پوری قوت سے قبول کرو اور جو اس میں ہے اسے یاد رکھو"

(٢) وہ عہد مراد ہے جو خدا نے اس آیت میں فرمایا ہے،

"وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ" [۲]

"اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں سے بارہ نقیب اٹھائے اور اللہ نے کہا کہ اگر تم نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ تو میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

(٣) اس عہد سے اللہ کے سارے اوامر و نواہی مراد ہیں،

"اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ" [۳]

"اے فرزندانِ آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ یقیناً تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا ہے، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اگرچہ یہ عہد سارے بنی آدم سے لیا گیا ہے، لیکن چونکہ اس میں بنی اسرائیل بھی شامل ہیں لہٰذا انہیں مخاطب کر کے اس عہد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یہاں توریت کا ایک حوالہ بھی قابل

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ٦٣۔

[۲] سورۂ مائدہ آیت ١٢۔

[۳] سورۂ یٰسٓ آیت ٦١/٦٠۔

ذکر ہے:

"تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند تیرا خدا ہے اور تو اس کی راہوں پر چلے گا اور اس کے آئین اور فرمان اور احکام کو مانے گا اور اس کی بات سنے گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ کو، جیسا اس نے وعدہ کیا تھا، اپنی خاص قوم قرار دیا ہے، تاکہ تو اس کے سب حکموں کو مانے۔" [1]

(۴) نعمتوں کا تعارف کرانا اللہ کا عہد ہے اور شکرِ نعمت کے طور پر اس کے احکامات کی تعمیل کرنا بنی اسرائیل کا عہد ہے۔

(۵) وہ عہد ایمان و اتباعِ خاتم النبیینؐ ہے جو بذریعہ توریت و موسیٰ بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا۔

اگرچہ لفظ عہد عام ہے اور یقینی طور پر اس سے ہر وہ امر و نہی مراد ہے، جسے خدا نے بنی اسرائیل سے متعلق کیا تھا، اسی طرح عہد خدا بھی عام ہے اور اس سے مراد ہر وہ جزا ہے جو ایفائے عہد کی صورت میں بنی اسرائیل کے لیے دُنیا و آخرت میں ملے ہے، مزید برآں یہ کہ وہ سارے عہد جو بنی اسرائیل سے لیے گئے اور جن کا تذکرہ مختلف مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہے [2] وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن مفسرین کی اکثریت نے آخری قول کو ترجیح دی ہے اور بظاہر یہی بات اقرب الی الصواب ہے اس لیے کہ عہد قرآن سے سارے اوامر و نواہی اب اس اکیلے ذریعہ سے ملیں گے جس کا نام محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے اس آیت میں لفظ عہد کو عام رکھنے کے باوجود فوراً بعد کی آیت کے پہلے جز میں تعیین کر دی گئی ہے کہ "میں نے جو نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ" اس کے ساتھ ہی سورۂ آلِ عمران کی آیت (۸۱) میں بھی صراحت موجود ہے کہ آخری رسولؐ کے سلسلے میں سارے انبیاء سے عہد لیا گیا تھا۔

اس آیہ مبارکہ میں عہد خدا کا پورا ہونا اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ پہلے بنی اسرائیل اپنے عہد کو پورا کریں۔ یہ خود اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اگر انسان اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے تو پھر خدا پر بھی لازم نہیں کہ وہ اس انسان کے سلسلے میں اپنے عہد کو پورا کرے امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَاللهِ لَوْ وَفَيْتُمْ لِلّٰهِ لَوَفَى اللهُ لَكُمْ" (خدا کی قسم اگر تم اللہ سے وفا کرو گے تو اللہ تم سے وفا کرے گا) [3]

---

[1] استثناء باب ۲۶، فقرات ۱۸/۱۷۔

[2] سورۂ بقرہ ۹۳، آلِ عمران ۱۸۷، مائدہ ۲/۷۰۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۳۔

"وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ" (صرف مجھ سے ڈرتے رہو) میں "إِيَّايَ" کے تقدیم کی وہی صورت ہے جو "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" میں ہے، یعنی اس پوری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے، جس کے جلال و جبروت سے ڈرا جائے۔

بنی اسرائیل

اسرائیل حضرت یعقوب ابن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کا لقب ہے (یا دوسرا نام ہے) انھیں کی نسل بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت یعقوب کے والد جناب اسحاق حضرت سارہ کے بطن سے تھے جبکہ اس سے قبل حضرت اسماعیل بطن ہاجرہ سے متولد ہو چکے تھے (ان کی نسل بنی اسماعیل کہلاتی ہے) لفظ اسرائیل قرآن مجید میں ۴۲ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ یہ عبرانی زبان میں لیسرائیل ہے۔ لیسر کے معنی بہادر اور جنگ آزما سپاہی اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ لہٰذا اس کا مطلب ہوا، خدا کا سپاہی۔ بعض محققین کی نگاہ میں اسرا کے معنی بندے کے ہیں اس لحاظ سے اس کا مطلب عبداللہ اور بندۂ خدا ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں توریت میں ایک دلچسپ اور مضحکہ خیز روایت پائی جاتی ہے۔

> "اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کُشتی لڑتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی طرف سے چھُوا اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کشتی کرنے میں چڑھ گئی اور اس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تب اس نے اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا یعقوب۔ اس نے کہا کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا، کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔[1]

حضرت یعقوب (اسرائیل) سرزمین کنعان میں سکونت پذیر تھے اور ان کی بارہ نرینہ اولادیں تھیں۔ راؤبین، شمعون، لاوی، یہودا، دان، نفتالی، جاد، اشیر، لیساکر، زبولون، یوسف اور بنیامین۔ یعقوب اپنے بیٹے یوسف کے فراق میں گریہ کناں رہتے تھے کہ سرزمین کنعان خشک سالی اور قحط کا شکار ہو گئی یعقوب نے اپنے بیٹوں کو گندم کی خریداری کے لیے مصر بھیجا۔ یوسف گم گشتہ فرعون کے دربار میں ایک

---

[1] کتاب پیدائش باب ۳۲ فقرات ۲۴ - ۲۸۔

[2] کتاب پیدائش باب ۳۷، فقرہ ۱۔

اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، یہی سبب بنا کہ یعقوب اپنے خاندان کو لے کر مصر ہجرت کر گئے[1] فرعون نے یُوسف کے احترام میں انھیں مصر میں ایک سر سبز و شاداب علاقہ بخش دیا۔ یعقوب نے وہاں اپنے خاندان کے ساتھ سکونت اختیار فرمائی، سترہ سال زندہ رہے اور ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال کی عمر میں وفات پائی۔[2] ان کا جسدِ مبارک مصر سے کنعان منتقل کیا گیا اور مکفیلہ میں دفن کیا گیا۔[3]

یوسف اور برادران یوسف کی نسل یعنی قوم بنی اسرائیل مصر میں کم وبیش چار سو سال تک مقیم رہی، جیساکہ اس حوالے سے واضح ہوتا ہے۔

"اور اس نے ابرام سے کہا، یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو اُن کا نہیں پردیسی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے اور وہ چار سو برس تک ان کو دُکھ دیں گے۔"[4]

لیکن عہد یوسف کے بعد فرعونوں نے ان کے ساتھ بدترین سلوک کا مظاہرہ کیا، انھیں غلام بنا لیا، ان کے مردوں کو قتل اور کام کاج کے لیے ان کی عورتوں کو اسیر بنانا شروع کیا۔ یہ لوگ اس طویل مدت میں مختلف قسم کے ظلم و جور کا شکار ہوتے رہے، یہاں تک کہ ان میں حضرت مُوسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اور انہوں نے فرعونیوں کے ظلم وستم سے بنی اسرائیل کو آزاد کرایا اور ان سے فلسطین چلنے کو کہا تاکہ دوبارہ سرزمین فلسطین کو واپس لیا جا سکے یہودیوں نے فطری سرکشی اور بُزدلی کے سبب موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی، جس کے سبب انھیں اللہ نے صحرائے سینا میں چالیس سال تک سرگرداں رکھا پھر جناب مُوسیٰ کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشع انہیں کنعان لے گئے۔

بنی اسماعیل ابتدا ہی سے عرب میں آباد تھے۔ ظہورِ اسلام سے کئی صدی قبل یہودی بھی عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے، خیبر میں ان کی حکومت قائم تھی اور یثرب (مدینہ) میں ان کے تین قبیلے، بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع آباد تھے یہ لوگ مدینہ میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان کے عرب میں آباد ہونے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ توریت وکلیم کے ذریعہ سُن چکے تھے کہ آخری نبی اور آخری

---

[1] سُورۂ یوسف میں کچھ تفصیلات دیکھے جا سکتے ہیں۔

[2] کتاب پیدائش باب ۴۷ فقرہ ۲۸۔

[3] مکفیلہ کا جغرافیہ مندرجہ عبارت سے واضح ہوتا ہے "اس کے بعد ابراہام نے اپنی بیوی سارہ کو مکفیلہ کے کھیت کے غار میں جو ملک کنعان میں ممرے یعنی حبرون کے سامنے ہے دفن کیا (پیدائش باب ۲۳ فقرہ ۱۹) یعقوب کے دفن کا تذکرہ کتاب پیدائش باب ۴۹ فقرہ ۳۱ میں ہے۔

[4] توراۃ کتاب پیدائش باب ۱۵ فقرہ ۱۳۔

پیغام خطہ عرب میں ظہور کرے گا، لہٰذا انہوں نے اپنی سکونت کے لیے اس خطہ کو منتخب کر لیا۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے واقعات کو بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ

① اسلام و قرآن کے نزول کی سرزمین بنی اسماعیل کا مسکن تھی اور بنی اسرائیل ان کے عم زاد تھے لہٰذا ان کے تذکرے کو بعنوان عبرت و نصیحت بیان کیا گیا۔

② مدنی معاشرہ میں بنی اسرائیل کے اثر و رسوخ کے سبب بھی یہ ضروری تھا کہ ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائے اور ان کے کرتوت کھول کھول کر بیان کیے جائیں۔

③ پیغمبر اکرمؐ کی مشہور روایت ہے کہ مسلمان یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چلیں گے اس لیے یہ نصیحت عام مسلمانوں کے لیے بھی ہے کہ ان کے عروج و زوال اور سرکشی و نافرمانی کی داستان کو سامنے رکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا
بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾
وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا
مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور جو میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو تمہارے پاس ہے اور اس کے پہلے کافر نہ ہو اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچ ڈالو اور صرف میرا ہی تقوٰی اختیار کرو

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور (نہ) حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

"اور جو میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ" اگر اس جزء کو پچھلی آیت سے ملا کر دیکھا جائے۔ تو واضح نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ عہد جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ تم رسولِ اسلام اور قرآن پر ایمان لاؤ گے۔ اگر اس نزول سے مراد قرآن ہو تو اس کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وہ توریت کے متضاد نہیں بلکہ اس کی تصدیق کرنے والا ہے۔ ایک طرف تو اس جملہ سے احکام الٰہی کے مزاج کی وحدت کا پتہ ملتا ہے اور دوسری طرف یہی جملہ یہودیوں پر اتمام حجت ہے کہ اگر متضاد ہوتا تو تمہارے پاس اس پر ایمان نہ لانے کا بہانہ تھا۔ لیکن اب کیوں ایمان نہیں لاتے ؟ اور اگر اس نزول سے[1] سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں تو وہ اپنی ذات سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق کر رہے ہیں جو توریت میں موجود ہیں اور اس کا تمہیں علم بھی ہے تو اب ان پر ایمان نہ لانے کا کیا جواز ہے ؟[2]

اگر "بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ" سے قرآن ہی کو مراد لیا جائے تو کیا قرآن مجید اس پوری توریت کی تصدیق کرتا ہے جو اس وقت یہودیوں کے پاس تھی ؟ جب کہ اسی قرآن نے اس کے محرف ہونے کو بھی بیان فرمایا ہے۔

"فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ"[3]

پس وائے ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے تھوڑا دام لے لیں۔ پس وائے ہو ان کے اوپر اس کے سبب جو اُن کے ہاتھوں نے لکھا اور وائے ہو ان پر اس کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔

---

[1] قرآن مجید نے سورۂ طلاق آیت ۱۰/۱۱ میں رسولِ اسلام کے بھیجنے کو نزول سے تعبیر کیا ہے۔
[2] آیاتِ قرآنی کی جامعیت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں تفسیروں (قرآن و رسول اللہ) کو قبول کیا جائے۔
[3] سورہ بقرہ آیت ۷۹۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے ہر اس بات کی تصدیق کی ہے جو کتاب ہے، وہ غیر کتاب کی تصدیق نہیں کرتا جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

" وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ " ۱؎

" اور ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے قبل کی کتاب میں سے ہے۔

لہٰذا محرّف توریت میں جتنا حصہ کتاب ہے قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے اور جو جعلی اور وضعی ہے اس کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

" وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ": اس کے پہلے کافر نہ ہو" میں کس کے پہلے کافر ومنکر بننے سے منع کیا گیا ہے۔ تو یہاں قرآن اور رسول اللہ دونوں کو مراد لیا جا سکتا ہے، پھر ارشاد ہوا کہ میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچ ڈالو۔ یہاں آیت کے دونوں اجزاء پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ

" اگر پہلا کافر بننا منع ہے تو کیا انسان دوسرے درجہ کا کافر بن سکتا ہے؟

اگر آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچنا منع ہے تو کیا زیادہ قیمت پر بیچ سکتا ہے؟

تو درحقیقت یہ تعریض ہے کہ تمھیں تو اوّل مومن بننا تھا، لیکن تم اس کے بجائے اوّل کافر بن گئے اور تمھیں تو آیات کو کسی قیمت پر فروخت نہیں کرنا تھا، لیکن تم نے اسے تھوڑے داموں فروخت کر دیا۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ کعب بن اشرف، حیی ابن اخطب اور دیگر علمائے یہود کو ان کی قوم کی طرف سے سالانہ وظائف و ہدایا ملتے تھے۔ ظہور اسلام پر وہ ڈرے کہ اگر رسول اللہؐ پر ایمان لائیں گے تو یہ سارے ہدایا اور وظائف بند ہو جائیں گے، لہٰذا انھوں نے اسلام اور رسولؐ اسلام سے متعلق آیاتِ توریت میں تحریف کر دی۔ ۲؎

" وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ " اور صرف میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔ اس میں پوری زندگی کا منشور ہے کہ اگر صرف اللہ کا خوف رکھو گے تو حق پر ثابت قدم رہ سکو گے اور تمھیں سرمایہ، اقتدار اور دیگر ترہیبات نہ راہِ حق سے ہٹا سکیں گی اور نہ تمہارے قدموں کو متزلزل کر سکیں گی۔

خالص حق اور خالص باطل چھپائے نہیں چھپتے، پریشانیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں، جب حق و باطل میں آمیزش ہو جائے، اسے منع فرمایا گیا ہے کہ حق و باطل میں آمیزش نہ

۱؎ سورہ مائدہ آیت ۴۸۔

۲؎ تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۰۔

کرو[1] یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ علمائے یہود توریت میں خاتم النبیین کی پیش گوئیوں میں کہیں لفظی تحریف کرتے تھے، کہیں معنوی تاویل سے کام لیتے تھے اور کبھی اپنی باتوں کو کلام الٰہی کے ساتھ مخلوط کر دیتے تھے۔ انہیں اس کام سے منع کیا گیا اور یہ بھی فرمایا گیا کہ کتمانِ حق نہ کرو یہ بھی ویسا ہی جرم ہے جیسا حق و باطل کو مخلوط کرنا ہے اس سے قبل کی آیت میں یہ حکم تھا کہ خود گمراہ نہ ہو اور اس آیت میں یہ حکم ہے کہ دوسرے کو تحریف، تاویل اور کتمانِ حق کے ذریعہ گمراہ نہ کرو۔

پھر انہیں نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ اس سے شریعت موسوی کی نماز و زکوٰۃ مراد نہیں ہے بلکہ وہ نماز و زکوٰۃ مراد ہے جسے شریعت مقدسۂ اسلام نے متعارف کرایا ہے اس لیے کہ اس سے قبل فرمایا گیا ہے کہ قرآن و رسول پر ایمان لاؤ اب اگر یہ کہا جائے کہ شریعتِ موسوی کے مطابق نماز و زکوٰۃ کے فرائض بجالاؤ تو دونوں حکموں میں تضاد ہو جائے گا جب یہ واضح ہو گیا کہ اس سے اسلامی نماز و زکوٰۃ مراد ہیں۔ تو پھر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کفار جس طرح اصولِ دین کو تسلیم کرنے پر مکلف ہیں اس طرح فروع کی بجاآوری پر بھی مکلف ہیں اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کفار پر قیامت کے دن دوہرا عذاب ہوگا ایک انکار اصول کی بناء پر اور دوسرا فروع نہ بجالانے کی بناء پر۔

"وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" میں جماعت کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے، رکوع نماز کی وہ امتیازی صفت ہے جو غیر نماز میں استعمال نہیں ہوتی اور رکوع ہی وہ آخری جگہ ہے، جہاں سے انسان جماعت میں شریک ہو سکتا ہے اور رکعت کا لفظ بھی رکوع ہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

صلوٰۃ و زکوٰۃ

اس دنیا میں انسان کی دو بڑی ذمہ داریاں ہیں ایک اپنی ذات کو فضائل و کمالات سے آراستہ کرنا اور دوسرے معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کرنا۔ ان دونوں باتوں کو دو اصطلاحوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے اور وہ ہیں صلوٰۃ و زکوٰۃ۔ یہاں بنی اسرائیل کو یہ بتلایا گیا کہ فقط ایمان لے آنا کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ عملاً اس کا اظہار نہ ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

لفظ صلوٰۃ کم و بیش اٹھہتر (۷۸) مقامات پر استعمال ہوا ہے (المعجم المفہرس)، نماز ہر شریعت

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خالص باطل کا پرچار کر سکتے ہو اس لیے کہ باطل کی نشر و اشاعت تو غلط ہے ہی نیم باطل سے بھی پرہیز کرو۔

میں اہمیت رکھتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔

" رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي " ؎۱

" میرے رب مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی "

انبیائے بنی اسرائیل کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

" وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ " ؎۲

" اور ہم نے ان کی طرف کارِ خیر کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی "

موسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے لیے وحی ہوئی۔

" وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ " ؎۳

" اور اپنے گھروں کو قبلہ قرار دو اور نماز قائم کرو "

قوم شعیب نے ان سے کہا۔

" يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا " ؎۴

" اے شعیب کیا تمھاری نماز یہ حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں، جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں "

اسماعیل صادق الوعد کے لیے ارشاد ہے۔

" وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ " ؎۵

" اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز و زکوٰۃ کی تاکید کیا کرتے تھے "

عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے۔

" وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا " ؎۶

" اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں "

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی۔

؎۱ سورۂ ابراہیم، ۴۰۔

؎۲ سورۂ انبیاء، ۷۳۔

؎۳ سورۂ یونس، ۸۷۔

؎۴ سورۂ ہود، ۸۷۔

؎۵ سورۂ مریم، ۵۵۔

؎۶ سورۂ مریم، ۳۱۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ [1]
"بیٹا نماز قائم کرو اور اچھے کام کی نصیحت کیا کرو۔"

اس سلسلۂ آیات میں بنی اسرائیل کو حکمِ ایمان کے بعد پہلا حکم نماز کا دیا گیا ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی اہم عبادت ہے۔ یہی وہ عبادت ہے۔ جسے دین کا ستون، مومن کی معراج اور تقرب الٰہی کا وسیلہ قرار دیا گیا۔

زکوٰۃ کا لفظ (۳۲) بتیس مرتبہ قرآن میں استعمال ہوا ہے (المعجم المفہرس) یہ حکم ایمان کے بعد دوسرا حکم ہے جو بنی اسرائیل کو دیا گیا ہے۔ بیشتر مقامات پر اس سے مُراد وہ مال ہے، جو خدا کی راہ میں صرف کیا جائے۔ اس مال کو زکوٰۃ (پاکی، نمو) کہنے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مال کو پاک کرنے کا سبب ہے اور اس فریضہ کی انجام دہی سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ رجحان قوی یہ ہے کہ اس سے مراد فقط واجب زکوٰۃ نہیں ہے، بلکہ خدا کی راہ میں مال کا صرف کرنا ہے، خواہ وہ واجب ہو یا مستحب، اس کی تائید میں یہ دو آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن میں لفظِ صلوٰۃ کے بعد عام انفاق رزق کا ذکر ہے۔

"وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ" [2]
اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو انہیں رزق دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

"وَالْمُقِيمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ" [3]
"اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ زکوٰۃ اصطلاحی کی تشریع مدینہ میں ہوئی ہے۔ جب کہ مکّی سُورتوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۔ [4]
"اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔"

---

[1] سورۂ لقمان ۱۷۔
[2] سورۂ بقرہ ۳،
[3] سورہ حج ۳۵۔
[4] سورۂ مومنون ۴۔

"وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ" [1]

"اور وائے ہو مشرکوں پر جو زکوٰۃ نہیں دیتے"

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ زکوٰۃ عام انفاق رزق کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ واجب زکوٰۃ کا تذکرہ سورۂ توبہ (۶۰) میں صدقات کے لفظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

---

[1] سورۂ حم سجدہ ۶/۷۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

اور صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو اور یقیناً یہ ایک مشکل امر ہے سوائے ان کے جو خشوع رکھتے ہیں۔

جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ربّ سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

"بِرّ" قول وفعل کی ہر نیکی کو کہا جاتا ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں استفہام انکاری ہے۔ یہ

خطاب علمائے یہود سے ہے اور انھیں اس بات پر ملامت کی جا رہی ہے کہ ان کے قول و عمل میں تضاد تھا۔ وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ جس کے مفاہیم میں ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کے سامنے توریت میں بیان شدہ پیش گوئیاں پڑھ کر آخری نبی پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے، لیکن جب پیغمبر اکرمؐ کا ظہور ہوا تو انہوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی، اس ملامت میں یہ کہہ کر مزید شدت پیدا کی گئی کہ "حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو" اس جملہ سے کم از کم دو باتوں کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔

تم نے کتاب میں آخری نبی کی پیش گوئیاں پڑھی ہیں تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

کیا تمھاری کتاب اسے اچھا سمجھتی ہے کہ دوسروں کو نیکی کا حکم دو اور خود عمل نہ کرو۔؟

"أَفَلَا تَعْقِلُونَ" کا جز اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مذمت و ملامت عقلی ہے اور اس کا مصداق قابل نفرین ہے۔ یعنی ہر معاشرہ، ہر عقلمند شخص اور ہر منطق کی نگاہ میں ہر ایسا انسان قابل مذمت و ملامت ہے جو دوسروں کو نیکی کا حکم دے اور خود اس بات پر عمل نہ کرے۔ خداوند عالم ہم سب کو، ہمارے خطباء، علماء اور واعظین کو اس بھیانک جرم سے محفوظ رکھے۔

پھر بنی اسرائیل کو صبر و صلوٰۃ سے مدد لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ راہ حق پر چلنے میں جو پریشانیاں انسان کو لاحق ہو سکتی ہیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ پسندیدہ اشیاء دسترس سے دور ہو جائیں اور ناپسندیدہ امور انسان پر مسلط ہو جائیں، دوسرے یہ کہ فضائل و کمالات سے عاری ہونے کے سبب قلب میں وہ قوت باقی نہ رہے جو انسان کو راہ حق پر ثبات بخشتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اگر پہلی صورت ہو تو صبر سے کام لو اور اگر دوسری صورت ہو تو نماز سے کام لو اور اپنے اللہ سے اپنے رشتے کو مستحکم کرنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ یہ استعانت بہت ہی مشکل امر ہے اور فقط ان لوگوں کے بس میں ہے جو خدا کے حضور فروتنی (خشوع) کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن اس کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے۔

اگرچہ آیت میں لفظ ظن استعمال ہوا ہے، لیکن ہم نے اس کا ترجمہ یقین کیا ہے، اس لیے کہ بہت سے مفسرین اور ماہرین لغت نے اس کا یہی ترجمہ اس مقام پر بہتر قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ کہ قرآن نے یقین کی جگہ ظن (گمان) کے لفظ کو کیوں استعمال کیا؟ تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان کو کمزور ترین علم (ظن) بھی ہو کہ اسے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے تو اس میں فروتنی اور خشوع کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

نماز کے ذریعہ مدد طلب کرنے کے سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول سنگِ میل ہے:-

"مَا يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ اِذَا دَخَلَ عَلَيْهِ غَمٌّ مِنْ غُمُوْمِ الدُّنْيَا اَنْ يَتَوَضَّأَ ثُمَّ يَدْخُلَ مَسْجِدَهٗ فَيَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ فَيَدْعُوَ اللّٰهَ فِيْهَا اَمَا سَمِعْتَ اللّٰهَ يَقُوْلُ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ"[1]

"کیا مانع ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص مصائب دنیوی میں سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو وہ وضو کرے اور اپنی مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز پڑھے اور دعا کرے تاکہ مصیبت رفع ہو کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ صبر اور نماز سے مدد مانگو۔"

---

[1] تفسیر عیاشی جلد اول صفحہ ۴۳ حدیث ۲۹۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ
شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمھیں عطا کی تھی اور میں نے تمھیں سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی۔

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

پہلی بار (آیت ۴۰ میں) نعمت کا اجمالی تذکرہ کر کے انھیں رسولِ اسلام کی پیش گوئیوں کی طرف متوجہ کیا گیا تھا اور یہ بتلایا گیا تھا کہ ان نعمتوں میں نبوت بھی ایک نعمت ہے جو تمھیں

دی گئی تھی۔ اب یہ نعمت خاتم النبیینؐ کی شکل میں آئی ہے تو اس کا انکار کر کے کفرانِ نعمت نہ کرنا اور اب دوبارہ وہی جملہ کہ کر اگلی آیات میں ان نعمتوں کا نسبتہً تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے جو انھیں عطا ہوئی تھیں۔ تاکہ یہ تکرار ان کے جذبۂ شکر نعمت کو مہمیز کر سکے۔

بنی اسرائیل کو جو فضیلت عطا ہوئی تھی وہ یقینی طور پر اس عہد کے ساتھ مخصوص ہے جس میں وہ خدا کے نیک بندے تھے۔ ان کی قوم منتخب روزگار تھی، ان کے درمیان انبیاء، علماء اور صلحاء موجود تھے، آسمانی علم و حکمت ان کی میراث تھے اور وہ خداوند عالم کی توجہات کا مرکز بنے ہوئے تھے، لیکن اپنی بدکاریوں اور فتنہ پردازیوں کے سبب اس مقام بلند سے اتار دیئے گئے۔ اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ وہ ہر عہد میں افضل رہیں گے درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ نزول قرآن کے بعد ملت اسلامیہ ہی خیر الامم ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ "وَكُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"۔[1] یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اعلانِ فضیلت بنی اسرائیل کی مجموعی برتری کا اعلان تھا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ من جمیع الجہات ہر چیز میں دوسری قوموں سے افضل تھے اور نہ یہ ثابت ہے کہ ان کا ہر شخص دوسری قوم کے ہر شخص سے افضل تھا۔

"وَاتَّقُوا يَوْمًا الخ" اس آیہ مبارکہ میں یہودیت اور عیسائیت کے ان دعووں کی مکمل تردید ہے کہ آباؤ اجداد بخشوا لیں گے۔ یا یہ کہ کفارہ اور فدیہ کے سبب بخشے جائیں گے۔

شفاعت

مسئلہ شفاعت اسلام کے مسلّمہ عقائد میں شامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص جو شفاعت کے قابل ہو اسے وسیلہ کے ذریعہ نفع پہنچایا جائے یا اس سے ضرر کو دفع کیا جائے اس عقیدے کے منکرین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسے ماننے سے گناہوں پر جرأت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ شفاعت انسان میں فقط امید کی کرن پیدا کرتی ہے اور مایوسی سے بچاتی ہے۔ خداوندِ عالم کا غفور و رحیم ہونا بکثرت آیات قرآنی سے ثابت ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عقیدے سے گناہ پر جرأت پیدا ہوتی ہے۔

بعض وہ آیات جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا

---

[1] سورۂ آل عمران ۱۱۰

شَفَاعَةٌ“ ؎۱

”قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی اور نہ شفاعت۔“

(۲) ”مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ“ ؎۲

”ظالموں کے لیے کوئی مددگار اور لائق اطاعت شفیع نہیں ہوگا“

(۳) ”فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ“ ؎۳

”شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں فائدہ نہیں پہنچائے گی۔“

ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی قسم کی شفاعت قابل قبول نہیں ہوگی اور نہ کوئی شخص اس دن کسی کی سفارش یا مدد کا اختیار رکھے گا، اس دن سارے امور اور سارے اختیارات خداوند عالم کے دست قدرت میں ہوں گے۔ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت بھی شفاعت کی نفی کرتی ہے۔ لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو ”لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ“ (اس سے شفاعت قبول نہیں ہوگی) کا جزء خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں شفاعت کی نفی نہیں ہے بلکہ مجرم کی طرف سے پیش ہونے والی شفاعت کے قبول ہونے کی نفی ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا دوسری آیت میں مطلق شفاعت کی نفی نہیں کی گئی ہے، بلکہ ظالموں سے شفاعت کی نفی کی گئی ہے اور تیسری آیت میں شافعین کے وجود کا اظہار کرتے ہوئے یہ تلایا گیا ہے کہ مجرمین کو شافعین کی شفاعت فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

بعض وہ آیات جن میں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ”يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا“ ؎۴

”اس دن شفاعت فائدہ نہیں پہنچائے گی، مگر اسے جسے خدا اجازت دے اور اس کے لیے (شفیع کے) قول کو پسند کرے۔“

(۲) ”وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى“ ؎۵

؎۱ سورۂ بقرہ، ۲۵۴۔

؎۲ سورۂ مؤمن، ۱۸۔

؎۳ سورۂ مدثر، ۴۸۔

؎۴ سورۂ طٰہٰ، ۱۰۹۔

؎۵ سورۂ نجم، ۲۶۔

"آسمانوں میں کتنے ایسے فرشتے ہیں کہ ان کی شفاعت کسی چیز کو فائدہ نہیں پہنچائے گی مگر اس کے بعد کہ خدا اجازت دے اُس کے لیے جسے چاہے اور پسند کرے۔"

(۳) "لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" [۱]

"اس کی بارگاہ میں شفاعت فائدہ نہیں پہنچائے گی، سوائے اس کے جسے اللہ اذن دے۔"

(۴) "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى" [۲]

"اور وہ (فرشتے) سفارش نہیں کر سکتے مگر اس کی جس کے حق میں خدا پسند کرے۔"

(۵) "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" [۳]

"جنہیں لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، انہیں شفاعت کا اختیار نہیں ہے۔ فقط اسے ہے جو حق کی گواہی دیتا ہے اور یہ اسے جانتے ہیں۔"

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار (ذاتی حیثیت) سے شفاعت کا حق نہیں رکھتا بلکہ یہ حق قیامت کے دن اسے ملے گا جو اللہ کی طرف سے اذن یافتہ ہوگا اور جس کے قول سے اللہ راضی ہوگا اور اس دن فقط اسے شفاعت فائدہ پہنچائے گی جس کی شفاعت کے لیے اللہ اجازت دے دے۔

پیغمبر اکرمؐ عالم تکوین میں وسیلۂ تخلیق ہیں، عالم تشریع میں وسیلہ ہدایت ہیں اور عالم آخرت میں وسیلۂ شفاعت ہوں گے۔

"عَنْ حُسَيْنِ ابْنِ خَالِدٍ عَنِ الرِّضَا عَنْ آبَائِهٖ عَنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِحَوْضِيْ فَلَا اَوْرَدَهُ اللّٰهُ حَوْضِيْ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِشَفَاعَتِيْ فَلَا اَنَالَهُ اللّٰهُ شَفَاعَتِيْ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا شَفَاعَتِيْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِيْ" [۴]

---

[۱] سورۂ سبا، ۲۳:۳۴۔

[۲] سورہ انبیاء، ۲۸:۲۱۔

[۳] سورہ زخرف، ۸۶:۴۳۔

[۴] المیزان جلد اوّل صفحہ ۱۷۶۔

"حسین ابن خالد نے امام رضاؑ سے انھوں نے اپنے آباء و اجداد سے انھوں نے امیرالمومنینؑ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، جو میرے حوض پر ایمان نہیں رکھتا اسے اللہ حوض پر نہ پہنچائے اور جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے، پھر فرمایا میری شفاعت میری اُمت کے اہل کبائر کے لیے ہے۔"

"اِدَّخَرْتُ شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ۔" [1]

"مَیں نے اپنی اُمت کے گناہانِ کبیرہ کرنے والوں کے لیے اپنی شفاعت کو ذخیرہ کیا ہے۔"

علامہ محمد حسین طباطبائیؒ نے المیزان [2] میں اس مسئلہ کا حق ادا فرمایا ہے۔ صاحبان تحقیق مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ ہم تفصیل گفتگو کسی دوسرے مناسب موقع پر کریں گے۔

---

[1] مجمع البیان جلد اول صفحہ ۱۰۴۔

[2] المیزان جلد اول صفحہ ۱۵۹ (طبع اول)

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ
یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾
وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ
اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور جب ہم نے تم کو فرعونیوں سے نجات دلائی جو تم کو بدترین اذیّت پہنچاتے تھے کہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے ربّ کی طرف سے تمھارا سخت امتحان تھا۔

اور جب ہم نے تمھارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تم کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔

✿

اس آیۂ مبارکہ سے آیت شمارہ (۶۱) اکسٹھ تک ان نعمتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن کا ذکر اجمالی طور پر گزر چکا اور اس بیان میں دس (۱۰) نعمتیں گنوائی گئی ہیں۔ پہلی نعمت تو یہی ہے کہ انہیں فرعونیوں کے ظلم وستم سے بچایا گیا۔ بنی اسرائیل کے قتل کا یہ عمل اگر ایک طرف ان کے مصائب کی نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف ظالم کے ظلم کی شدت کا بھی مظہر ہے۔ بچوں اور لڑکوں کا قتل ایک قوم کی نسل کشی ہے جو بھیانک جرم ہے اور اتنا ہی بھیانک جرم اپنی منفعت کے لیے عورتوں کو زندہ رکھنا بھی ہے۔ توریت کے وقائع نگار نے ان حالات کو یوں بیان کیا ہے:۔

تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا دیکھو اسرائیل ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں اس لیے انہوں نے بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر ان کو ستائیں سو انہوں نے فرعون کے لیے ذخیرہ کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے۔ پر انہوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور پھیلتے گئے اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکرمند ہو گئے اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کر کے ان سے کام کرایا اور انہوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لیکر ان کی زندگی تلخ کی، ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں [1]

تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے جن میں ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا فوعہ تھا باتیں کیں اور کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔[2]

قوم عمالقہ کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا، جیسا کہ شاہان روم کا لقب قیصر، شاہان ایران کا کسریٰ اور شاہان ترکیہ کا لقب خاقان تھا۔ لفظ فرعون قرآن مجید میں چوہتر (۷۴) مرتبہ استعمال ہوا ہے بعض مؤرخین ومحققین کا خیال ہے کہ وہ فرعون جو بنی اسرائیل کو اذیت دیتا تھا اور قتل کرتا تھا، وہ رعمسیس دوم تھا اور

---

[1] کتاب خروج باب یکم فقرات ۸ سے ۱۴۔

[2] کتاب خروج باب یکم فقرات ۱۵، ۱۶۔

موسیٰ علیہ السلام جس کی طرف مبعوث ہوئے تھے، وہ اس کا لڑکا منفتاح تھا جو اپنے لشکر سمیت بحر احمر میں غرق ہو گیا۔ منفتاح الوہیت و ربوبیت کا مدعی تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

"قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ" [1]

"فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ اگر میرے علاوہ کوئی خدا مانا تو میں تم کو قیدیوں میں داخل کر دوں گا۔"

"فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ" [2]

"پس فرعون نے کہا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔"

موسیٰ علیہ السلام جب پانی سے نکالے گئے تو زنِ فرعون نے باصرار تمام فرعون کو ان کے قتل سے باز رکھا۔ اس طرح آپ نے اسی کے گھر میں پرورش پائی۔ سورۂ قصص کے آغاز میں کچھ تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔ منفتاح کا جسد دوسرے اجساد کے ساتھ منتخب دوم کے مقبرہ سے برآمد ہوا اور آج قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور یوں قرآن مجید کے اس بیان کا اعجاز ہم پر آشکار ہوا۔

"فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً" [3]

"سو آج تیرے بدن کو ہم (غرقابی سے) بچا لیں گے، تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بن جائے۔"

بنی اسرائیل کا وہ سخت امتحان کیا تھا جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے دو قول بیان کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ فرعونیوں سے نجات دلانا بنی اسرائیل کا سخت امتحان تھا، دوسرا یہ کہ وہ سخت امتحان فرعونیوں کا بنی اسرائیل پر ظلم و ستم کرنا تھا، پہلے قول پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ مظالم سے نجات دلانا ایک اچھا عمل تھا جو خود بنی اسرائیل کی نظر میں پسندیدہ تھا تو اسے اللہ نے کس رُخ سے امتحان قرار دیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ قرآن مجید نے امتحان کے سلسلے میں یہ اصول دیا ہے کہ اللہ نیکی اور بدی دونوں کے ذریعہ امتحان لیتا ہے۔

"وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" [4]

"اور ہم بُری اور اچھی حالتوں کے ذریعہ تمہارا امتحان لیتے ہیں۔"

---

[1] سورۂ شعراء ۲۹۔

[2] سورۂ نازعات ۲۴۔

[3] سورۂ یونس ۹۲۔

[4] سورۂ انبیاء ۳۵۔

خود بنی اسرائیل کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ" [۱]

"اور ہم نے ان کی اچھائیوں اور برائیوں سے آزمائش کی تاکہ یہ رجوع کریں۔"

دوسرے قول پر یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ فرعونیوں کی ایذار دہی کو اللہ نے بطور امتحان اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے فرعونیوں کو جو مہلت عطا کی تھی اس مہلت کو سبب قرار دے کر اسے اپنا امتحان فرمایا ہے اور مہلت دینا اس کا ایک قانون ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

"وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ" [۲]

"اور کافر یہ گمان نہ کریں کہ ہم جو انہیں ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے ہم انہیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ ان کے گناہ زیادہ ہوں اور ان کے لیے ذلت والا عذاب ہے۔"

بلاء کے معنی اگرچہ امتحان کے ہیں لیکن ماہرین لغت نے اس کا ایک معنی انعام بھی لکھا ہے (لسان العرب) اس اعتبار سے "وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ" کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "اور اس میں تمہارے رب کی جانب سے بہت بڑا انعام تھا" صاحب تفسیر صافی نے آیۂ زیر بحث میں اسی قول کو پسند فرمایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپ کے حکم پر موسیٰ علیہ السلام جو فرعون اور آل فرعون کے مظالم سے تنگ تھے اپنے آبائی وطن کنعان واپس جانے کے لیے آمادہ سفر ہوئے، جناب موسیٰ علیہ السلام انہیں ساتھ لے کر رات کے آخری حصہ میں (قریب صبح) سرزمین مصر کے اس شہر سے نکلے جو فرعون کا دارالحکومت تھا (بعض محققین کی نگاہ میں اس کا نام تل ابی سلیمان وادیٔ ثمیلات تھا) فرعون نے خبر پاتے ہی اس کا تعاقب شروع کیا اور ایک ایسے مقام پر انہیں جا لیا جہاں آگے سمندر تھا، بنی اسرائیل گھبرائے اور پریشان ہوئے۔ قرآن نے فرمایا ہے:

"فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" [۳]

---

[۱] سورۂ اعراف، ۱۶۸۔

[۲] سورہ آل عمران، ۱۷۸۔

[۳] سورہ شعراء، ۶۱/۶۲۔

"جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اصحاب موسیٰ نے کہا ہم یقیناً پکڑے جائیں گے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں، میرا خدا میرے ساتھ ہے وہ میری رہنمائی کرے گا۔"

اتنے میں موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی :۔

"فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝" [1]

"پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو سمندر پر مار دپس سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر حصّہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح تھا اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی قریب کر دیا اور ہم نے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں سب کو نجات دے دی پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔"

اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عصا مارتے ہی سمندر پھٹ گیا اور بنی اسرائیل موسیٰ کی قیادت میں سمندر کے اندر پیدا شدہ خشک راستے سے گزر گئے ان کے گزرنے کے بعد فرعون اپنے لشکر کے ساتھ اس راستے میں داخل ہوا، پھٹا سمندر جو پہاڑوں کی طرح داہنے بائیں کھڑا ہوا تھا پھر مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے غرق ہو گیا وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ کا جُز بتلاتا ہے کہ غرقابی کا یہ واقعہ بنی اسرائیل سے اتنا قریب ہوا کہ وہ اسے دیکھ رہے تھے بعض مورخین کے قول کے مطابق یہ واقعہ طوفانِ نوح کے ایک ہزار پانچ سو ستاسی (۱۵۸۷) برس بعد پیش آیا۔

توریت کے وقائع نگار نے اس صورتِ حال کی منظر کشی اس طرح کی ہے "اور خداوند خدا نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اُٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصّے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔" (فقرات ۱۵/۱۶) "پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تیز پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصّے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے۔" (فقرات ۲۱/۲۲/۲۳) "اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور مصری اُلٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں

---

[1] سورۂ شعراء ۶۳/۶۴/۶۵/۶۶۔

گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا[1] (فقرات ۲۷/۲۸/۲۹)

وہ پانی جسے بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا، اس کے سلسلے میں مفسرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ دریائے نیل تھا لیکن یہ خیال اس لیے درست نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کو کنعان جانا تھا، جو مغرب میں واقع تھا جب کہ دریائے نیل مقام روانگی سے مشرق میں تھا لہٰذا مغرب کی طرف جانے کے لیے مشرق کا سفر اختیار کرنا کسی طرح بھی معقول نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بیشتر مفسرین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ خلیج سویز کے پانی کو عبور فرما کر جزیرۂ نمائے سینا میں داخل ہوئے تھے۔ اس کی تائید مزید ان حوالوں سے ہوتی ہے جو توریت میں اس سفر کی منازل سے متعلق ہیں[2]

تفسیر نویسوں کے ایک گروہ نے بنی اسرائیل کے نکل جانے اور فرعونیوں کے غرق کو جذر و مد کا کرشمہ قرار دیا ہے کہ جذر کی حالت میں قوم موسیٰ نے اس پانی کو عبور کر لیا اور مد کی حالت پیدا ہونے پر فرعون اپنے لشکر کے ساتھ غرق ہو گیا۔ لیکن اس آیۂ مبارکہ کا صریحی بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ نے بطور معجزہ سمندر کو عصائے موسیٰ کی ضرب سے شگافتہ فرما دیا تھا۔ مزید معلومات کے لیے سورۂ طٰہٰ (۷۷)، سورۂ شعراء (۶۳) اور سورۂ دخان (۲۴) کا مطالعہ مفید ہو گا۔ میں پوری توجہ اور کوشش کے باوجود یہ نہ سمجھ سکا کہ مفسرین جو قرآن مجید کو کلام الٰہی مانتے ہیں اور اللہ کو قادرِ مطلق سمجھتے ہیں، وہ اس واقعہ کی توجیہ کے لیے طبیعی عوامل کا سہارا کیوں لیتے ہیں؟ کیا سمندر کا پھٹ جانا اللہ کی قدرت کی دسترس سے باہر ہے؟

آلِ فرعون

بیشتر مفسرین اور ماہرین لغت کی رُو سے آل اور اہل درحقیقت ایک ہیں اور اس کی دلیل آل کی تصغیر اُہَیل ہے۔ چونکہ ہائے ہوز اور الف قریب المخرج ہیں اس لیے ہا کو الف سے بدل دیا گیا ہے، البتہ ان دونوں لفظوں کے استعمال میں فرق ہے۔ اہل عام ہے اور آل خاص ہے۔ یہی سبب ہے اہل الکوفۃ اور اہل البصرۃ بولا جاتا ہے۔ لیکن آل الکوفۃ اور آل البصرۃ استعمال نہیں ہوتا۔ آل فقط شرفاء معززین اور خواص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ دینی بزرگی کے حامل ہوں یا دنیوی کے مثلاً آل اللہ۔

---

[1] کتاب خروج باب ۱۴۔

[2] کتاب خروج باب ۱۲ فقرات ۷ سے آخر تک، باب ۱۴ فقرات ۱ سے ۹ تک گنتی باب ۳۳ فقرات ۱ سے ۸ تک۔

قرآن مجید سے بھی آل اور اہل کا متحد المعنی ہونا ثابت ہے۔ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا "فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ" [1] (تم اپنے اہل کو لے کر کچھ رات سے نکل جاؤ) دوسرے مقام پر اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے: اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ [2] (مگر ہم نے آلِ لوط کو صبح ہوتے ہوتے نجات دے دی۔)

جب لفظ آل کسی شخص کی طرف مضاف ہو تو اس سے اس کی قوم نہیں بلکہ ذریت مراد ہوتی ہے اور یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ [3]۔ (اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو سارے جہانوں سے چن لیا ہے) اس آیۂ مبارکہ میں دو انسانوں اور دو گروہوں کے اصطفاء کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ آلِ عمران آلِ ابراہیم میں داخل ہیں، لیکن شرافت و بزرگی کے اظہار کے لیے ان کا تذکرہ علیحدہ کیا گیا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آلِ ابراہیم کا اصطفاء، ہدایت و نبوّت کے لیے ہوا ہے۔ اب یہ آلِ ابراہیم کون ہیں؛ اسے سمجھنے کے لیے اس آیۂ مبارکہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ [4] (اور جب ابراہیم کا ان کے ربّ نے چند باتوں سے امتحان لیا اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کیا تو کہا کہ میں تمہیں انسانوں کا امام بنا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میری ذریّت میں سے کہا کہ میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا) اس دعا میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لیے منصب ہدایت مانگا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن نے آلِ ابراہیم کہا ہے اور ان کے مصطفیٰ ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اگر اس سے ذریت کی جگہ اُمّت مراد ہوتی تو فقط بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل میں سے اصطفاء نہ ہوتا، بلکہ اُمّت ابراہیم سے بھی ہوتا۔ اسی طرح سورۃ نساء (۵۴) میں آلِ ابراہیم کو کتاب حکمت اور ملک عظیم دینے کی خبر دی گئی ہے اور یہ تینوں چیزیں فقط ذریّت ابراہیمی کے لیے ثابت ہیں۔ اسی طرح سورۂ یوسف (۶) میں آلِ یعقوب سے مراد ذریّت یعقوب ہے اس لیے کہ نبوّت ذریتِ یعقوب کو دی گئی تھی اُمّت یعقوب میں سے کسی کو نہیں ملی۔

بعض روایات سے بھی اُمّت اور آل کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے: عَنْ عَائِشَةَ ثُمَّ

---

[1] سُورۂ ہُود۔ ۸۱۔

[2] سُورۂ قمر۔ ۳۴۔

[3] سورۂ آلِ عمران ۳۳۔

[4] سُورۂ بقرہ ۱۲۴۔

قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ[1] (حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسُول اکرمؐ نے وقت ذبح فرمایا بسم اللہ اے اللہ اسے محمدؐ، آلِ محمد اور اُمّت محمدؐ کی جانب سے قبول فرما)۔ عَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ابْنِ رَبِیْعَةٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِیَ اَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ (رواہ مسلم)[2] (پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ صدقات انسانوں کا میل ہیں اور یہ نہ محمدؐ کے لیے حلال ہیں اور نہ آلِ محمد کے لیے۔ اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے)۔

پہلی روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر آل اور اُمّت مترادف ہیں تو ان دونوں میں سے ایک لفظ غیر ضروری ہوگا۔ اور اگر آل سے مراد متبعین ہوں اور امت سے مراد منکرین و متبعین دونوں ہوں تو رسُولِ اکرمؐ کی یہ قربانی منکرین کی طرف سے بھی قرار پائے گی۔ دوسری روایت کی روشنی میں صدقہ آلِ محمد پر حرام ہے۔ جب کہ سب جانتے ہیں۔ کہ یہی صدقہ اُمّت محمد پر حلال ہے۔

اس مختصر سے جائزہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ چونکہ اشرافِ مملکتِ فرعون میں بیشتر لوگ اس کے خاندان ہی کے تھے لہٰذا اصالۃً ان کا ذکر کیا گیا ہے اور بالتبع سارے متبعین فرعون کو مراد لیا گیا ہے۔ جیسا کہ لفظ جند[3] سے دوسرے مقام پر وضاحت بھی فرما دی گئی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ثانی صفحہ ۱۵۶۔

[2] مشکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۴۳۔

[3] سورۂ دخان ۲۴۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور جب ہم نے مُوسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا پھر
تم نے ان کے (جانے کے) بعد بچھڑے کو (خدا) بنا
لیا حالانکہ تم ظلم کر رہے تھے۔
پھر ہم نے اس کے بعد بھی تمھیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر
بجا لاؤ۔

حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کا نام قرآن میں ایک سو چھتیس (۱۳۶) مرتبہ استعمال ہُوا ہے اور ان کا تذکرہ کثرت کے ساتھ مختلف سُورتوں میں کیا گیا ہے، جس کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

بقرہ (مدنی) ۴۵ سے ۵۵ اور ۵۸ / ۵۹ / ۶۳ سے ۶۹ اور ۸۲ / ۸۷ / ۸۸۔
۲۴۸ سے ۲۵۰۔

نسار (مدنی) ۱۵۴ / ۱۵۵ / ۱۶۳ مائدہ (مدنی) ۲۴ سے ۳۰۔

انعام (مدنی) ۱۵۶/۹۲	شعراء (مکی) ۱۰ سے ۶۹
اعراف (مکی) ۹۹ سے ۱۵۶ اور ۱۶۱	نمل (مکی) ۸ سے ۱۵
یونس (مکی) ۷۷ سے ۹۳	قصص (مکی) ۳ سے ۴۴
ہُود (مکی) ۱۰۰ سے ۱۰۴	عنکبوت (مکی) ۴۰/۳۹
ابراہیم (مکی) ۶ سے ۹	سجدہ (مکی) ۲۴
بنی اسرائیل (مکی) ۱۰۴ سے ۱۰۷	صافات (مکی) ۱۱۵ سے ۱۲۳
کہف (مکی) ۶۰ سے ۸۱	مؤمن (مکی) ۲۵ سے ۵۰ اور ۵۶
مریم (مکی) ۵۴/۵۳	فصّلت (مکی) ۴۶
طٰہٰ (مکی) ۹ / ۵۵ اور ۶۰ سے ۷۶	زخرف (مکی) ۴۶ سے ۵۷
اور ۸۰ سے ۱۰۲	دخان (مکی) ۱۷ سے ۳۸
انبیاء (مکی) ۹۰	ذاریات (مکی) ۳۸ سے ۴۰
حج (مدنی) ۲۴	نازعات (مکی) ۱۵ سے ۲۶ [1]
مؤمنون (مکی) ۴۸ سے ۵۲	

مُوسیٰ عبرانی لفظ ہے اکثر مفسرین کے خیال میں یہ دو لفظوں سے مرکب ہے مُوْ کے معنی پانی کے ہیں اور سیٰ کے معنی درخت کے ہیں۔ ماہرینِ لُغت کا بھی یہی خیال ہے (قاموس، لسان العرب) توریت میں مُوسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور خانۂ فرعون تک پہنچنے کی رُوداد بیان کرنے کے بعد وجہ تسمیہ پر یُوں روشنی ڈالی گئی ہے "جب بچہ کچھ بڑا ہُوا تو وہ اسے فرعون کی بیٹی کے پاس لے گئی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اس نے اس کا نام مُوسیٰ یہ کہہ کر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا" [2]

حضرت مُوسیٰ سبطِ لاوی میں سے ہیں۔ حضرت یعقوب کے بیٹوں کی نسل سبط کہلاتی ہے اور اس کی جمع اسباط ہے جو قرآن مجید میں پانچ جگہوں پر استعمال ہوئی ہے۔ لاوی حضرت یعقوب کا ایک بیٹا ہے اس کی نسل میں حضرت مُوسیٰ علیہ السلام پیدا ہُوئے ہیں۔ اسرائیلی ادب میں آپ کا شجرہ یُوں ہے مُوسیٰ ابن عمرام بن قہات بن لاوی بن یعقوب [3]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] توریت میں بھی آپ کا تذکرہ بہت تفصیل کے ساتھ ہے کتاب خروج، کتاب احبار، کتاب گنتی اور کتاب استثناء آپ کے تفصیلی واقعات کی آئینہ دار ہیں۔

[2] کتاب خروج باب ۲ فقرہ ۱۰۔

[3] کتاب خروج باب ۶ کتاب اعداد باب ۲۶۔

قرآن مجید میں جناب موسیٰ کے والد کا نام مذکور نہیں ہے، لیکن توراۃ میں عمرام اور اسلامی روایات میں عمران بیان کیا گیا ہے آپ کی والدہ کا اسم گرامی توریت میں یوکابدؔ[1] اور اسلامی روایات میں یوخائیل اور یوکائیل وغیرہ بیان ہوا ہے۔ توریت نے آپ کی تاریخ وفات پر گفتگو نہیں کی ہے۔ لیکن بعض مورخین نے آپ کی وفات کا زمانہ ۱۵۲۵ قبل مسیح کے قریب تبلایا ہے اور ولادت کا زمانہ ۱۶۰۵ ق م سے ۱۶۴۵ ق م کے درمیان قرار دیا ہے۔ بعض محققین کی نگاہ میں آپ کا عہد مبارک تقریباً تیرہ سو سال قبل مسیح قرار پاتا ہے اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ آپ کے عہد کا بادشاہ عمسیس ثانی ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح کی شخصیت ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآن میں سارے انبیاء سے زیادہ ہے۔ اس کا بظاہر ایک سبب تو یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں معیشت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لینے کے باعث یہودی اس معاشرہ میں اچھا اثر و نفوذ رکھتے تھے اور انہیں متوجہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ موسیٰ اور اُن کی قوم کا تذکرہ کیا جائے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ قرآن مجید نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مثیل موسیٰ[2] قرار دیا ہے اس لیے ان کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں تاکہ مماثلت کے خطوط واضح ہوسکیں اور اُمت اسلامیہ اس ذکر سے علم اور عبرت دونوں حاصل کر سکے۔

زیر بحث آیات کا پس منظر یہ ہے کہ فرعون اور اہل فرعون سے نجات حاصل کرنے کے بعد جب موسیٰ اپنی قوم کو لے کر صحرائے سینا میں داخل ہوئے تو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم سے دور ہو کر ایک مقام پر دُعا و مناجات میں مشغول ہوں تاکہ انھیں ایسی شریعت عطا کی جائے، جو بنی اسرائیل کے لیے مکمل نظام زندگی ہو۔ موسیٰ کی اس غیبت کے دوران قوم میں جو واقعہ رونما ہوا اسے قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ (اعراف ۱۴۲)

اور ہم نے موسیٰ کے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا اور اس کو دس سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا میری قوم میں میری نیابت کرو اور اصلاح کرو اور فساد کرنے والوں کی راہ کی پیروی

---

[1] کتاب گنتی باب ۲۶ فقرہ ۵۹۔

[2] سورۃ الاعراف ۱۴۱۔

نہ کرنا۔

"وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًاۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا یا ، ایسا جسم جس سے گائے کی آواز نکلتی تھی کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا نہ ان کو راہ کی ہدایت کرتا ہے اسے (خدا) بنالیا حالانکہ وہ ظلم کر رہے تھے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًاۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ [۱]

"اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضب ناک اور افسوس کناں پلٹے کہا میرے پیچھے تم لوگوں نے میری بُری نیابت کی کیا تم نے اپنے رب کے امر میں جلدی کی اور تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچا اس نے کہا، ماں جائے قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔ تو دشمنوں کو مجھ پر مت ہنساؤ اور مجھے ظالم لوگوں میں شمار نہ کرو۔"

ایک اور مقام پر اس واقعہ کی تفصیلات یوں بیان ہوئی ہیں۔

"قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ [۲]

"(اللہ نے) کہا کہ ہم نے تمہارے بعد تمہاری قوم کا امتحان لیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔"

"فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًاۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًاؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

---

[۱] سورۂ اعراف، ۱۴۲/۱۴۸/۱۵۰۔ [۲] سورۂ طٰہٰ ۸۵، ۸۶۔

" تو موسیٰ غضب ناک اور افسوس کناں اپنی قوم کی طرف پلٹے اور کہنے لگے کہ اے قوم والو کیا تم سے تمہارے رب نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا تو کیا تم کو وعدہ کی مدت لمبی معلوم ہوئی یا تمہاری خواہش یہ ہے کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو تم نے تو میرے وعدہ کے خلاف کیا۔"

" قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

" اُنھوں نے کہا ہم نے اپنے اختیار سے تمہارے وعدے کو نہیں توڑا بلکہ قوم (فرعون) کے زیوروں کا بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تو ہم نے اسے (آگ میں) ڈال دیا اور اسی طرح سامری نے بھی ڈال دیا۔"

" فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

" پھر اس نے لوگوں کے لیے ایک بچھڑا نکالا جو بُت تھا اور اس کی آواز گائے کی تھی پھر لوگ کہنے لگے کہ یہی تمہارا رب اور موسیٰ کا رب ہے۔ اور وہ (موسیٰ) بھول کر گیا ہے۔"

" اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

" کیا انہیں اتنا بھی نہیں سوجھتا کہ وہ ان کی بات کا پلٹ کر جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ ان کے نفع نقصان کا مالک ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

" اور ہارون نے تو پہلے ہی ان سے کہا تھا کہ اے قوم اس کے ذریعہ تمہاری آزمائش ہو رہی ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے تو میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔"

" قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ "

" کہنے لگے ہم تو اسی (کی پرستش) پر جمے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آئے۔"

" قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾

(موسیٰ نے کہا اے ہارون جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو گئے تو کیا بات مانع ہوئی۔"

"اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِیْ ﴿۹۳﴾
"کہ تم نے میری پیروی نہ کی کیا تم نے میرے حکم سے نافرمانی کی۔"
"قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ
فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ" ﴿۹۴﴾ [۱]

"(ہارون نے) کہا اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو، میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں یہ نہ کہو کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا پاس نہ کیا۔"

توریت نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

اور موسیٰ گھٹا کے بیچ میں ہو کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہ پہاڑ پر چالیس دن اور چالیس رات رہا۔[۲]
اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے کہ اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔[۳] تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا، کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال کر لایا بگڑ گئے ہیں اور وہ اس راہ سے جس کا میں نے ان کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں، انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔[۴] اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں ہاتھ میں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں[۵] اور لشکر گاہ کے نزدیک آ کر اس نے وہ بچھڑا اور ان کا ناچنا دیکھا، تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں میں سے پٹک دیا اور ان کو پہاڑ کے

---

[۱] سورۂ طٰہٰ ۸۵ تا ۹۴
[۲] خروج باب ۲۴ فقرہ ۱۸۔
[۳] خروج باب ۳۲ فقرہ ۱/۴۔
[۴] خروج باب ۳۲ فقرات ۷/۸
[۵] حوالۂ مذکورہ فقرہ ۱۵۔

نیچے توڑ ڈالا اور اس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا اور اس کو آگ میں جلایا اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اسی میں سے بنی اسرائیل کو پلوایا اور موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تیرے ساتھ کیا کیا تھا جو تو نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں پھنسا دیا۔ ہارون نے کہا میرے مالک کا غضب نہ بھڑکے تو ان لوگوں کو جانتا ہے کہ بدی پر تلے رہتے ہیں۔ چنانچہ انھیں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس آدمی موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ جس جس کے ہاں سونا ہو وہ اسے اتار لائے، پس انہوں نے اسے مجھ کو دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا تو یہ بچھڑا نکلا [1]

زیرِ تحریر آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ سے خدا کا وعدہ چالیس راتوں [2] کا تھا جب کہ سورۂ اعراف میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ وعدہ تیس راتوں کا تھا اور اسے دس راتوں کے اضافے سے مکمل کیا گیا [3] تیس راتوں کا وعدہ تھا، پھر یہ چالیس راتوں کا کیسے ہو گیا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ علم الٰہی میں چالیس راتوں ہی کا وعدہ تھا جیسا کہ "فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً" [4] سے واضح ہے لیکن بنی اسرائیل کو تیس راتیں ہی بتلائی گئی تھیں۔ جب وہ مدت پوری ہو گئی اور موسیٰ نہ پلٹے تو وہ لوگ گمراہ ہو گئے اس طرح بنی اسرائیل کے استحکام عقیدہ اور استقامتِ دینی کا امتحان لیا گیا جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ خروج باب ۳۲ کے پہلے فقرہ میں "دیر لگائی" خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوم موسیٰ کے علم میں تیس راتیں ہی تھیں، جب کہ وعدہ چالیس راتوں کا تھا۔

اعراف مکّی سورہ ہے جو بقرہ سے قبل نازل ہوا ہے اس میں وعدہ کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے بقرہ میں مجموعی مدت کے بیان پر اکتفا کیا گیا۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمی جلد دوم (سورۂ طٰہٰ)

---

[1] حوالۂ مذکور فقرہ ۱۹-۲۴۔

[2] توریت نے چالیس دن اور چالیس رات لکھا ہے۔ جب کہ قرآن مجید نے فقط چالیس رات کہا ہے، ظاہر ہے کہ ان چالیس راتوں میں چالیس دن بھی شامل ہیں، لیکن مناجات و دعا، تضرع و زاری اور عبادات کا تعلق چونکہ رات سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے فقط رات ہی کا تذکرہ کیا گیا۔

[3] بعض مفسرین نے تیس اور چالیس راتوں میں تطابق کی یہ صورت نکالی ہے کہ ابتداءً وعدہ تیس ہی راتوں کا تھا، لیکن چونکہ موسیٰ علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے طور پر پہنچ گئے تھے، لہٰذا اللہ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے، علم کلام کی اصطلاح میں ایسے موارد کو بدا کہا جاتا ہے۔

[4] اعراف ۱۴۲۔

میں بنی اسرائیل کے مذکورہ امتحان کی وضاحت ملتی ہے، اور صاحب مجمع البیان نے امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ:

"اِنَّ مُوْسٰی قَالَ لِقَوْمِہٖ اِنِّیْ اَتَاَخَّرُ عَنْکُمْ ثَلَاثِیْنَ یَوْمًا"[1]

"موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تیس دن تم سے دور رہوں گا"

پھر تحریر فرمایا ہے کہ تیس دنوں پر دس کا اضافہ خلاف وعدہ نہیں ہے اس لیے کہ اگر موسیٰ نے چالیس راتیں قوم سے دور گزاریں تو تیس راتیں بہرحال اس میں شامل ہیں۔

ادھر موسیٰ کی غیبت تیس راتوں سے اوپر بڑھی اور ادھر بنی اسرائیل میں خلفشار پیدا ہوگیا سامری نے زیورات جمع کیے اور انھیں پگھلا کر ایک گوسالہ بنایا، جس میں سے گائے کی آواز آتی تھی (غالباً یہ آواز کسی ایسے عمل کا نتیجہ تھی جو ہوا کے دباؤ سے اس میں رونما ہوتا تھا)۔ گوسالہ کے تیار ہونے پر لوگ اس کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اگرچہ حضرت ہارون نے اس کی مخالفت کی اور قوم کو منع کیا لیکن انہوں نے کہا کہ ہم موسیٰ کے آنے تک اس کی عبادت کریں گے۔ خدا نے طور پر موسیٰ کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور انہوں نے واپس آنے کے بعد قوم سے شدید ترین ناراضگی کا اظہار کیا اور ہارون سے سختی سے بازپرس کی، انہوں نے معقول جواب دیا، پھر موسیٰ نے سامری سے گفتگو کی اور اس کے لیے سزا تجویز کی۔

آیاتِ مذکورہ سے واضح طور پر یہ ثابت ہے کہ ہارون اس امر میں شریک نہ تھے نہ انھوں نے گوسالہ بنایا نہ اس کی پرستش کی اور نہ دوسروں کو اس بات پر آمادہ کیا، بلکہ یہ عمل موسیٰ کی قوم کے ایک شخص سامری کا تھا۔ ہارون کا خاموش رہنا فقط اس سبب سے تھا کہ اگر وہ شدت سے مخالفت کرتے تو لوگ انھیں قتل کر دیتے۔ ان کا یہ سکوت تقیہ کا ایک درجہ تھا۔

یہ بھی غلط ہے کہ موسیٰ نے توریت کی تختیاں توڑ ڈالیں اس لیے کہ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ[2] (اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے تختیاں اٹھالیں) اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے تختیوں کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔

"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ"

"پھر ہم نے اس کے بعد بھی تمھیں معاف کر دیا"

---

[1] مجمع البیان جلد اوّل صفحہ ۱۱۶۔

[2] اعراف ۱۵۴۔

مختلف تفسیروں (خصوصاً مجمع البیان) کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس اجتماعی گناہ کی اجتماعی مغفرت کا بیان ہے جو طریقۂ توبہ پر عمل کرنے کے بعد ان کے شامل حال ہوگیا (وہ طریقۂ توبہ آگے بیان ہوگا)۔ اس مغفرت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ہر اسرائیلی کا ہر گناہ معاف کر دیا گیا ہے یہ مغفرت اللہ کی ایک بڑی نعمت تھی جو اسرائیلیوں کے شامل حال ہوئی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ شکر گزار بندے بن جائیں۔

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے مُوسیٰ کو کتاب عطا کی اور فرقان تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

کتاب سے مراد توریت ہے۔ اگر کتاب و فرقان کے عطف کو تفسیری قرار دیا جائے، تو توریت ہی فرقان قرار پائے گی ورنہ بصُورت دیگر اس سے وہ معجزات مراد ہوں گے جو مُوسیٰ علیہ السلام کو عطا ہُوئے تھے۔ اس لفظ کی توانائی اور وسعت کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف جہات پر نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں سات موقعوں پر استعمال ہُوا ہے۔ بقرہ ۱۸۵/۵۳، آل عمران ۴، انفال ۲۹، ۴۱/ ، انبیاء ۴۸، فرقان ۱۔

فرقان مصدر ہے جس کا مفہوم ہے فرق کرنا۔ پھر یہ لفظ فرق کرنے والے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا اور ہر فرق کرنے والا فرقان کہا جانے لگا جیسے قرآن کو فرقان اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے (مجمع البیان) دوسرے ماہرین لغت نے فرقان کے لفظ میں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کو شرط قرار دیا ہے (قاموس، اقرب الموارد وغیرہ)

قرآن مجید میں اس کے استعمال کی صُورت یہ ہے کہ:

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا۔[1]
اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقوٰی اختیار کرو تو وہ تمہارے لیے فرقان قرار دے گا۔

---

[1] انفال ۲۹۔

۲) "وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ط" ۱؎
"اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فرقان کے دن نازل کیا جس دن دو گروہ ٹکرائے"۔

۳) تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ ۲؎
"بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ عالمین کے لیے ڈرانے والا بن جائے"۔

۴) "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" ۳؎
" اور ہم نے مُوسیٰ اور ہارُون کو فرقان دیا اور روشنی اور نصیحت متقین کے لیے"۔

پہلی آیت میں فرقان کی تفسیر میں فتح و نصرت اور ہدایت و نور وغیرہ مراد لیے گئے ہیں اس کے مفہوم کی تعیین اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ جو شے بھی ہو، تقوٰے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی بصیرت مراد ہوگی جو حق و باطل میں تمیز پیدا کر سکے۔ دوسری آیت میں جنگِ بدر کو فرقان کہا گیا ہے یعنی اس دن ایسی باتیں ظہور پذیر ہوئیں، جنہوں نے حق و باطل میں فرق کر دیا، تیسری آیت میں پُورے قرآن کو فرقان کہا گیا ہے اور چوتھی آیت میں مُوسیٰ اور ہارُون پر فرقان کے اُترنے کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سارے استعمالات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس لفظ سے مراد مندرجہ ذیل چیزیں ہیں:۔

حق و باطل میں تمیز کرنے والی قوت۔
حق و باطل کو الگ کر دینے والی چیز۔
نورِ بصیرت جو تقوٰے کے اثر سے پیدا ہو۔
قرآن۔
انبیاء و مرسلین پر نازل ہونے والی کتابیں۔
انبیاء و مرسلین پر کتابوں کے علاوہ نازل ہونے والی وحی۔
وہ قوتِ استدلال جو صحیح نتیجہ تک پہنچا دے۔
مُوسیٰ علیہ السّلام کو عطا ہونے والے فرقان میں قرآن کے علاوہ مذکورہ ہر مفہوم اپنی پوری وسعت

۱؎ انفال، ۴۱۔
۲؎ فرقان، ۱۔
۳؎ انبیاء، ۴۸۔

کے ساتھ شامل ہے۔

احادیث ائمہؑ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محکم و متشابہ سمیت پُوری کتاب قرآن ہے اور فرقان فقط وہ محکمات ہیں جو واجب العمل ہیں[1] صحیفہ سجادیہ میں دُعائے ختم قرآن میں یہ مذکور ہے۔

" وَفُرْقَانًا فَرَقْتَ بِهٖ بَيْنَ حَلَالِكَ وَحَرَامِكَ وَقُرْآنًا اَعْرَبْتَ بِهٖ عَنْ شَرَائِعِ اَحْكَامِكَ "

" اس کتاب میں کہ جس کا نام فرقان بھی ہے تو نے حلال و حرام کے درمیان فرق قرار دیا اور اسی کتاب میں جس کا نام قرآن بھی ہے تو نے اپنے احکام شریعت کو بیان فرمایا۔"

یہ سوال غور طلب ہے کہ جب اللہ نے پُورے قرآن کو فرقان کہا ہے تو اس کے مقابل صرف محکمات کو فرقان قرار دینے کا مطلب کیا ہے؟ اس کے بہت سے جوابات ہیں۔ صرف ایک پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پورا قرآن ان لوگوں کے لیے فرقان ہے جو وارثانِ کتاب ہیں، جیسا کہ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ[2] کی روشنی میں پُورا قرآن صرف ان لوگوں ہی کے لیے محکم ہے جو وارثانِ کتاب ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] روایت امام جعفر صادق علیہ السلام در اصول کافی بحوالہ نشر طوبیٰ جلد دوم صفحہ ۲۵۶۔

[2] سُورۂ ہُود، ۱۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بیشک تم لوگوں نے بچھڑے کو (خدا) بنا کر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے، سو اپنے خالق سے توبہ کرو اس طرح کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر یہی ہے پس اس نے تمہاری توبہ قبول کی وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

جس وقت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہو رہی تھی اس وقت صحرائے سینا میں ان کی قوم گوسالہ پرستی کے شرک میں مبتلا تھی۔ شرک قرآن کی نگاہ میں دنیا کا سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ ظلم اس وقت ہو رہا تھا جب موسیٰ خدائے واحد کی بارگاہ میں پہنچ کر اپنی قوم کے لیے ہدایت کی تحریری دستاویز حاصل

کر رہے تھے۔ اس ظلم کا اظہار آیت ۵۱ میں وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ کہہ کر کیا گیا تھا اور اس ظلم کا ذکر موسیٰ نے واپس آنے کے بعد کیا کہ تم لوگوں نے بچھڑے کو خدا بنا کر اپنے ساتھ اور اصل توحید (دونوں) کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ اب اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو۔

اس آیت میں مفسرین نے قتل النفس کی بہت سی توجیہیں بیان کی ہیں، بعض کے خیال میں یہ نفس کشی کا حکم تھا، کسی کی رائے میں اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو شدت کے ساتھ اعتراف گناہ پر پابند کرو اور کسی نے یہ تحریر کیا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے نفسوں کو مجبور کرو کہ وہ اطاعتِ الٰہی میں شدت اور مبالغہ سے کام لیں۔ الغرض اس حکم سے مفسرین کی ایک جماعت نے خواہشاتِ نفس کو مارنا، مجاہدہ، ریاضت اور اماطہ الشہوات وغیرہ کا مفہوم مراد لیا ہے۔ یہ اصول سب جانتے ہیں کہ لفظ کو حقیقی معنی سے اس وقت مجازی معنی کی طرف منتقل کیا جاتا ہے جب حقیقی معنی درست نہ قرار پاتے ہوں، یہاں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ قتل کو قتل ہی کے معنی میں مراد نہ لیا جا سکے۔ جب کہ توریت میں قتل اور سنگساری کو شرک کی سزا بتلایا گیا ہے[1] اور اسلام میں بھی ارتداد کی سزا میں قتل کو ہی رکھا گیا ہے۔

توریت نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ کیا ہے کہ:

"جب موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے، کیونکہ ہارونؑ نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا[2] تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا جو جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آجائے تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو اور بنی لاوی نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق عمل کیا، چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تا کہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔"[3]

---

[1] کتاب استثناء باب ۱۷ فقرات ۲-۶۔

[2] اس جلیل القدر اور معصوم نبی پر تہمت لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی مزاج میں قتل انبیاء کی طرح توہین انبیاء بھی شامل تھی۔

[3] کتاب خروج باب ۳۲ فقرات ۲۵-۲۹۔

توریت میں کشتگان کی تعداد تین ہزار بتلائی گئی، جب کہ اسلامی روایات میں مختلف تعداد ہے ایک روایت میں کشتگان کی تعداد ستر ہزار بھی بتلائی گئی ہے[1] غالباً ان اعداد سے حقیقی مفہوم نہیں مراد لیا گیا ہے، بلکہ ان کے ذریعہ کشتگان کی کثرت کو واضح کیا گیا ہے۔

آیۂ مبارکہ کے ظاہر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکم توبہ اور حکم قتل دو الگ الگ احکام نہیں ہیں۔ بلکہ حکم قتل حکم توبہ ہی کی وضاحت ہے۔ دوسرے لفظوں میں بنی اسرائیل کی توبہ کا طریقہ ہی قتل تھا اس عمل کے بغیر توبہ وقوع پذیر نہ ہوتی۔

عَفَوْنَا عَنكُمْ[2] کی آیت کے پہلے آجانے سے یہ استدلال کرنا کہ عام معافی پہلے ہوئی اور سزائے قتل بعد میں دی گئی، درست نہیں ہے اس لیے کہ مذکورہ آیت میں فقط عمل اور انجام بتلایا گیا ہے اور آیت زیر بحث میں درمیان کی کڑیاں بھی ذکر کی گئی ہیں، یعنی عمل، حکم توبہ، طریقہ توبہ، قبول توبہ یعنی معافی۔

یہی صورت توریت میں بھی ہے کہ اس واقعۂ قتل انفس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی بارگاہ میں قوم کی معافی کی درخواست ان لفظوں میں کی:

"اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کر دے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے مٹا دے۔"[3]

اللہ نے اجتماعی گناہ معاف کر دیا، لیکن انفرادی گناہ کو معاف نہیں فرمایا اور موسیٰ سے کہا کہ "لیکن میں اپنے مطالبہ کے دن اُن کو ان کے گناہ کی سزا دوں گا۔"[4]

قتل انفس کا خطاب اگرچہ سارے بنی اسرائیل سے ہے لیکن سب نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی، لہٰذا اس کے مخاطب وہ بعض ہیں، جنہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور اس کی دلیل یہ جملہ ہے اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ۔ یہ سزا فقط مقتولین سے مخصوص نہیں تھی بلکہ قاتل بھی اس سزا میں شریک تھے اس لیے کہ انسان کا اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ یا بیٹے یا بھائی یا دیگر رشتہ دار اور دوست کو قتل کرنا قتل ہو جانے سے کم سزا نہیں ہے۔

باری اللہ کے اسماء حسنیٰ میں ہے یہ اسم قرآن میں تین بار استعمال ہوا ہے، دو بار اسی آیت میں اور ایک بار "هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اوّل صفحہ ۱۹۵۔ المیزان جلد اوّل صفحہ ۱۹۲۔

[2] بقرہ، ۵۲۔

[3] کتاب خروج باب ۳۲ فقرہ ۳۲۔

[4] کتاب خروج باب ۳۲ فقرہ ۳۴۔

الْحُسْنٰی[1] میں۔ باری کا مفہوم خالق اور موجد کے مفہوم کے قریب ہے، لیکن ایک ساتھ خالق اور باری کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں لفظ بالکل ہم معنی نہیں ہیں۔ باری کا مطلب ہے پیدا کرنے والا تو اس آیت میں اس لفظ کی حکمت یُوں سمجھی جا سکتی ہے کہ فرمایا گیا کہ اگرچہ یہ قتل تمھیں بہت ہی زیادہ گراں اور ناگوار گزر رہا ہے، لیکن یہ تو سوچو کہ تمھارے قتل کا حکم وہ (باری) دے رہا ہے جو تمھیں عدم سے وجُود میں لایا، اس لیے کہ یہی تمھارے لیے خیر تھا تو اب جو تمھیں وجُود سے عدم میں لے جانے کے لیے کہہ رہا ہے تو یہ بھی خیر ہی ہے۔

خالق ذی رُوح اور غیر ذی رُوح دونوں قسم کی مخلوقات کے پیدا کرنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ باری اس وقت بولا جاتا ہے، جب فقط ذی رُوح مخلوقات کی خالقیت کا اظہار کرنا مقصود ہو یعنی یہ دونوں الفاظ ایک ہی ذات کی دو جہاتِ خلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ باری کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بَرِیْـًٔا مِنَ التَّفَاوُتِ" (جس نے مخلوقات کو عیب و نقص سے پاک پیدا کیا)۔ آیت میں باری کا لفظ استعمال فرما کر اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ نے تمھاری خلقت کو رُوح اور عقل کی خوبیوں سے آراستہ کیا ہے (یعنی تمھاری سرشت میں کمال سے محبّت اور عیب و نقص سے نفرت کو ودیعت کیا گیا ہے)، تو اسی باری کا حکم ہے کہ قتل النفس کے اس عمل سے، تم میں جو بُت پرستی کا عظیم ترین عیب پیدا ہو گیا تھا اسے دھو ڈالو یہ عقلی اور روحانی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

---

[1] سُورۂ حشر ۲۴۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى
نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾
ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور جب تم نے کہا کہ اے مُوسیٰ ہم تمھارے کہنے سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو آشکارا نہ دیکھ لیں سو تمھیں بجلی نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔
پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں زندہ کیا، تاکہ تم شُکر گزار بنو۔

قتل النفس کے واقعہ کے بعد اللہ نے مُوسیٰ علیہ السّلام پر وحی کی کہ تم جب مناجات کے لیے طُور پر آؤ تو بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو بھی ساتھ لاؤ تاکہ وہ مجھ سے اپنے گناہ کی عذر خواہی کریں حضرت مُوسیٰ نے اپنی قوم کے ستر افراد کو منتخب فرمایا اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ مُوسیٰ اور ان اشخاص کے درمیان حجاب حائل ہوگیا۔ مُوسیٰ نے خدا سے دُعا کی کہ وہ کلام کرے اور اپنی آواز لوگوں کو سنوائے۔ خدا نے کلام فرمایا اور لوگوں نے وہ آواز سُنی، لیکن یہ یقین نہ کیا کہ خدا بول رہا ہے اور اسے دیکھنے کی

خواہش کی۔ اس آیۂ مبارکہ میں اسی واقعہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ تفسیر ابوالفتوح رازی جلد اول صفحہ ۱۹۶ پر اور دیگر تفسیروں میں جزوی اختلافات کے ساتھ موجود ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کے لیے کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو بنی اسرائیل کے ستر افراد بھی ساتھ تھے۔ وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا[1] (اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر افراد کو ہمارے میقات کے لیے منتخب کیا)۔ توریت کے ملنے کے بعد جب اُسے ان منتخب افراد کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ہم صرف تمہارے کہنے سے ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خدا کو نہ دیکھ لیں۔

پہلے قول کی روشنی میں یہ واقعہ نزول توریت اور قتل النفس کے بعد کا ہے اور دوسرے قول کی روشنی میں نزولِ توریت کے بعد اور قتل النفس سے قبل کا ہے۔ دوسرے قول کی تائید اس آیۂ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ الخ[2] (اہلِ کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی کتاب ان پر اتار دو، یہ تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کر چکے ہیں۔ بس کہنے لگے کہ ہمیں اللہ آشکارا دکھلا دو، سو انہیں ان کی شرارت کے سبب بجلی (موت) نے آلیا، پھر اگرچہ ان کے پاس کھلی نشانیاں آچکی تھیں یہ لوگ بچھڑے کو (معبود) بنا بیٹھے۔

اس آیۂ مبارکہ میں یہ بات واضح طریقہ سے بیان فرمائی گئی ہے کہ مطالبۂ رویت پہلے ہے، اور گوسالہ پرستی بعد میں ہے، جو دوسرے قول کے مطابق ہے۔ اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ موسیٰ کے ساتھ جانے والے ستر افراد کو بجلی (موت) نے آلیا اور پھر انہیں لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی؟ زمان و مکان کے فرق کے سبب یہ دونوں عمل ایک ہی گروہ کے نہیں ہیں۔ ساتھ جانے والے دوسرے افراد تھے اور گوسالہ پرستی کرنے والے دوسرے۔ قرآن مجید نے دونوں کو ایک ساتھ اس لیے ذکر فرمایا؟ کہ دونوں عمل ایک ہی مزاج اور ایک ہی جنس کے تھے۔ خدا کے دیکھنے کا مطالبہ بتلا رہا ہے کہ وہ اسے جسم سمجھتے تھے۔ یہ عقیدہ اسی طرح توحید کی ضد ہے، جس طرح گوسالہ پرستی ہے فرق یہ ہے کہ مطالبۂ رویت کا جرم چھوٹا تھا اس لیے سزا بھی چھوٹی رکھی گئی۔ اور گوسالہ پرستی کا جرم بڑا تھا اس لیے سزا بھی سخت رکھی گئی۔

مندرجہ ذیل آیات سے بھی اس واقعہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے؛

---

[1] سورۂ اعراف، ۱۵۵۔

[2] سورۂ نساء، ۱۵۳۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

"اور ہم نے موسیٰ کے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا اور اس کو دس سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں میری نیابت کرو اور اصلاح کرو اور فساد کرنے والوں کی راہ کی پیروی نہ کرنا۔"

"وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا کہا میرے رب مجھے دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں کہا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ اپنی جگہ پر رہا تو تو مجھے دیکھ لے گا پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گیا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا تو پاک ہے، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر افراد کو ہمارے میقات کے لیے چنا پھر جب انہیں زلزلے نے آلیا تو کہا میرے رب اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر دیتا کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کر رہا ہے جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے۔ یہ فقط تیرا امتحان ہے تو اس کے ذریعہ جسے چاہتا ہے گمراہ چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے تو ہی ہمارا ولی ہے سو ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم کر اور تو بہترین معاف کرنے والا ہے۔

سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا دو آیات مسلسل ہیں اور تیسری کچھ فاصلے پر ہے۔ ان آیات سے ظاہری طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) میقات میں موسیٰ چالیس رات رہے اس میں اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا اور اسی میں

رویت باری کا مطالبہ ہُوا اور اسی میقات میں مُوسیٰ کے ساتھ ستر افراد گئے۔

(۲) لَنْ تَرَانِیْ میں ہمیشہ ہمیشہ کی رویت کی نفی ہے، یعنی نہ دنیا میں دیکھ سکو گے نہ آخرت میں۔

(۳) پہاڑ کی مثال تعلیق المحال بالمحال ہے۔ یعنی نہ پہاڑ اپنی جگہ رہ سکے گا نہ دیکھ سکو گے۔

(۴) اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ مِنَّا کا جُملہ دلیل قاطع ہے کہ یہ مطالبہ رویت خُود موسیٰ علیہ السلام کا نہ تھا بلکہ قوم کی طرف سے تھا جسے آپ نے پیش فرمایا تھا۔

اس سلسلے میں ایک طویل روایت سے اقتباس مسئلہ کو حل کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔ امام رضا علیہ السلام سے سوال ہُوا کہ مُوسیٰ علیہ السلام نبی تھے معصوم تھے تو کیا انہیں یہ علم نہیں تھا کہ خدا دیکھا نہیں جا سکتا تو آپ نے جواب میں فرمایا۔ اِنَّ کَلِیْمَ اللّٰہِ مُوْسیٰ ابْنِ عِمْرَانَ عَلِمَ اَنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اَجَلَّ اَنْ یَرَیٰ بِالْاَبْصَارِ وَلٰکِنَّہٗ لِمَا کَلَّمَہُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ وَقَرَّبَہٗ نَجِیًّا رَجَعَ اِلیٰ قَوْمِہٖ فَاَخْبَرَھُمْ اَنَّ اللّٰہَ کَلَّمَہٗ وَقَرَّبَہٗ وَنَاجَاہُ فَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَسْمَعَ کَلَامَہٗ کَمَا سَمِعْتَ[1] (موسیٰ کلیم اللہ کو معلوم تھا کہ خدا دیکھے جانے کے عیب سے پاک ہے، لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ جب اللہ نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے سے قریب کیا تو وہ قوم میں واپس آئے اور انہیں بتلایا کہ اللہ نے ان سے کلام کیا ہے اور انہیں قریب کیا ہے اور ان سے خصوصی بات کی ہے، تو وہ کہنے لگے کہ ہم تمہاری اس بات (یعنی نبوت) پر ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہمیں بھی اس کا کلام نہ سنوا دو جیسے کہ تم نے سنا) ——— اس کے بعد روایت میں تفصیلی ذکر ہے کہ مُوسیٰ نے لوگ منتخب کیے پھر میقات پر گئے۔ وہاں لوگوں نے کلام سنا لیکن یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ہمیں خدا کو آشکارا دکھلا دو۔

اس روایت سے بھی دوسرے قول کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے، ہم ان شاء اللہ سُورۂ اعراف میں اس موضوع پر کسی حتمی رائے کا اظہار کریں گے اور توریت کے حوالے بھی پیش کریں گے جو اگرچہ الجھے ہُوئے اور بے ترتیب ہیں لیکن ان سے بعض مسائل میں تائید حاصل کی جا سکتی ہے۔

بنی اسرائیل پر طاری ہونے والی موت کے سلسلے میں بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ موت نہ تھی بلکہ غشی کی کیفیت تھی جو ان پر طاری ہو گئی تھی، کچھ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ موت تو طاری ہوئی تھی لیکن انکا دوبارہ زندہ کیا جانا درست نہیں ہے بلکہ یہاں "بعث" سے مراد ان کی نسل کی کثرت ہے، عقلائے عالم کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تک تاویل کے لیے اسباب واقعی پیدا نہ ہو جائیں اس وقت تک کلام کو

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۱۰۴ زیر آیت بقرہ ۵۵۔

ظاہری مفہوم ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر دوبارہ زندہ کرنا قدرت باری کے بس سے باہر ہو اور محال ہو تو تاویل کی ضرورت ہو گی ورنہ بصورتِ دیگر یہ عمل علمی خیانت متصور ہو گا۔

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت عزیر علیہ السلام کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے "فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ" ؎۱ (پس اللہ نے انہیں سو سال کے لیے موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا) اسی طرح "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ" ؎۲ (کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں خوفِ مرگ سے نکل کھڑے ہوئے، پھر خدا نے ان کو کہا کہ مر جاؤ پھر خدا نے انہیں زندہ کر دیا) زیرِ تفسیر آیت اور یہ دو آیتیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ اللہ نے اس دُنیا میں بہت سوں کو موت دے کر دوبارہ زندہ فرمایا ہے اور یہی عمل امام مہدی علیہ السلام کے عہدِ مبارک میں ہو گا۔ اسی کا نام رجعت ہے۔

رویتِ باری

یہ موضوع بھی اسلام میں مختلف آراء کی آماجگاہ رہا ہے۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اللہ جوہر ہے اس لیے دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ اگرچہ مجرد ہے۔ لیکن قیامت میں دیکھا جائے گا اور رویتِ باری دُنیا میں عقلاً محال نہیں ہے بلکہ شرعاً ممتنع ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ خدا اتنی مجرد ذات ہے کہ اس کی رویت ممکن ہی نہیں نہ دُنیا میں نہ آخرت میں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو ذاتِ اقدس و گرامی عقل و وہم اور قیاس و تخیل کے دائرے میں نہ آ سکے اسے یہ مادی نگاہیں کیسے دیکھ سکتی ہیں۔

قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن سے ہمارے مُدعا کا اثبات ہو سکتا ہے۔ چند یہ ہیں۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام نے جب رویت کی خواہش کی تو جواب لَنْ تَرَانِيْ (ہرگز ہرگز مجھے نہ دیکھ سکو گے) اس جملہ کا حرفِ نفی ہمیشگی کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) سورۂ بقرہ (۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۳) میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے مطالبۂ رویت کے جواب میں بجلی گری اور وہ مر گئے۔ حالانکہ اگر رویت کا امکان ہوتا تو جواب یہ دیا جاتا

؎۱ سورۂ بقرہ، ۲۵۹۔

؎۲ سورۂ بقرہ، ۲۴۳۔

کہ دُنیا میں تو ممکن نہیں ہے آخرت میں دیدار کرلینا۔
سورۂ نساء (۱۵۳) کی روشنی میں خدا کی کتاب کسی مؤمن بلکہ کسی عام نبی پر بھی نہیں اُترتی تو کسی کافر پر کیسے اُتر جائے گی۔ یہ محال ہے اور اس سے بڑا محال یہ ہے کہ خدا کو دیکھ لیا جائے۔

(۴) موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں جو مناجات (سورۂ اعراف ۱۵۵) کی تھی اس میں مطالبۂ رویت کو احمقوں کا عمل قرار دیا تھا۔

(۵) لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ[1]
(نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پاتا ہے وہ صاحب لطافت و خبر ہے)۔

(۶) وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ أَوْ نَرَىٰ رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيرًا[2]
اور جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُترتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں انہوں نے اپنی ذات میں تکبر کیا ہے اور حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

رویت باری کا اثبات کرنے والوں کے پاس سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ"[3] (قیامت کے دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف نظر کر رہے ہوں گے) رب کی طرف نظر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رب نظر آرہا ہوگا۔ اس لیے کہ نظر کرنے کا لازمی نتیجہ دکھائی دے جانا نہیں ہے، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ انسان جس چیز کی طرف نظر کر رہا ہو وہ اتنی شفاف اور لطیف ہو کہ دکھائی نہ دے یا نگاہ اس شے کو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتی ہو۔ ہمارے اس دعوے پر سب سے بڑی دلیل یہ آیۂ مبارکہ ہے۔ وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ[4] (اور تم انھیں دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف نظر کر رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں) اس آیت میں نظر کرنے کے باوجود رویت کی نفی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ لفظ نظر عدم رویت کی صورت میں بکثرت استعمال ہوتا ہے مثلاً "نَظَرْتُ إِلَى الْهِلَالِ وَمَا رَأَيْتُ" (میں نے چاند کی طرف نظر کی لیکن اسے نہیں دیکھا)

---

[1] سورۂ انعام ۱۰۳۔
[2] سورۂ فرقان ۲۱۰۔
[3] سورۂ قیامت ۲۲/۲۳۔
[4] سورۂ اعراف ۱۹۸۔

اس جملہ میں نظر کے معنی نگاہ کو استعمال کرنا ہیں، لیکن اس کے باوجود رویت کی نفی کی گئی ہے۔
عام مشاہدہ کی بات ہے کہ دیکھی جانے والی چیز کے لیے شرط ہے کہ نگاہ کے مقابل ہو، بہت دُور نہ ہو، بہت نزدیک نہ ہو، شفاف و لطیف نہ ہو بلکہ کثیف جسم رکھتی ہو، کسی جگہ میں ہو تاکہ مقابل ہو سکے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سارے شرائط مادہ میں پائے جاتے ہیں، جن سے خدائے قُدّوس پاک اور بلند ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوٰی اتارا کہ ہمارے عطا کردہ پاک اور حلال رزق سے کھاؤ، اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے رہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس (سرزمینِ شام) میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کے لیے فرمایا تو انہوں نے اس جگہ بسنے والی قوم سے خوفزدہ ہو کر منع کر دیا اس پر اللہ نے فرمایا کہ اب ان لوگوں پر وہ زمین چالیس سال کیلئے حرام کر دی گئی (يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ) اور اب یہ اس سرزمین پر سرگرداں پھرتے رہیں گے [1] اسی آیۂ مبارکہ سے وادی تیہ بنایا گیا ہے۔ اس وادی تیہ میں ان پر دو نعمتیں نازل ہوئیں۔ بادلوں کا سایہ اور من سلوٰی کا رزق۔

بادلوں کے سائے کے سلسلے میں توریت میں مختلف بیانات ہیں، جن میں دو قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) اور جب موسیٰ خیمہ کے اندر چلا جاتا تو ابر کا ستون اُتر کر خیمہ کے دروازے پر ٹھہرا رہتا، اور خداوند موسیٰ سے باتیں کرنے لگتا اور سب لوگ ابر کے ستون کو خیمہ کے دروازے پر ٹھہرا دیکھتے تھے اور سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر اپنے ڈیرے کے دروازے پر سے اسے

[1] سورۂ مائدہ ۲۱-۲۶۔

سجدہ کرتے تھے[1]

(۲) اور بنی اسرائیل کے سارے سفر میں یہ ہوتا تھا کہ جب وہ ابر مسکن کے اوپر سے اُٹھ جاتا تو وہ آگے بڑھتے پر اگر وہ ابر نہ اُٹھتا تو وہ اس دن تک سفر نہیں کرتے تھے جب تک وہ اُٹھ نہ جاتا، کیونکہ خداوند کا ابر اسرائیل کے سارے گھرانے کے سامنے اور ان کے سارے سفر میں دن کے وقت تو مسکن کے اوپر ٹھہرا رہتا اور رات کو اس میں آگ رہتی تھی[2]

اس بادل کے سلسلہ میں امام حسین علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا: فَاِنَّ مُوسٰى قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ الْغَمَامُ قَالَ لَهٗ عَلِيٌّ لَقَدْ كَانَ كَذٰلِكَ وَقَدْ فَعَلَ ذٰلِكَ لِمُوسٰى فِي التِّيْهِ وَاَعْطٰى مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَفْضَلَ مِنْ هٰذَا اِنَّ الْغَمَامَةَ كَانَتْ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ تُظِلُّهٗ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ اِلٰى يَوْمِ قُبِضَ فِي حَضَرِهٖ وَسَفَرِهٖ فَهٰذَا اَفْضَلُ مِمَّا اُعْطِيَ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ[3] (موسیٰ پر تو اللہ نے بادلوں کا سایہ کیا تھا، علیؑ نے اس سے کہا کہ ہاں ایسا ہی تھا اور یہ اس وقت کیا تھا جب وہ تیہ میں تھے اور محمدؐ کو اس سے افضل عطا کیا کہ بادل ان کی پیدائش کے دن سے ان کی وفات کے دن تک سفر و حضر میں ہمیشہ اُن پر سایہ فگن رہا یہ موسیٰ کی فضیلت سے بڑی فضیلت ہے، طویل روایت کا اقتباس)

من و سلویٰ کا تذکرہ اس آیت کے علاوہ سورۂ اعراف (۱۶۰) اور سورۂ طٰہٰ (۸۰) میں بھی موجود ہے ان دونوں الفاظ کے سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک روایت کی روشنی میں اس کی تشریح یہ ہے عَنِ الْاِمَامِ الْحَسَنِ الْعَسْكَرِيِّ اِنَّ الْمَنَّ التَّرَنْجَبِيْنُ كَانَ يَسْقُطُ عَلٰى شَجَرِهِمْ فَيَتَنَاوَلُوْنَهٗ وَالسَّلْوٰى السُّمَانٰى طَيْرٌ اَطْيَبُ طَيْرٍ لَحْمًا يَسْتَرْسِلُ فِيْهِمْ وَيَصْطَادُوْنَهٗ[4] (امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے کہ من ترنجبین کا نام ہے اس کے درختوں پر جم جانے کی صورت میں بنی اسرائیل اسے اپنی غذا کے لیے حاصل کر لیتے تھے اور سلویٰ بٹیر ہے جو گوشت کے اعتبار سے پرندوں میں سب سے بہتر ہے، وہ اس کا شکار کر لیا کرتے تھے)

من کے سلسلے میں توریت کا بیان یہ ہے کہ "پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل

---

[1] کتاب خروج باب ۳۳ فقرات ۹/۱۰۔

[2] کتاب خروج باب ۴۰ فقرات ۳۶/۳۷/۳۸۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۸۲۔

[4] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۱۰۱ بحوالہ تفسیر الفرقان جلد اول ۴۲۵/۴۲۶

کی ساری کی ساری جماعت مُلک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی۔ اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت مُوسیٰ اور ہارُون پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے مُلک مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے، کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو تب خداوند نے مُوسیٰ سے کہا میں آسمان سے تم لوگوں کے لیے روٹیاں برساؤں گا سو یہ لوگ نکل نکل کر فقط ایک ایک دن کا حصّہ ہر روز بٹور لیا کریں کہ اس سے میں انکی آزمائش کرونگا کہ وہ میری شریعت پر چلیں گے یا نہیں؟ اور چھٹے دن ایسا ہوگا کہ جتنا وہ لا کر پکائیں گے وہ اس سے جتنا روز جمع کرتے ہیں دونا ہوگا[۱]" اور مَنْ دھنیے کی مانند تھا اور ایسا نظر آتا تھا جیسے موتی۔ لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے تھے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے پھر اسے ہانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے اس کا مزہ تازہ تیل کا تھا اور رات کو جب لشکرگاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا[۲] بنی اسرائیل کو چالیس سال کی مدت میں یہ غذا ملتی رہی یہاں تک کہ وہ سرزمین کنعان کے حدود میں داخل ہوگئے جیسا کہ مذکور ہے، اور دوسرے ہی دن سے اُن کے اس مُلک کے پرانے اناج کے کھانے کے بعد مَنْ موقوف ہوگیا اور آگے پھر بنی اسرائیل کو مَن کبھی نہ ملا لیکن اس سال انہوں نے ملک کنعان کی پیداوار کھائی"[۳]

من و سلویٰ کے سلسلے میں توریت کا ایک بیان یہ ہے کہ "اور یُوں ہُوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سُوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں زمین پر پڑی ہے بنی اسرائیل اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ تب مُوسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے"[۴] سلویٰ کے سلسلے میں ایک بیان یہ ہے کہ" اور خداوند کی طرف سے ایک آندھی چلی اور سمندر سے بٹیریں اڑا لائی اور ان کو لشکرگاہ کے برابر اور اس کے گرداگرد ایک دن کی راہ تک اس طرف اور ایک ہی دن کی راہ تک دوسری طرف زمین سے قریبًا دو ہاتھ اوپر ڈال دیا"[۵]

---

[۱] کتاب خروج باب ۱۶ فقرات ۱-۶۔
[۲] کتاب خروج باب ۱۱ فقرات ۷/۸/۹/۱۰۔
[۳] کتاب یشوع باب ۵ فقرہ ۲۔
[۴] کتاب خروج باب ۱۶ فقرات ۱۳/۱۴/۱۵۔
[۵] کتاب گنتی باب ۱۱ فقرہ ۳۱۔

اس آیۂ مبارکہ میں نعمتوں کے تذکرے کے فوراً بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ "انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے رہے " یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انہوں نے من وسلوٰی کے سلسلے میں بھی شریعت کے بیان کردہ حدود کا خیال نہیں رکھا اور اس میں بھی اپنی سرکشی پر باقی رہے جیسا کہ کتاب گنتی باب ۱۱ فقرہ ۳۳ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور حوالہ بھی قابل ذکر ہے" اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے وہ اس کے سننے والے نہ ہوئے اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا سو اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا"۔[۱]

---

[۱] کتاب خروج باب ۱۶ فقرہ ۲۰۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا
مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا
الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں چاہو با فراغت کھاؤ اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور کہنا حِطّہ، ہم تمہاری خطائیں معاف کردیں گے اور اچھے کام کرنے والوں کو ہم زیادہ عطا کریں گے۔

پھر ان ظالم لوگوں نے اس قول کی جگہ دوسری بات

بدل کر کہہ دی تو ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے ایک عذاب نازل کیا اس لیے کہ وہ مسلسل نافرمانی کر رہے تھے۔

یہ واقعہ سورۂ نساء (۴/۱۵۴) میں ضمنی طور پر بیان ہوا ہے اور سورۂ اعراف میں الفاظ کی جزوی تبدیلی کے ساتھ مذکور ہے۔

"وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝"[1]

"اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں سکونت کر لو اور اس میں سے جہاں چاہو کھاؤ اور حطہ کہو اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والے کو زیادہ عطا کریں گے۔ مگر ان میں جو ظالم تھے۔ انہوں نے اس قول کی جگہ دوسری بات کہہ دی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس لیے کہ وہ مسلسل ظلم کر رہے تھے۔"

ان آیات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ بستی کون سی تھی۔ ایک گروہ کی رائے میں یہ بیت المقدس[2] کا ذکر ہے اور اس کی دلیل میں یہ آیۂ مبارکہ پیش کی جاتی ہے۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ[3] (اے میری قوم والو مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے)۔ دوسرا گروہ جس میں اکثر مفسرین شامل ہیں، اس کا خیال ہے کہ اس سے

---

[1] سورۂ اعراف ۱۶۱/۱۶۲۔

[2] شہر بیت المقدس کے ایک دروازے کا نام باب حطہ ہے تفسیر الکاشف جلد اوّل صفحہ ۱۰۹ بحوالہ ابوحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ۔

[3] سورہ مائدہ ۲۱۔

مراد اریحا[1] نامی بستی ہے جو توریت میں یریحو کے نام سے مذکور ہے۔ تیسرے گروہ کے خیال میں ان آیات کا سیاق و سباق اُن حالات پر مشتمل ہے جو جزیرہ نمائے سینا میں پیش آئے تھے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس علاقے کی کوئی بستی ہو اور بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا ہو کہ کچھ دنوں کے لیے سرگردانی اور خانہ بدوشی سے نجات حاصل کر لو اور بستی میں سکونت اختیار کر لو۔ اس قول کے مطابق امکان ہے کہ وہ شہر شطیم[2] ہو جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی زندگی کے آخری عہد میں فتح کیا۔ اس لیے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد بارہ چشموں کے واقعہ کا تذکرہ ہے، جو عہد موسیٰ سے متعلق ہے۔

البتہ قرآن مجید کا یہ حکم کہ بافراغت کھاؤ پیو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ بستی سرسبز و شاداب تھی، اس میں اجناس غذا اور فواکہ کی کثرت تھی اور وسائل رزق اتنے وافر تھے کہ کسب معاش کے لیے شدید محنت کی ضرورت نہ تھی، یہ صورت حال جزیرہ نمائے سینا کے ریگستانی غیر آباد علاقوں کے مقابل فلسطین کے شہروں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اگر اس واقعہ کو فلسطین سے متعلق قرار دیا جائے اور اس کا عہد حضرت یوشع کا عہد مانا جائے تو قرآن کے واقعات (بنی اسرائیل) کی زمانی وحدت کے خلاف قرار پاتا ہے مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن مجید تاریخ کی کتاب نہیں ہے اس کا کام تذکیر و نصیحت ہے اس لیے وہ اپنے کلام میں ہر اس شاہد و نظیر کو پیش کرتا ہے جو مفید مطلب ہو واقعات کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس بات سے قطع نظر کہ وہ بستی کون سی تھی آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب بستی میں سکونت کے لیے شہر پناہ[3] کے دروازے سے داخلہ ہو تو عاجزی، انکسار اور فروتنی کے ساتھ ہو اور اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتے ہوئے ہو۔ حِطَّۃٌ کا مفہوم ہے کہ ہماری خطاؤں کو معاف کر دے۔ سورۂ بقرہ میں سجدہ کا حکم پہلے اور حطہ کا بعد میں ہے۔ جبکہ سورہ اعراف میں اس کے برعکس ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں حکم ایک ہی ردیف میں ہیں، ان میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ سجدہ اور حطہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات دے کر تمہیں شہری اور تمدنی زندگی کی طرف منتقل کر دیا ہے، لہٰذا شہر کے دروازے میں داخل ہوتے وقت سجدۂ شکر ادا کرو اور خطاؤں کی معافی طلب کرو اور دل میں جذبۂ تواضع رکھو اور استغفار کرتے رہو۔

---

[1] اس بستی کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فتح کیا تھا۔

[2] کتاب گنتی باب ۲۵ فقرات ۱-۹۔

[3] بعض محققین نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب اریحا (یریحو) کی شہر پناہ کے کھنڈر کا معائنہ کیا گیا تو اس پر سخت دھماکے کے اثرات پائے گئے۔

جو تبلایا گیا تھا اسے بنی اسرائیل نے بدل کر کہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حطہ کی جگہ حنطہ (گیہوں) کہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ملتے ہیں۔ انہوں نے بدل کر جو بھی کہا ہو وہ قرآن کا موضوع نہیں ہے۔ قرآن تو یہ تبلانا چاہتا ہے کہ اسی بے ہودگی اور تمسخر اور نافرمانی کے سبب بنی اسرائیل پر عذاب آگیا اور بما کانوا یفسقون کا جُملہ تبلاتا ہے کہ وہ مسلسل اسی قسم کی بیہودگیاں کرنے کے عادی تھے۔

باب حِطّہ

مذکورہ بالا تحریر سے یہ واضح ہوگیا کہ باب حِطّہ وہ دروازہ تھا جس سے مغفرت طلب کرتے ہوئے گزر کر شہر میں داخل ہونا تھا۔ اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض روایات بہت معنی خیز اور ایمان افروز ہیں۔

"عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ قَالَ عَلِیٌّ بَابُ حِطَّةٍ مَنْ دَخَلَ فِیْهِ كَانَ مُؤْمِنًا وَمَنْ خَرَجَ مِنْهُ كَانَ كَافِرًا[1]

"ابنِ عباس نے رسُول اللہ سے روایت کی ہے کہ فرمایا کہ علیؑ باب حطہ ہے جو اس میں داخل ہُوا وہ مؤمن ہے اور جو اس سے خارج ہُوا وہ منکر ہے۔

"اِنَّ عَلِیًّا سَفِیْنَةُ نِجَاتِهَا وَبَابُ حِطَّتِهَا۔[2]

"رسول اللہؐ نے فرمایا کہ علیؑ اس اُمّت کا سفینہ نجات اور بابِ حِطّہ ہیں۔

اَخْرَجَ ابْنُ اَبِیْ شَیْبَةٍ عَنْ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَ اِنَّمَا مَثَلُنَا فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ كَسَفِیْنَةِ نُوْحٍ وَكَبَابِ حِطَّةٍ فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ[3]

ابن اَبی شیبہ نے علیؑ کا قول نقل کیا ہے کہ اس اُمّت میں ہماری مثال نوح کے سفینے اور بنی اسرائیل کے بابِ حِطّہ کی مثال ہے۔

کتب تفسیر ومناقب میں اس مضمون کی بکثرت روایات پائی جاتی ہیں جنھیں اپنے مقام پر دیکھا جا سکتا ہے۔

---

[1] یہ روایت بہت سی کتابوں میں پائی جاتی ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

الصواعق المحرقہ ابن حجر صفحہ ۷۵۔

الجامع الصغیر سیوطی جلد دوم صفحہ ۱۴۰۔

کنزالعمال متقی ہندی (برحاشیہ مسند چاپ مصر) جلد ۵ صفحہ ۲۹۔

[2] تفسیر نورالثقلین جلد اوّل صفحہ ۸۲ طویل روایت کا اقتباس۔

[3] تفسیر دُرِّ منثور جلد اوّل صفحہ ۷۳۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتّھر پر مارو پس اس سے بارہ چشمے پھوٹے سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا، خدا کے رزق سے کھاؤ اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

سورۂ اعراف (۱۶۰) میں یہ واقعہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

" وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ

" اور ہم نے انھیں الگ الگ بارہ قبیلوں قوموں میں تقسیم کر دیا اور جب موسیٰ سے ان کے لوگوں نے پانی مانگا تو ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پہ مارو پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔"

اس واقعے کے تفصیلات کے سلسلے میں توریت کے یہ دو حوالے قابلِ مطالعہ ہیں۔ "پھر بنی اسرائیل

کی ساری جماعت سین کے بیابان سے چلی اور خداوند کے حکم کے مطابق سفر کرتی ہوئی رفیدیم[1] میں آکر ڈیرہ کیا وہاں ان لوگوں کے پینے کو پانی نہ ملا وہاں لوگ موسیٰ سے جھگڑا کر کے کہنے لگے کہ ہم کو پینے کو پانی دے موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کو کیوں آزماتے ہو وہاں ان لوگوں کو بڑی پیاس لگی سو وہ لوگ موسیٰ پر بڑبڑانے لگے اور کہا کہ تو ہم کو اور ہمارے بچوں اور چوپایوں کو پیاسا مارنے کے لیے ہم لوگوں کو کیوں ملک مصر سے نکال لایا؟ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں؟ وہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔ خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ لوگوں کے آگے ہو کر چل اور بنی اسرائیل کے بزرگوں میں سے چند کو اپنے ساتھ لے لے اور جس لاٹھی سے تو نے دریا پر مارا تھا اسے اپنے ہاتھ میں لیتا جا۔ دیکھ میں تیرے آگے جا کر وہاں حورب کی ایک چٹان پر کھڑا رہوں گا۔ اور تو اس چٹان پر مارنا تو اس میں سے پانی نکلے گا۔ کہ یہ لوگ پئیں چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا۔[2]

دوسرا حوالہ یہ ہے کہ" اور پہلے مہینے میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشتِ صین میں آگئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے اور مریمؑ[3] نے وہاں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئی اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا سو وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے ہائے کاش ہم بھی اسی وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں۔ اور موسیٰ اور ہارون جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے تب خداوند کا جلال ان پر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان کو کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ اور ہارون نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا، سنو اے باغیو! کیا ہم تمہارے لیے اسی چٹان سے پانی نکالیں تب موسیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا۔"

---

[1] کتاب گنتی باب ۳۳ فقرہ ۱۴۔

[2] کتاب خروج باب ۱۷ فقرات ۱-۱۷۔

[3] ہارون و موسیٰ کی بہن۔

اگرچہ پہلا واقعہ رفیدم کا ہے، جب کہ دوسرا قادس کا ہے، پہلے کا زمانہ مصر سے نکلنے کے دو سال بعد کا ہے اور دوسرا خروج مصر کے چالیسویں سال کا ہے، لیکن دونوں کا بغور مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جسے وقائع نگار نے دوبار تحریر کر دیا ہے۔ ان واقعات میں بارہ چشموں کا تذکرہ نہیں ملتا یہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس نے تعداد بھی بتلائی ہے۔ اسرائیلی آثار قدیمہ کے بعض محققین نے موجودہ صدی میں ایسے چشموں کے آثار دریافت کر لیے ہیں۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ
وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا
تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ
الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا
مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور جب تم لوگوں نے کہا اے مُوسیٰ ہم ایک کھانے پر ہرگز
صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لیے دُعا کرو
کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں سے برآمد کرے جو زمین
اُگاتی ہے اس کی ترکاری اور اس کی ککڑی اور اس کا

لہسن اور اس کی مسور اور اس کی پیاز۔ کہا کیا تم بہتر کے بدلے میں کم تر لینا چاہتے ہو، کسی شہر میں اُتر جاؤ تو جو مانگتے ہو وہ مل جائے گا اور ان پر ذلت اور محتاجی کی مار پڑی اور وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے اس لیئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھے ہوئے تھے۔

بنی اسرائیل سرزمین مصر میں عہدِ غلامی میں شہری غذاؤں کے عادی ہو چکے تھے۔ ریگستانوں اور بیابانوں میں جب سادہ اور فطری غذا ملی تو اس سے جلد ہی عاجز ہو گئے اس لیے مختلف طریقوں سے پکائی جانے والی غذاؤں کا مطالبہ کیا اور چونکہ یہ چیزیں شہر ہی میں مل سکتی تھیں اس لیے بعید نہیں ہے کہ انہوں نے اس مطالبہ کے ذریعہ بستی اور آبادی میں سکونت کی خواہش کا اظہار کیا ہو جو اگرچہ زبان سے نہیں کہا گیا۔ لیکن مطالبہ کے بین السطور سے بخوبی آشکار ہے۔

بیابان نوردی اگرچہ سزا کے طور پر تھی، لیکن اس کی ایک مصلحت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ طویل غلامی کے بعد انھیں ایسی ہوا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا گیا، جس کی ہر موج آزادی لیے ہوئے تھی تاکہ یہ آزادی ان کی رگ و پے میں رچ بس جائے ـــــ بے آب و گیاہ میدانوں اور سنگلاخ پہاڑی وادیوں میں سالہا سال کی خانہ بدوشی اس لیے مسلط کی گئی کہ سرکشی اور نافرمانی کی جگہ صبر اور شکر کی توانائیاں پیدا ہو کر راسخ ہو جائیں اور تمدن سے اس لیے دور رکھا گیا کہ مختلف اقسام کی بت پرستیاں اور رنگا رنگ بے کاریاں جو ان کی فطرت بن چکی تھیں، ان کے دماغ سے محو ہو جائیں وہ فقط خدا پر ایمان رکھیں، اسی پر بھروسہ کریں اور اپنے رب کی اطاعت کو اپنا منشور قرار دے لیں تاکہ عقیدۂ توحید ان کے اندرون میں راسخ ہو جائے اور نتیجے کے طور پر انہیں سرزمین موعود کی حکمرانی تفویض کی جاسکے۔

ابھی سزا اور تربیت کی مدت تمام نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے مطالبہ کر دیا۔ ان کی غذا طلبی کو توریت نے یوں رقم کیا ہے" اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دیگا۔

ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن"۔ ؎۱

قرآن مجید نے ان کے مطالبے کو یوں نقل فرمایا ہے اُدۡعُ لَنَا رَبَّكَ الخ اے مُوسیٰ تم اپنے رب سے ہمارے لیے دُعا کرو۔ اس جُملہ میں گستاخی کا پہلو ہے۔ کیا رب مُوسیٰ بنی اسرائیل کا رب نہیں تھا؟ ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ انہوں نے دل سے ربّ مُوسیٰ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور اگر تسلیم کر لیا تھا تو پھر ربّک کا استعمال تمسخر یا طنز کے طور پر کیا ہے۔

اس مطالبے پر ان سے کہا گیا کہ بہتر کے بدلے میں بدتر چاہتے ہو؟ جس طرح ایک مطالبہ میں دو مطالبہ تھے، اسی طرح ایک جواب میں دو جواب دیئے گئے، پہلا تو یہ کہ بے مشقت روزی کے مقابلے میں کسب معاش کی پریشانیوں میں الجھنا چاہتے ہو اور دوسرا جواب بین السطور میں یہ دیا گیا کہ ہم نے تو چاہا تھا کہ تمہیں حکمرانی عطا کریں، لیکن تم تو کاشت کاری یا تجارت یا ایسے ہی کسی پیشے کو اپنانا چاہتے ہو تو اگر اس تھوڑے پر راضی ہو تو کسی شہر میں اُتر جاؤ۔

اِھۡبِطُوۡا مِصۡرًا مصر شہر کو کہتے ہیں۔ اس کے لیے اور بھی متبادل الفاظ تھے جو استعمال کیے جا سکتے تھے۔ لیکن مصر رکھ کر انہیں پچھلی غلامانہ زندگی یاد دلائی گئی ہے۔

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی! اسی بات کو دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا گیا ہے،

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝ ؎۲

"ان پر ذلت کی مار پڑ چکی ہے، جہاں بھی وہ پائے جائیں، مگر اللہ کے عہد اور انسانوں کے عہد کے ذریعہ بچ سکتے ہیں) اور وہ اللہ کے غضب کا شکار ہُوئے اور ان پر محتاجی کی مار پڑ چکی ہے یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھے ہُوئے تھے"

اگرچہ آیت ماقبل کی روشنی میں یہ آیت اہل کتاب سے متعلق ہے۔ جس میں یہود و نصاریٰ

؎۱ کتاب گنتی باب ۱۱ فقرات ۴/۵۔

؎۲ سورۂ آل عمران ۱۱۲۔

دونوں شامل ہیں۔ لیکن آیت بقرۃ (۶۱) کی روشنی میں اس سے یہودی مراد ہیں اور قتل انبیاء کے عمل کی نسبت بھی اس کی روشن دلیل ہے۔ آیۂ مبارکہ کی روشنی میں ذلت، مسکنت اور غضبِ الٰہی یہ تینوں عذاب ان پر مسلط ہوگئے۔ اور ان سے بچنے کا طریقہ یہ بتلایا گیا کہ اللہ سے اپنے عہد[1] کو استوار کریں اور اسلام کے دائرہ میں آجائیں یا[2] پھر غیر اسلامی حکومتوں سے اپنے عہد کو استوار کریں تو جزوی طور پر ذلت اور مسکنت سے نجات پا جائیں گے اور آج بیسویں صدی میں بڑی طاقتوں کے بل بوتے پر اسرائیل کا وجود اسی دوسرے طریقہ کا غماز ہے۔ اور اس طرح قرآنی جملے کے اعجاز کی حقیقت عالم آشکارا ہوئی۔

ذلت عزت کی ضد ہے یعنی خواری اور بے عزتی اور کسی کا محکوم یا تابع فرمان ہوجانا۔ بنی اسرائیل کی صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے دامن میں ذلت، محکومیت اور اسیری اور قتل کے علاوہ کچھ نہیں ہے ——— مسکنت یعنی غربت اور احتیاج۔ بنی اسرائیل سرمایہ داری کے اس عالمی نظام کے اہم رُکن ہیں جو آج دُنیا میں رائج ہے اور جس کا طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ چند انتہائی امیر ترین افراد کے علاوہ پوری قوم افلاس و بے مائیگی کا شکار ہوتی ہے۔ یہی صُورتِ حال کل بھی تھی اور بنی اسرائیل اسی صُورتِ حال کا شکار آج بھی ہیں ——— غضبِ الٰہی دوہری تلوار ہے، دُنیا میں اس نے ذِلت و مسکنت کا عذاب نازل کیا اور آخرت میں آگ کا عذاب نازل کرے گا۔

ذلت، مسکنت اور غضبِ الٰہی کا سبب آیاتِ الٰہی کا انکار اور قتلِ انبیاء رہے اور ان دو اعمال کا سبب نافرمانی کی عادت اور ظلم و تعدی کا مزاج ہے۔ یہ نتیجہ "ذٰلِكَ" کی تکرار سے نکالا گیا ہے۔

یہ آیت مسلمانوں کے لیے آئینہ بھی ہے اور عبرت بھی اور سوالیہ نشان بھی کہ کیا نافرمانی کی عادت اور ظلم و تعدی کا مزاج آج مسلمانوں کا قومی مزاج نہیں ہے؟

خونِ ناحق

آیۂ مبارکہ میں "بِغَيْرِ الْحَقِّ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ یہودی انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوگا۔ پھر اس کے اضافے

---

[1] اس آیۂ مبارکہ میں حبل سے مراد عہد ہے (مفردات)

[2] بعض مفسرین کے نزدیک دو جملوں کے درمیان واؤ اور کے بجائے یا کے معنی میں ہے۔

کی ضرورت کیا تھی ؛ تو حقیقت یہ ہے کہ اس صفت کے ذریعہ متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ خطاء داشتباہ کی بنیاد پر قتل نہیں کرتے تھے، بلکہ عمداً اِسے انجام دیتے تھے اور خود اُن کی نگاہ میں بھی قتلِ انبیاء کا کوئی سبب اور جواز نہیں ہوتا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

بے شک جو ایمان لاچکے ہیں اور جو یہودی ہیں اور نصاریٰ اور صابئین (غرض) جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان سب کے لیے ان کے ربّ کے پاس ان کا اجر ہے اور نہ انہیں خوف ہے اور نہ وہ غم کریں گے۔

اس آیۂ مبارکہ کا محلِ وقوع یہ ہے کہ اس سے قبل بنی اسرائیل کو غضبِ الٰہی کا شکار تبلایا گیا ہے اور اس آیت کے بعد پھر بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے جس میں رفعِ طور، اخذِ میثاق اور ذبحِ بقرہ وغیرہ کے واقعات ہیں اور درمیان میں یہ آیت ہے جو اپنے سیاق و سباق سے بالکل اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہر آیت اپنی حیثیت میں مستقل بالذات وحدت ہے اور چونکہ آیات کی ترتیب تنزیل کے مطابق نہیں ہے اس لیے سیاق و سباق کی روشنی میں نتائج کو دیکھنا ایک ایسا عمل ہے جس سے کسی خاص فائدے کی امید نہیں ہے۔ لیکن یہ اصول جامع و مانع نہیں ہے۔ زیرِ بحث آیات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ ایک مزاج کی ہیں اور ان میں ایک مخصوص موضوعی وحدت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ بنی اسرائیل کے واقعات کے درمیان کس مسئلے کا حل ہے؟ یہ

آیت انسان کو مایوسیوں سے نکال کر امید بلکہ تیقّن کی منزل تک پہنچاتی ہے اور یہ بتلاتی ہے کہ اسلام قنوطیت کا نہیں رجائیت کا دین ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کے لیے یہ طے کر دیا گیا ہے کہ یہ غضب الٰہی کا شکار ہیں اور یہ نافرمان اور تعدّی کرنے والے لوگ ہیں۔ لیکن فوراً یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان کے لیے دروازے بند نہیں ہیں۔ (اَلَّذِیْنَ هَادُوْا) یہ اگر اپنے ایمان و عمل کو درست کر لیں تو نجات کے دروازے ان کے لیے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں اور یہ لوگ خوف و حزن کی جان لیوا دلدل سے باہر آسکتے ہیں ۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس سے مسلمان مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے تمام اقوام عالم کے ان لوگوں کو مراد لیا ہے، جو مدّعی ایمان ہیں۔ یہ قول مزاج قرآن سے اجنبیت کی دلیل ہے اس لیے کہ پورے قرآن میں اس سے مُسلمان ہی مراد لیے گئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ هَادُوْا یہ پہلی بار استعمال ہوا ہے ورنہ اس سے قبل بنی اسرائیل کی اصطلاح استعمال ہو رہی تھی جب تک ان کے کرتوت بیان ہوتے رہے ان کا نسلی نام لیا گیا اور جب نجاتِ اخروی پر بحث کی گئی تو ان کا دینی نام لیا گیا۔ ہُود کا معنی ہے دینِ یہودیت میں داخل ہونا۔ هَادَ و تَهَوَّدَ وہ یہودی ہو گیا۔ "هَادُوْا"[1] کی اصل پر علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس کی اصل یہودیوں کا یہ قول ہے جو قرآن میں نقل ہوا ہے۔ "اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ"[2] (ہم نے تیری بارگاہ کی طرف رجُوع کیا اور توبہ کی) دوسرے گروہ کے خیال میں اس کی اصل روگردانی ہے لِاَنَّهُمْ هَادُوْا عَنِ الْاِسْلَامِ (اس لیے کہ انہوں نے اسلام سے روگردانی کی) بعض لوگوں کے نزدیک یہ یہودی سے بنایا گیا ہے (لفظ یہودی اس قوم کے لیے ہجرت بابل کے بعد عام طور سے استعمال کیا جانے لگا تھا)، اور یہودی کا لفظ یہوداؔ سے بنایا گیا ہے جو ایک علاقے کا نام ہے۔ جہاں سلیمان ابنِ داؤد علیہما السلام کی نسل کی حکومت تھی۔

النصارٰی۔ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متبعین کا نام ہے اس کا واحد نصرانی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا۔[3] (ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی)۔ واحد قرآن میں صرف ایک ہی بار استعمال ہوا ہے اور اس کی جمع نصارٰی چودہ (۱۴) مرتبہ۔ فلسطین کے ایک علاقے گلیل کے ایک قصباتی شہر ناصرہ میں حضرت عیسٰی کا بچپنا گزرا اسی مناسبت سے آپ مسیح ناصری کہے جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے آپ کے پیرو نصرانی اور نصارٰی کہلاتے ہیں۔

---

[1] یہ لفظ قرآن مجید میں دس مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

[2] سورۂ اعراف ۱۵۶۔

[3] سورۂ آل عمران ۶۷۔

الصّابِئِین یہ لفظ جمع کی صورت میں تین بار استعمال ہُوا ہے۔ سُورۂ بقرہ کے علاوہ دو آیات مندرجہ ذیل ہیں۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔" [1]

"بے شک جو ایمان لا چکے ہیں اور یہودی اور صابئی اور نصاریٰ (غرض) جو بھی اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کے لیے نہ خوف ہے اور نہ رنج ہو گا۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا ۖ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ" [2]

"بے شک جو ایمان لا چکے ہیں اور یہودی اور صابئی اور نصاریٰ اور مجوسی اور مشرکین، یقیناً اللہ ان سب کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔"

سُورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ کی آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صابئین درحقیقت موحّد تھے جبھی انھیں یہود و نصاریٰ کی صف میں رکھا گیا ہے اور سُورۂ حج کی آیت سے ان کے مشرک ہونے کی نفی ہوتی ہے اس لیے کہ مشرکین کو ایک الگ قسم کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

راغب اصفہانی کے قول کے مطابق یہ لوگ دینِ نوح کے متبعین ہیں۔ ابو ریحان بیرونی کے قول کے مطابق ان کے دین کے بانی کا نام یوذاسف ہے۔ یہ ایرانی بادشاہ طہمورث کا معاصر تھا اور علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی دینی تحریک کا آغاز ہندوستان میں کیا۔ بعد میں یہ دین روم، یونان اور بابل وغیرہ میں پھیل گیا۔ یہ لوگ اپنے ایک روحانی پیشوا ہرمس کو ادریس سمجھتے ہیں جنہیں توریت میں اخنوخ کہا گیا ہے۔ بعض کے خیال میں یوذاسف ہی ہرمس ہے۔

ان کے عقیدے میں عالم کا ایک خالق ہے، جو حکیم ہے اور حدوث کی صفات سے پاک ہے۔ یہ لوگ خدا کو الوہیت میں یکتا سمجھتے ہیں عبودیت میں نہیں اور اس کی توصیف اثبات کی بجائے نفی سے کرتے ہیں۔ مثلاً وہ عاجز نہیں ہے، وہ جاہل نہیں ہے، اسے موت نہیں آتی، وہ ظلم نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتے

---

[1] سُورۂ مائدہ ۶۹۔

[2] سُورۂ حج ۱۷۔

ہیں کہ چونکہ ہم اس تک براہ راست پہنچنے سے عاجز ہیں۔ لہٰذا فرشتوں کے وسیلے سے اس کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ فرشتے اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ اور شفیع ہیں اس لیے وہ انہیں رب سمجھتے ہیں۔ اور ان کی عبادت بھی کرتے ہیں۔

یہ لوگ ستاروں کی شکلوں پر مبنی بُت بناتے ہیں اور ہیکل و معبد تعمیر کرتے ہیں بعض ستاروں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خیر و شر میں تاثیر رکھتے ہیں۔ پہلی ستارہ پرست قوم نمرود کی قوم تھی۔ بعض محققین کی نگاہ میں صابئین انہیں کی باقیات ہیں۔

ان کی بڑی تعداد بین النہرین کے ایک شہر حرّان میں تھی اور آج بھی اس دین کے پیرو ایران میں شوستر اور دزفول کی طرف اور عراق کے شمالی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ دریائے کارون اور دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر آباد صابئی اپنے آپ کو حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہما السلام کے دین پر قرار دیتے ہیں یَا یَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ [1] سے توریت مراد لی گئی ہے، لیکن صابئین کے پاس ایک مستقل کتاب پائی جاتی ہے جسے وہ حضرت یحییٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں [2]

اس آیۂ مبارکہ میں مسلمان، یہودی، عیسائی اور صابئین، فقط چار گروہوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اس لیے کہ یہی اس عہد کے معروف ادیان تھے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر قوم میں رسُول بھیجے گئے ہیں [3] اس لیے امکان ہے کہ بہت سے ایسے ادیان موجود ہوں جو سرچشمۂ وحی سے پھوٹے ہوں اور مذکورہ تین ادیان کی طرح انھیں بھی اس کے ماننے والوں نے مسخ کر دیا ہو تو یہ سہولت جو مذکورہ بالا ادیان کے ماننے والوں کو دی گئی ہے۔ کیا کسی ایسے دوسرے دین کو نہیں مل سکتی جو انھیں کی طرح آسمانی ہو؟ اس کا جواب خود آیت میں موجود ہے۔ اس میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو ایمان لائے الخ" بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے الخ" یہ تعمیم تبلاتی ہے کہ وہ ادیان جن کے سوتے سرزمین توحید سے پھوٹے ہیں وہ سب کے سب اس دائرہ میں شامل ہوں گے۔

یہودی اور بعض دوسرے اہل مذاہب اپنے دین کو نسل کی طرح ایک ایسا گنبدِ بے در سمجھتے تھے کہ کسی دوسرے دین کے ماننے والے کے لیے اس میں داخلہ کا امکان نہ تھا۔ یہ خصوصیت یہودیوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اس آیت میں اس گمانِ فاسد کی بھی رد کی گئی ہے اور تبلایا گیا ہے کہ دین میں رنگ و نسل و

---

[1] سورۂ مریم ۱۲۔

[2] قاموس قرآن، تفسیر المیزان اور دیگر کتب سے اقتباسات پیش کئے گئے تفصیلات کے لیے ادیان و فرق کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

[3] سورۂ نحل ۳۶۔

ونژاد کا کوئی دخل نہیں ہے اور اس کی بنیاد فقط اور فقط ایمان اور عمل صالح پر ہے۔

رسالت محمدؐ پر ایمان

اس آیت میں شرطِ نجات فقط خدا اور قیامت پر ایمان ہے رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہی وہ منزل تھی جہاں بہتوں نے دھوکہ کھایا اور وحدت ادیان کا یہ تصور دیا کہ خلوص کے ساتھ کسی بھی دین پر عمل کرنے سے نجات ہو جائے گی۔ اس کے لیے اسلام لانا اور آخری نبی کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس مسئلے پر کئی جہتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی جہت تو یہ ہے کہ مفسرین نے ایک واقعے کے ذیل میں یہ نقل کیا ہے کہ سلمان فارسی نے چند عیسائی راہبوں کی نجات کے سلسلے میں رسُول اکرمؐ سے سوال کیا تھا۔ اسی ضمن میں یہ آیت نازل ہُوئی۔

" فدعی سلمان فقال نزلت هذه الاٰیة فی اصحابك ثم قال من مات علی دین عیسٰی قبل ان یسمع بی فهو علی خیر ومن سمع بی ولم یؤمن بی فقد هلك "[1]

" تو آپ نے سلمان کو بلایا اور فرمایا کہ یہ آیت تمہارے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہُوئی ہے، پھر فرمایا کہ جو دین عیسیٰ پر مر جائے اور اس تک میری نبوّت کی خبر نہ پہنچی تو وہ خیر پر مرا اور جس تک خبر پہنچی ہو اور وہ ایمان نہ لایا ہو تو وہ ہلاک ہُوا "

دوسری جہت یہ ہے کہ جب تک کسی موضوع کی ساری آیات پیش نظر نہ ہوں اور سُنّت بھی سامنے نہ ہو اس وقت تک تنہا کسی ایک آیت کو مدّ نظر رکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ پُورا قرآن ایک موضوعی وحدت ہے اور خود قرآن ہی اپنی تفسیر بھی کرتا ہے اور بیشتر مقامات پر سُنّت سے بھی روشنی ملتی ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا روایت سے واضح ہے۔

اس مسئلے پر مختلف آیاتِ قرآنی کے ذریعہ بحث کر کے کسی حتمی نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے مثلاً اس سُورہ کے آغاز میں ارشاد ہے۔

" وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق

---

[1] تفسیر دُرِّ منثور جلد اوّل صفحہ ۷۴۔

وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[1]

"اور جو تم پر نازل ہونے والی اور تم سے قبل نازل ہونے والی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ لوگ اپنے ربّ کی ہدایت پر ہیں اور وہ کامیاب لوگ ہیں"

یعنی نجات کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے ایمانوں کے ساتھ قرآن پر بھی ایمان ہو۔ اب اس نتیجے کے ساتھ اس آیۂ مبارکہ کو ملا کر دیکھا جائے تو ہم پھر اسی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نشان دہی مندرجہ بالا آیت نے کی تھی۔

" وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَھُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ"[2]

"اور جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ اپنی نماز کی حفاظت بھی کرتے ہیں"

یعنی ایمان بالآخرۃ کا لازمہ ایمان بالقرآن ہے اور بہت واضح ہے کہ ایمان بالقرآن اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے۔ جب تک کہ رسالتِ محمدؐ پر ایمان نہ ہو۔ قرآن مجید کے مطالعے کے دوران ایسی بہت سی آیات نگاہوں سے گزرتی ہیں جو اس آیت کی توضیح و تشریح میں ممد و معاون ہیں ہم نے اسی آیت کی دوسری شکل سورہ مائدہ (۶۹) کے حوالے سے پچھلے اوراق میں نقل کی ہے اس سے پہلے کی آیت ہمارے دعوے پر برہانِ قاطع ہے۔

سب سے اہم جہت یہ ہے کہ اس آیت میں کہا گیا کہ مسلمان، یہودی اور عیسائی اور صابئی جو بھی خدا اور قیامت پر ایمان لائے الخ یعنی مذکورہ گروہوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ اس وقت درست ہوگا، جب وہ ایمان نہ رکھتے ہوں۔ ورنہ یہ تحصیل حاصل اور خلافِ عقل ہوگا، جس طرح کے بیٹھے ہوئے شخص سے کہا جائے کہ بیٹھ جاؤ اور کھڑے ہوئے شخص سے کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مذکورہ گروہوں میں سے سب کے سب خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ ایمان لائیں الخ تو اب یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ایمان کے باوجود ان سے کس ایمان کا مطالبہ ہو رہا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے اس کڑی کو تلاش کرنا ہوگا جو اس پورے سلسلے میں بظاہر نظروں سے اوجھل ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان ہوں۔

---

[1] سورۂ بقرہ، ۵/۴۔

[2] سورۂ انعام، ۹۲۔

یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی اُن کا خدا و قیامت پر ایمان اس وقت تک قبول نہیں ہوگا۔ جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بتلائے ہوئے خدا اور انھیں کے بتلائے ہوئے روزِ قیامت پر ایمان نہ لائیں۔ یعنی ان ایمانوں کے تفصیلات نبی آخر سے لینے ہیں، کسی اور سے نہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا
مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ
مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا کہ جو ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور جو اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بنو۔
پھر اس کے بعد تم پلٹ گئے سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم گھاٹا اُٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

میثاق کے معنی عہد و پیمان ہیں۔ بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا وہ توریت میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ موجودہ توریت کی تدوین کرنے والوں کے سہو و نسیان یا تحریف پسندی یا مصلحت کوشی یا دیگر اسباب کی بنا پر کہیں مطالب گنجلک ہو گئے ہیں۔ کہیں واقعات کی

تقدیم وتاخیر میں صحیح ترتیب باقی نہیں رہی، کہیں واقعات میں کمی بیشی محسوس ہوتی ہے اور کہیں اصل واقعہ میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے (پچھلے حوالوں کے بغور مطالعہ سے یہ باتیں واضح ہوسکتی ہیں) یہی سبب ہے کہ وقائع نویسی غیر متوازن اور ناہموار ہو کر رہ گئی ہے اس لیے قرآن مجید سے بہت سے مقامات پر اختلاف نظر آتا ہے۔

بہرحال مذکورہ عہد کے سلسلے میں یہ دو حوالے قابل ذکر ہیں "سو اب اگر تم میری بات مانو اور میرے عہد پر چلو تو سب قوموں میں سے تم ہی میری خاص ملکیت ٹھہرو گے، کیونکہ ساری زمین میری ہے"[۱] تب موسیٰ نے آکر ان لوگوں کے بزرگوں کو بلا کر ان کے رُوبرُو وہ سب باتیں جو خداوند نے اسے فرمائی تھیں بیان کیں اور سب لوگوں نے مل کر جواب دیا کہ جو کچھ خداوند نے فرمایا وہ سب ہم کریں گے اور موسیٰ نے لوگوں کا جواب خداوند کو جا کر سنایا[۲] دوسرا حوالہ یہ ہے "اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیئے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے"[۳]

"واذ اخذنا میثاقکم" آیۂ مبارکہ کے اس جزء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی عہد پہلے ہی لیا جا چکا تھا کہ جب توریت دی جائے گی تو اسے قبول کرو گے اور اس کے بعد کا جزء "ورفعنا فوقکم الطور الخ" یہ بتلاتا ہے کہ چونکہ ان کے مزاج میں سرکشی اور سرشت میں نافرمانی تھی لہٰذا توریت دیتے وقت انھیں اپنے (اختیاری) عہد پر قائم رکھنے کے لیے طور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا تاکہ وہ توریت بھیجنے والے کی قدرت وعظمت اور اس کے جلال وجبروت سے مرعوب ہو کر توریت پر کاربند رہیں۔ گویا یہ عمل مذکورہ اجمالی عہد کے بعد تفصیلی عہد پر کاربند رہنے کے لیے کیا گیا۔[۴]

رفع طور

طُور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دس (۱۰) جگہوں پر استعمال ہوا ہے، جس میں سے

---

[۱] خروج باب ۱۹ فقرہ ۵۔

[۲] خروج باب ۱۹ فقرات ۷/۸

[۳] خروج باب ۲۴ فقرہ ۳۔

[۴] اس تفصیلی عہد کے جستہ جستہ موضوعات قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں۔ بقرہ ۸۳/۸۴۔ مائدہ ۱۲ اعراف ۱۶۹/۱۷۰ ان آیات سے میثاق کے مضامین کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ یعنی توریتِ منزل کے سارے اوامر ونواہی میثاق تھے۔

آٹھ جگہوں پر الف لام کے ساتھ ہے (یعنی مخصوص پہاڑ) اور دو مقامات پر سینا، اور سینین کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہُوا ہے۔ زیرِ تحریر آیت میں طُور سے طُورِ سینا ہی مراد ہے، یہ ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کی لمبائی دو میل اور چوڑائی ایک میل کی تہائی ہے۔ یہ جزیرہ نمائے سینا میں واقع ہے اور طویٰ کی مقدس وادی کے قریب ہے۔ بعض محققین کی رائے میں حوریب کے پہاڑی سلسلے کی ایک چوٹی کا نام سینا یا طُورِ سینا ہے جسے عرب راس الصفصافہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہیں جناب مُوسیٰ کو احکام عشرہ عطا ہُوئے۔ اس چوٹی کا شمالی حصّہ سہل الرّاحہ کی طرف ہے۔ بنی اسرائیل کی لشکرگاہ سہل الراحہ کے قریب تھی اور وہ احکامِ عشرہ لینے کے لیے اس مقام پر کھڑے ہُوئے تھے (خروج باب ۱۹)

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جب مُوسیٰ علیہ السّلام توریت لے کر طُور سے پلٹے اور حدودِ الٰہی کو بنی اسرائیل کے سامنے بیان فرمایا تو یہ لوگ ان پابندیوں کو سُن کر پریشان ہُوئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بہت ہی سخت احکام ہیں ہم ان کی بجاآوری نہیں کر سکیں گے۔ جب وہ اپنی سرکشی پر قائم رہے تو اللہ نے ان کے سروں پر طور کو بلند کر دیا۔[1] جسے وہ دیکھ کر خیال کرنے لگے کہ وہ ان پر گر پڑے گا۔ اس وقت انہوں نے تسلیم کیا کہ شریعت پر عمل کریں گے، لیکن جیسا کہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے کہ وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہے اور پھر سرکشی و نافرمانی اور فسق میں مبتلا ہو گئے[2] یہ تذکرہ قرآن میں چار مقامات پر ہے۔ اس آیت کے علاوہ بقرہ ۹۳، سُورۂ نساء ۱۵۴، اور سُورۂ اعراف ۱۷۱ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس واقعے میں طور کو بلند کرنے کے لیے دو لفظ استعمال ہُوئے ہیں رفع اور نتق (اعراف) رفع کے معنی بلند کرنا اور نتق کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر بلند کرنا ہیں۔ بعض ایسے مفسرین جو مغرب کے علم و فکر سے مرعوب ہیں، انہوں نے اس عمل کو خلاف قانونِ طبیعت قرار دے کر یہ توجیہ کی ہے کہ پہاڑ درحقیقت ان کے سروں پر سائبان کی طرح جھکا ہُوا تھا، اس پہاڑ میں شدّت کی لرزش پیدا ہوئی اور وہ یہ سمجھے کہ ان کے سروں پر گرے گا۔ یہ توجیہ قرآن مجید کی مذکورہ چاروں مقام کی آیات کے ظاہری اور متبادر مفہوم کے خلاف ہے۔ اس توجیہ کا سرچشمہ غالباً توریت کا یہ حوالہ ہے: "وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوں اور کوہ سینا پر

---

[1] محققین نے قدیم یہودی روایات کے حوالے سے قرآن کے اس مقدس جُملے کی تائید فراہم کی ہے اور خدا نے ان کے اُوپر کوہ سینا کو اُلٹ دیا" "خدا نے پہاڑ کو الٹ کر اوندھا کر دیا" (جیوئش انسائیکلوپیڈیا ج ۴ صفحہ ۲۲۱) میں نے پہاڑ کو تمہارے اوپر اوڑھا دیا، وہ گویا تم پر ایک روپوش کی طرح تھا۔

(عبوداہ سارا ۵ فصل ۲ باب ۱۲ بحوالہ انیس الاعلام
ج ۲ صفحہ ۳۸۲)

[2] تفسیر نور الثقلین و مجمع البیان وغیرہ۔

زیر و بالا دھواں تھا، کیونکہ خداوند شعلوں میں ہو کر اس پر اُترا اور شور کا سا دھواں اس پر اُٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔[۱]

کہا جاتا ہے کہ پہاڑ کو سروں پر معلق کر کے شریعت کو تسلیم کروانا اکراہ ہے اور اسلامی رُوح آزادی کے خلاف ہے حالانکہ آیت میں اخذ میثاق پہلے ہے اور رفع طور بعد میں ہے۔ یعنی جب بنی اسرائیل نے عہد کر لیا تھا کہ ہم شریعت پر عمل کریں گے تب انھیں شریعت دی گئی اور ان کے مزاج کی سرکشی کو دیکھتے ہُوئے تاکید و تہدید کے لیے طور کو سروں پر معلق کیا گیا۔ یہی بات اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ[۲] (ہم نے ان سے لیے ہُوئے عہد کے سبب ان پر طور کو بلند کر دیا)۔

خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ الخ میں تبلایا گیا کہ تقوٰی کی بنیاد یہی ہے جو کچھ دیا جا رہا ہے اس پر قوت اور سختی کے ساتھ عمل پیرا رہو اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ان احکامات کو یاد رکھو امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہُوا کہ أَقُوَّةٌ فِي الْأَبْدَانِ أَمْ قُوَّةٌ فِي الْقُلُوبِ (اس آیت میں قوت سے مراد جسمانی قوت ہے یا قلبی؟) آپؑ نے فرمایا فِيهِمَا جَمِيعًا (دونوں مراد ہیں)۔ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ بدنی قوت اعمال و طاعات میں صرف ہو اور قلبی قوت اصُول و عقائد میں اس لیے کہ دین اصُول و اعمال دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔

پھر یہ تبلایا گیا کہ انہوں نے عہد کو توڑ دیا اور اگر اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہوتا تو یہ لوگ تباہ و برباد ہو جاتے۔ اس کے فوراً بعد عہد کو توڑنے کی ایک مثال بیان فرمائی گئی ہے۔

---

[۱] کتاب خروج باب ۱۹ فقرات ۱۷/۱۸۔

[۲] سورۂ نساء ۱۵۴۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِـِٕيْنَ ۚ ﴿۶۵﴾
فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ
مَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور یقیناً تم ان لوگوں کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملے میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔

پس ہم نے اسے عبرت بنایا اس دور کے لیے اور بعد کے دور کے لیے اور نصیحت بنا دیا متقین کے لیے۔

سبت کے معنی ہیں کاٹنا اور قطع کرنا۔ یہ لفظ قرآن میں چھ بار استعمال ہوا ہے اور ایک مرتبہ یَسْبِتُوْنَ کے فعل کے ساتھ آیا ہے۔ سبت (شنبہ) اس دن کا نام ہے، جس دن یہود اپنے سارے کام معطل رکھتے تھے اور فقط ذکر و عبادت اور آرام و استراحت کرتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی سے عربی میں آیا ہے اور اس کے معنی ہی استراحت کے ہیں۔ احکام عشرہ کا چوتھا حکم یہ ہے کہ "یاد کرکے تو سبت کا دن پاک ماننا چھ دن تک تو محنت کرکے اپنا سارا کام کاج کرنا لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے اس میں نہ تو کوئی کرے نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا چوپایہ نہ

کوئی مسافر جو تیرے ہاں تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو"۔[1] اس سے واضح ہے کہ سبت (شنبہ) یہودیوں کے آرام کا دن تھا۔

ان آیات میں جس واقعے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے وہ عہد رسالت کے یہودیوں میں مشہور تھا اس لیے آغاز آیت میں یہ جملہ کہ "اور یقیناً تم ان لوگوں کو جانتے ہو" اس بات کی دلیل ہے۔ اگرچہ یہودی روایات میں اب اس واقعے کا سراغ نہیں ملتا[2] اسے مفسرین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد حکومت[3] میں یہودیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے ایک بستی[4] میں آباد تھا۔ سبت (شنبہ) کے دن مچھلیاں کثرت کے ساتھ سمندر کے کنارے سطح آب پر آ جاتی تھیں اس لیے کہ برس ہا برس سے یہ عادت تھی کہ اس دن کوئی انھیں شکار نہیں کرتا تھا اور سبت کا دن گزرنے کے بعد دوسرے سبت تک ایک بھی مچھلی نظر نہ آتی۔ یہودیوں نے جب یہ صورت دیکھی تو ان کے ایک گروہ نے مچھلیوں کے شکار کے لیے یہ حیلہ کیا کہ ساحل پر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا دیئے اور نالیوں کے ذریعہ انہیں سمندر سے متصل کر دیا۔ جب سبت کے دن وہ گڑھے مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ ان نالیوں کو بند کر دیتے اور یک شنبہ کو جا کر ان کا شکار کرتے اور جب کوئی اعتراض کرتا تو کہتے کہ ہم نے سبت کے دن نہیں بلکہ یک شنبہ کو شکار کیا ہے۔ اس صورت حال کے سبب لبستی کے یہودی تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ مچھلی کے شکاریوں کا تھا، دوسرا گروہ انہیں منع (نہی عن المنکر) کرنے والوں کا تھا اور جب وہ شکاری نہ مانے تو اس گروہ نے ان سے قطع تعلق کر لیا، اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے اس مسئلے پر سکوت کیا تھا، وہ نہ تو خود شکار کرتے تھے اور نہ شکار کرنے والوں کو نہی عن المنکر کرتے تھے۔ ایک دن عذاب آ گیا اور یہ نافرمانی کرنے والے لوگ بندر بنا دیئے گئے۔ وہ لوگ مسخ ہونے کے بعد تین دن زندہ رہے، پھر ہلاک ہو گئے، موجودہ بندروں سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس واقعہ کو مزید تفصیلات کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:

"وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

---

[1] کتاب خروج باب ۲۰ فقرات ۸/۹/۱۰۔

[2] توریت کے بعض حوالوں کو بہ تکلف اس پر چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

[3] آپ کا عہد حکومت بقول بعضے ۱۰۵۰ ق م تا ۱۰۱۷ ق م اور بقول بعضے ۱۰۱۳ تا ۹۷۳ ق م ہے۔

[4] اس بستی سے اکثر مفسرین کے نزدیک شہر ایلہ مراد ہے جو مدین اور طور کے درمیان ہے۔ بحیرہ قلزم کے کنارے واقع ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد شہر مدین ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ
عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا
نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا
عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝[1]

اور یہودیوں سے اس بستی کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت کے بارے میں حد سے تجاوز کرتے تھے، جب ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن آشکارا آتی تھیں اور جس دن ان کا سبت نہ ہوتا تھا اس دن نہیں آتی تھیں، ہم اس طرح ان کے فسق کے سبب ان کا امتحان کرتے تھے اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ وہ قوم جسے اللہ ہلاک کرنے والا یا عذاب دینے والا ہے اسے کیوں نصیحت کر رہے ہو انہوں نے کہا تاکہ اللہ کی بارگاہ میں معذور ہو جائیں شاید وہ اس عمل سے پرہیز کریں۔ پس جب انہوں نے جس کی نصیحت کی گئی تھی اسے چھوڑ دیا ہم نے برائی سے روکنے والوں کو نجات دے دی اور ظلم کرنے والوں کو سخت عذاب میں گرفتار کر دیا یہ ان کے فسق کے سبب تھا پس جب انہوں نے وہ سرکشی کی جس سے روکے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔

ان آیات میں تین گروہوں اور دو عذابوں کا تذکرہ ہے۔ پہلا گروہ نہی عن المنکر کرنے والے دوسرا گروہ نہی عن المنکر نہ کرنے والے بلکہ سکوت اختیار کرنے والے اور تیسرا گروہ سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے والے۔ پہلا گروہ عذابوں سے محفوظ رہا ہے۔ جبکہ دو پر عذاب آگیا۔ دو عذابوں میں سے ایک کو "عذابِ بئیس" فرمایا گیا اور دوسرے کے لیے ارشاد ہوا کہ وہ بندر بنا دیئے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہی عن المنکر نہ کرنے والوں پر عذابِ بئیس آیا اور شکاریوں پر بندر بننے کا عذاب[2]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اصحابِ سبت جسمانی طور پر بندر بن گئے یا فقط اخلاقی اور روحانی طور پر؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ اس حکمِ تکوینی کے سبب کمالِ انسانیت سے خارج ہو گئے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات بندروں جیسی ہو گئی تھیں۔ ان کے دل مسخ ہو گئے تھے، جس کے سبب وہ قولِ حق کو سمجھنے کی توفیق نہ پا سکے۔ آیات کے دقیق مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل جسمانی طور پر ہوا تھا۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ ان آیات کا ظاہری مفہوم

---

[1] سورۃ اعراف ۱۶۳ - ۱۶۶

[2] یہ استنباط آیات کے ظاہر سے ہے۔

مسخ جسمانی ہی پر دلالت کرتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آیات نے کہا کہ جنہوں نے نہی عن المنکر نہیں کیا تھا وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئے تھے اب اگر شکاریوں کا عذاب مسخ باطنی ہو تو یہ پہلے گروہ کے عذاب سے کم درجہ کا قرار پائے گا۔ جب کہ عدل و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے گروہ کے مقابلے میں شکاریوں کے عذاب کو شدید تر اور سخت تر ہونا چاہیئے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ یہ ان آیات میں ایسا ادنیٰ ترین اشارہ بھی موجود نہیں ہے جو مسخ اخلاقی یا مسخ باطنی پر دلالت کرتا ہو۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ اس واقعہ کو حال اور مستقبل کے لیے عبرت اور متقین کے لیے نصیحت قرار دیا گیا ہے۔ بندروں جیسی عادتیں رکھنے والے افراد (بلکہ بدتر) ہر دور میں رہے ہیں لیکن کسی نے اسے عذاب نہیں سمجھا اور نہ عبرت و نصیحت حاصل کی، مزید یہ کہ مسخ باطنی ایک غیر محسوس شے ہے اس لیے نہ وہ عبرت بن سکتا ہے اور نہ نصیحت۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ خوارقِ عادت (غیر معمولی افعال) سے بھری ہوئی ہے تو مفسرین کہاں کہاں تاویلیں فرمائیں گے اور کس عقلی ضرورت کے سبب تاویلیں فرمائیں گے؟

بعض مفسرینؒ[1] کا خیال ہے کہ اللہ کسی گنہگار کو مسخ کر کے بنی نوع انسان سے خارج نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سنت ایک خاص نہج پر جاری ہے اور یہ عمل مسخ اس کی سنت تخلیق میں داخل نہیں ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو جتنے بھی خوارق عادت اور معجزات انبیاء نے دکھلائے ہیں اور جتنے مختلف النوع عذاب گزری ہوئی قوموں پر آتے رہے ہیں وہ سب سُنت الٰہی کے برخلاف قرار پائیں گے۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ خود خرق عادت بھی اللہ کی ایک عظیم الشان سُنت ہے۔ جسے وہ کبھی کبھی بندوں کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔ انسان کا اپنی شکل سے منتقل ہو کر کسی دوسری شکل میں چلا جانا محالِ عقلی نہیں ہے، بلکہ ممکن عقلی ہے تو اگر کبھی آیۂ مبارکہ یا روایت صحیحہ سے اس کا وقوع ثابت ہو جائے تو غیر ضروری طور پر اس کی تاویل شایانِ تفسیر نویسی نہیں ہے۔

---

[1] استاد محمد عبدہ مصری وغیرہ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ
اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ
قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا
بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا
تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ
لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ
الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ
الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ

فِیْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو انہوں نے کہا کیا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں کہا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں ہو جاؤں۔
انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے ہمارے لیے پوچھیئے کہ وہ ہمیں بتلائے کہ وہ کیسی ہے، کہا رب کہتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہے اور نہ بن بیاہی دونوں کے درمیان ہے تو اب جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اسے کر ڈالو۔
انھوں نے کہا کہ اپنے رب سے ہمارے لیے پوچھیئے کہ وہ ہمیں تبلائے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ کہا وہ کہتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی گائے ہے دیکھنے والوں کو اچھی لگتی ہے۔
کہا اپنے ربّ سے ہمارے لیے پوچھیئے کہ وہ کیسی ہے۔ درحقیقت گائے میں ہم کو شبہہ پڑ گیا ہے اور اگر اللہ نے

چاہا تو ہم راہ پا جائیں گے۔
کہا رب کہتا ہے کہ وہ گائے نہ محنت کرنے والی ہے کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے بے عیب ہے اس میں کوئی داغ نہیں ہے، انہوں نے کہا اب آپ نے صحیح تلا دیا پھر انہوں نے اس کو ذبح کر دیا اور لگتا نہ تھا کہ وہ یہ کریں گے۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کے سبب سورہ کا نام بقرہ قرار پایا ہے۔ بقرہ کا لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کے آخر کی "ۃ" تانیث کی نہیں بلکہ وحدت کی ہے (اقرب الموارد اور قاموس وغیرہ) بعض محققین کی نگاہ میں یہ تاء تانیث ہی کے لیے ہے۔ بقرۃ گائے کے لیے اور ثور بیل کے لیے استعمال ہوتا ہے (مجمع البیان طبرسی ومفردات راغب اصفہانی) قول اول کے مطابق بقرۃ سے آیت میں گائے مراد نہیں ہے، بلکہ اس کی جنس ہے چاہے وہ بیل ہو یا گائے اور دوسرے قول کے مطابق گائے مراد ہے۔

اس سلسلہ میں مفسرین نے کئی ملتے جلتے واقعات[1] تحریر کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک ثروت مند شخص تھا جس کا نام عامیل تھا وہ بے اولاد تھا اور اس کا وارث اس کا ایک بھتیجا تھا اس نے دولت کے لالچ میں چچا کو قتل کر دیا اور لاش کو ایک راستے پر ڈال دیا قاتل کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ قاتل کا نام تلا دیں، اس وقت آپ نے اس امر الٰہی سے گائے کے ذبح کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

ان آیات کے مطالعہ سے پہلی نگاہ میں جو بات سامنے آتی ہے وہ خدا کے ساتھ گستاخی ہے انہوں نے تین بار موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ" (اپنے رب سے پوچھ کر تلایئے) گویا ان کی نگاہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان تفسیر برہان اور تفسیر نور الثقلین سے ان کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

میں وہ فقط موسیٰ کا رب ہے اور بنی اسرائیل سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ "ربنا" (ہمارا رب) کہے اس کی مثال اقوالِ انبیاء اور اقوالِ مؤمنین کی صورت میں بکثرت ہے[1] دوسری بات جو سامنے آتی ہے وہ اپنے نبی کے ساتھ ان کا رویہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں کہ ہم تو آپ سے قاتل کے بارے میں سوال کر رہے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں؟ جس پر حضرت موسیٰ کو فرمانا پڑا کہ پناہ بخدا میں اور جاہلوں میں اپنا شمار کرا لوں؟ اس جملہ سے اس اذیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کو پہنچی ہوگی، پھر ان کا یہ کہنا کہ اب آپ نے صحیح بتلا دیا ان کے گستاخانہ مزاج کا غماز ہے گویا ان کی نگاہ میں ان پر مبعوث ہونے والا صاحبِ عزم رسول اس سے قبل صحیح نہیں تبلا رہا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ کثرتِ سوال، زیادہ چھان بین اور بال کی کھال نکالنا یا تو ان کا قومی مزاج تھا، یا پھر وہ ان سوالات کی آڑ لے کر گاؤکشی سے بچنا چاہ رہے تھے۔ بہر حال کثرتِ سوال کے یہ دونوں ہی اسباب ناپسندیدہ ہیں۔

کثرتِ سوال کے سلسلے میں قرآن مجید نے بہت واضح طریقہ سے فرمادیا ہے " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ[2] (اے ایمان لانے والو (زیادہ) چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں تکلیف دیں گی)، قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ[3] (تم سے پہلے ایک قوم نے ان چیزوں کا سوال کیا تھا پھر وہ ان کا انکار کرنے لگے)۔[4]

اگرچہ قرآن مجید کی طرح اس واقعہ کا واضح تذکرہ توریت میں نہیں ہے لیکن بعض مقامات کا مطالعہ مفید مطلب ہو سکتا ہے: اگر اس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے، کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلوں کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو اور اس شہر کے بزرگ اس

---

[1] سورۂ بقرہ ۱۲۷/۱۲۸، سورۂ آل عمران ۱۹۱/۱۹۲/۱۹۳۔

[2] سورۂ مائدہ ۱۰۱۔

[3] سورہ مائدہ ۱۰۲۔

[4] ایک گائے ذبح کرو کا حکم بتلاتا ہے کہ اگر بنی اسرائیل کسی ایک گائے کو ذبح کر دیتے تو امتثال امر ہو جاتا، لیکن کثرت سوال نے انھیں مشکل میں ڈال دیا اور وہ مجبور ہوئے کہ ایک خطیر رقم کے مقابل مذکورہ گائے کو خریدیں۔

بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں بچھیا کی گردن توڑ دیں تب بنی لاوی کے جو کاہن ہیں نزدیک آئیں، کیونکہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چُن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور اُن ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں اس بچھیا کے اُوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خُون نہیں ہوا اور نہ یہ کہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے سو اے خداوند اپنی قوم اسرائیل کو جسے تو نے چھڑایا ہے معاف کر اور بے گناہ کے خُون کو اپنی قوم اسرائیل کے ذمہ نہ لگا تب وہ خون ان کو معاف کر دیا جائے گا یُوں تو اس کام کو کر کے جو خداوند کے نزدیک درست ہے بے گناہ کے خون کی جواب دہی کو اپنے اُوپر سے دُور و دفع کرنا“ [۲]

”اور خداوند نے مُوسٰی اور ہارُون سے کہا کہ شرع کے جس آئین کا حکم خداوند نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ تو بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ تیرے پاس ایک بے داغ اور بے عیب سُرخ رنگ کی بچھیا لائیں جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو اور تم اسے لے کر الیعزر کاہن کو دینا کہ وہ اسے لشکر گاہ کے باہر لے جائے اور کوئی اسے اس کے سامنے ذبح کر دے اور الیعزر کاہن اپنی انگلی سے اس کا کچھ خُون لے کر اسے خیمۂ اجتماع کے آگے کی طرف سات بار چھڑکے پھر کوئی اس کی آنکھوں کے سامنے اس گائے کو جلا دے۔ یعنی اس کا چمڑا اور گوشت اور خون اور گوبر ان سب کو وہ جلائے“ [۳]

اگر مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کو قتل کے قصے سے الگ کر کے دیکھا جائے (جیسا کہ بعض مفسرین نے ایسا ہی کیا ہے) اور اسے گائے کی قربانی کا ایک مستقل بالذات حکم سمجھا جائے تو مذکورہ بالا دونوں حوالوں سے ان کی تطبیق ممکن ہے لیکن کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے

گائے کی قربانی کا حکم مستقل بالذات ہو یا کسی قتل کے سلسلے میں ہو یہ سوال بہر حال قابل غور ہے کہ اگر پہلا قول درست ہے تو اس مستقل بالذات حکم کی ضرورت کیا تھی؟ اور اگر دوسرا قول صحیح ہے تو کسی اور طریقہ سے قاتل کی نشان دہی کیوں نہ کی گئی؟ یا اگر قربانی ہی کے ذریعے سے نشان دہی کرنی تھی تو گائے کی جگہ کسی اور جانور کے ذبح کا حکم کیوں نہ ہوا؟ اسے حل کرنے کے لیے ہمیں قدیم مصری تہذیب

---

[۱] اس طرح انہیں قسم کھانے کا طریقہ بتلایا گیا۔

[۲] کتاب استثنا ۲۱ فقرات ۱-۹۔

[۳] کتاب گنتی باب ۱۔ ۵۔ گنتی کے انیسویں اور بیسویں باب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خروج کے بعد اور دشتِ صین میں داخل ہونے سے قبل کا ہے۔

کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ قدیم مصریوں کی تہذیب میں دیوی دیوتاؤں کے علاوہ جانوروں کی بھی پوجا کی جاتی تھی اور اس میں خاص طور سے گائے بیل اور بچھڑے مقدس خیال کیے جاتے تھے۔ [۱] مصری اپنے دیوتا حورس کا چہرہ گائے کی شکل کا بناتے تھے اور یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ کرۂ زمین ایک گائے کی پشت پر قائم ہے۔ یہ لوگ گائے کی پوجا کے علاوہ بیل کی پرستش کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مقدس بیل ایپس (APIS) کی پوجا کا رواج عام تھا اور یہ پوجا علاقائی نہ تھی بلکہ پورے ملک میں رائج تھی۔ اس کی تفصیلات قدیم مصریات کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بنی اسرائیل کئی صدی سے مصر میں آباد تھے۔ جب زمانے کے عمل نے آبا کی توحید پرستی کے تصور کو ذہنوں میں دھندلا کردیا تو آہستہ آہستہ علاقے کے وہ مشرکانہ عقائد و رسوم اُن کے ذہنوں میں در آئے جو اُن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شرک کا یہ زخم اتنا کاری تھا کہ خروج کے بعد جب یہ لوگ وادیٔ سینا میں داخل ہوئے اور انہوں نے مقامی بستیوں میں مندر اور بُتکدے دیکھے اور ان میں بُتوں کی پوجا ہوتے ہوئے دیکھی تو موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے اجْعَلْ لَنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ [۲] (جیسے ان کے معبود ہیں ایک معبود ہمارے لیے بنا دو)۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ مقامی بت پرست کنعانی عمالقہ تھے اور ان کے بت گائے کی شکل کے تھے۔ یہی بنی اسرائیل کا وہ جذبہ گاؤ پرستی تھا جس نے موسیٰ کی مختصر غیبت میں گوسالہ تراش لیا تھا اور اسی جذبہ کی وضاحت کے لیے قرآن نے فرمایا۔ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (اور لگتا نہ تھا کہ وہ گائے ذبح کریں گے)

گاؤ پرستی کے شرک کو توڑنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کے ہاتھوں گاؤ کشی کا عمل تسلسل کے ساتھ کروایا جائے تاکہ اس جانور کی عظمت و تقدیس دلوں کی کمین گاہوں سے نکل جائے، یہی سبب ہے کہ شریعت توریت میں گائے کی قربانی کا حکم کئی جگہوں پر ہے۔

---

[۱] نیل کے علاوہ فرات اور سندھ کے دریاؤں کے کناروں پر پروان چڑھنے والی تہذیبیں بھی کاشتکاری کے سبب گائے کی تقدیس کے مرض میں مبتلا تھیں ان علاقوں کے آثار قدیمہ میں دیواروں پر بیل گائے کی بکثرت تصاویر پائی گئی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ گاؤ پرستی انہیں قدیم زمانوں کی باقیات السیئات میں ہے۔

[۲] سورۂ اعراف ۱۳۸۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا تو آپس میں جھگڑنے لگے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے اللہ اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔
تو ہم نے کہا کہ اس (گائے) کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارو اسی طرح خدا مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ عقل سے کام لو۔

یہ اسی قصۂ قتل کا بیان ہے، جسے پچھلی آیات کے ذیل میں تحریر کیا گیا ہے۔ مفسرین کا بیان ہے کہ وہ گائے ایک نیک شخص کی تھی جو اپنے والدین کی بہت خدمت کیا کرتا تھا[1] بالآخر بنی اسرائیل نے اس

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد اول صفحہ ۱۳۴۔

شخص سے وہ گائے ایک خطیر رقم کے عوض خریدلی اور اسے ذبح کر دیا۔ پھر اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتلوں کے نام بتلائے اور پھر گر کر مر گیا۔

اس پورے واقعے میں آیات کے دو اجزاء قابلِ غور ہیں: "لگتا نہ تھا کہ وہ گائے کو ذبح کریں گے"[1] پھر زیرِ تحریر آیت کا یہ جزء کہ "جو کچھ تم چھپا رہے تھے اللہ اس کو ظاہر کرنے والا تھا" ان دونوں جملوں کی ساخت اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ وہ لوگ قاتل سے واقف تھے اور نام کو چھپانا چاہ رہے تھے اور چونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قاتل پکڑا جائے اور اسے سزا ہو لہٰذا گائے کی تعیین میں مین میخ نکال رہے تھے۔

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس بات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ اللہ کی ایک نشانی ہے۔ جس سے عقلمند فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

قاتل کی نشاندہی کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتی تھی لیکن پروردگار عالم نے اسے گائے کے ذبح کے ذریعہ ظاہر فرما دیا۔ وہ اپنے مصالح کو بہتر جانتا ہے۔ لیکن سرسری طور سے بھی اگر جائزہ لیا جائے تو اس واقعہ کے مختلف جہات سامنے آتے ہیں۔ اس ذریعے سے گوسالہ اور گائے کی تقدیس پر ضرب کاری لگی۔ ایک غریب شخص کی مالی مدد ہوئی، قاتل پکڑے گئے[2] اور مردے کے زندہ ہونے سے بنی اسرائیل کو عین الیقین کرا دیا گیا کہ قیامت کے دن مُردوں کا زندہ ہونا اسی قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوگا۔ جس نے اس ایک مردہ کو زندہ کیا ہے۔

---

[1] اس جملہ کی ایک توجیہ پچھلے صفحات میں گزر چکی۔
[2] بعض روایات میں ایک قاتل بعض میں کئی قاتلوں کا ذکر ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ
لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ
فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے سو وہ پتھر کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں اور پتھر تو ایسا بھی ہے کہ اس سے نہریں پھوٹتی ہیں اور کوئی ان میں سے ایسا ہے کہ پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے اور کوئی ان میں سے ایسا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے گر پڑتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ تم پر اتنی نعمتیں نازل ہوئیں، اتنے معجزات دکھلائے گئے، حد یہ ہے کہ قاتل کی شناخت کے لیے وہ طریقہ استعمال کیا گیا جو خود معجزہ تھا لیکن تمہارے دل نرم ہونے کی بجائے سخت رہے اور سخت تر ہوتے گئے۔ اس آیت میں أَو (یا) بمعنی بَلْ (بلکہ) ہے

اگرچہ خطاب ان یہودیوں سے ہے جو نزول آیت کے وقت موجود تھے، لیکن درحقیقت یہ پوری قوم سے اجتماعی خطاب ہے۔ اس طریقہ میں یہ لطف رکھا گیا ہے۔ کہ چونکہ عصرِ قرآن کے یہودی اپنے بزرگوں کے کرتوت سے راضی تھے اور خود بھی آخری رسولؐ کے آیات بینات دیکھنے کے باوجود اس ذاتِ گرامی کے منکر تھے اس لیے انہیں بھی اس خطاب میں شریک کیا گیا ہے جو درحقیقت ان کے آباء واجداد سے تھا۔

پھر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اگرچہ پتھر ایسے بھی ہیں جن میں سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور وادیوں کو سیراب کرتی چلی جاتی ہیں اور ایسے پتھر بھی ہیں جن سے پانی رستا رہتا ہے۔ پھر چشموں اور چھوٹی چھوٹی جھیلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تو پتھر سختی کے باوجود پھٹ جاتا ہے۔ لیکن تمہارے دلوں میں اتنا شگاف بھی نہیں آتا کہ اس میں معرفتِ الٰہی اور محبّت دین و شریعت داخل ہو سکے۔ بنی اسرائیل مصر سے خروج کے بعد ریگستانوں اور بیابانوں میں پتھروں سے پانی نکلتے ہوئے دیکھ چکے تھے اس اعتبار سے یہ تشبیہ بلاغتِ قرآنی کی بہترین مثال ہے۔

اسی طرح یہ بتلایا گیا کہ خوفِ خدا سے پتھر گر پڑتے ہیں۔ خواہ یہ خوف کسی سطح شعور کا نتیجہ ہو، جو ہمارے علم میں نہیں ہے، یا اس سے مراد وہ عام قانونِ طبیعت ہو جو قدرت کے اشاروں پر چل رہا ہے —— جو بھی ہو — یہ طے ہے کہ پتھروں پر خدا کی ہیبت ہے، لیکن تم عجیب لوگ ہو کہ تم پر اس کی ہیبت بھی نہیں ہے، ممکن ہے کہ اس پتھر سے مراد طُور کے وہ اجزاء ہوں جو تجلّی الٰہی سے گر پڑے تھے اس اعتبار سے یہ تشبیہ بھی بلاغتِ قرآنی کی بہترین مثال ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ
فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ
یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ
یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا
فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ
وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا تم یہ خواہش رکھتے ہو کہ یہ تمھاری بات قبول کرلیں گے حالانکہ ان میں کچھ لوگ اللہ کا کلام سنتے تھے اور اس کو سمجھ لینے کے بعد اس کی تحریف کرتے تھے اور وہ خوب جانتے تھے۔

اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں تو کیا تم وہ اُن سے کہتے ہو جسے اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے تاکہ وہ تمہارے رب کے حضور تم پر حجت قائم کر سکیں کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور اور جو آشکارا کرتے ہیں۔

آیت کا خطاب مسلمانوں سے ہے اور استفہام انکاری ہے۔ اس میں پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کو یہ بتلایا گیا ہے کہ یہودی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں ایمان کا صلہ باء کی جگہ لام سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔

اللہ کی طرف سے پیغام لانے والوں کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ جس پیغام الٰہی کو لے کر آئے ہیں۔ لوگ اسے تسلیم کریں اور فوج در فوج دین خدا میں داخل ہو جائیں۔ یہی خواہش پیغمبر اکرم کی بھی تھی۔ آپ کے لیے ایک مقام پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے۔ "اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ[1] (اگر تم ان کی ہدایت کی شدید خواہش کرتے ہو تو اللہ اس کی ہدایت نہیں کرتا جس پر گمراہی طے کر چکا ہے اور ان لوگوں کے لیے مددگار بھی نہیں ہیں)

یہی خواہش صحابہ کرامؓ کی بھی تھی کہ لوگ دینِ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ انصارِ مدینہ اور یہودیوں میں قدیمی روابط تھے۔ یہ لوگ اپنی فطری خواہش کے تحت یہودیوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اس مرحلے پر آیت نے مسلمانوں کو خطاب کیا کہ یہ یہودی وہی لوگ ہیں جن کے آباءواجداد

---

[1] سورۂ نحل ۳۷۔

اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں تو کیا تم وہ اُن سے کہتے ہو جسے اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے تاکہ وہ تمہارے رب کے حضور تم پر حجت قائم کرسکیں کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور اور جو آشکارا کرتے ہیں۔

آیت کا خطاب مسلمانوں سے ہے اور استفہام انکاری ہے۔ اس میں پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کو یہ بتلایا گیا ہے کہ یہودی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں ایمان کا صلہ باء کی جگہ لام سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔

اللہ کی طرف سے پیغام لانے والوں کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ جس پیغام الٰہی کو لے کر آئے ہیں۔ لوگ اسے تسلیم کرلیں اور فوج در فوج دین خدا میں داخل ہو جائیں۔ یہی خواہش پیغمبرؐ اکرم کی بھی تھی۔ آپ کے لیے ایک مقام پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے۔ "اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ"[1] (اگر تم ان کی ہدایت کی شدید خواہش کرتے ہو تو اللہ اس کی ہدایت نہیں کرتا جس پر گمراہی طے کر چکا ہے اور ان لوگوں کے لیے مددگار بھی نہیں ہیں)۔

یہی خواہش صحابہ کرامؓ کی بھی تھی کہ لوگ دینِ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ انصارِ مدینہ اور یہودیوں میں قدیمی روابط تھے۔ یہ لوگ اپنی فطری خواہش کے تحت یہودیوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اس مرحلے پر آیت نے مسلمانوں کو خطاب کیا کہ یہ یہودی وہی لوگ ہیں جن کے آباء واجداد

---

[1] سورۂ نحل ۳۷۔

احکام الٰہی کو خوب سمجھ لینے کے باوجود تحریف کیا کرتے تھے تو یہ کیا ایمان لائیں گے۔[1]

دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں کا ایک صاحب علم و دانش گروہ پیغمبر اکرم سے متعلق توریت کی پیش گوئیوں کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود تحریف کر دیتا تھا تو جب ان کے پڑھے لکھوں کی بد دیانتی کا یہ عالم ہے تو عام یہودیوں سے ایمان لانے کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔[2]

وَهُمْ يَعْلَمُونَ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ کلام الٰہی میں تحریف نہیں کرنی چاہیئے یہ دونوں مفہوم آیت میں مراد لیے جا سکتے ہیں۔

پھر یہودیوں کی منافقت کا ذکر کیا گیا اور یہ بتلایا گیا کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تو محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو مزید معتبر بنانے کے لیے ان ساری پیشگوئیوں کو بیان کرتے تھے جو رسُول اکرمؐ کے سلسلے میں ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے ہی گروہوں میں بیٹھتے تو ان کے ذی علم لوگ کہتے کہ تم مسلمانوں سے وہ پیش گوئیاں کیوں بیان کرتے ہو؟ اس سے تو مسلمانوں کو دلیل مل جائے گی کہ وہ تم پر اپنی حجت قائم کر سکیں۔ اس کا جواب یہ کہہ کر دیا گیا کہ ان کے چھپانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا اس لیے کہ رسُولؐ کی پشت پر وہ اللہ ہے جو ہر پوشیدہ اور علانیہ کا جاننے والا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد اول کے مطابق وہی ستر افراد تھے جنہیں مُوسیٰؑ نے میقات کے لیے منتخب کیا تھا۔ (ابن عباس)

[2] تفسیر منہج الصادقین جلد اول صفحہ ۲۱۸ روایت امام محمد باقر علیہ السلام۔

[3] سُورہ بقرہ ۱۴ تشریح مزید کے لیے۔

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ ﴿۷۸﴾

اور کچھ ان میں سے ایسے ان پڑھ ہیں کہ وہ کتاب کو اپنی جھوٹی امیدوں کے سوا کچھ نہیں جانتے اور وہ فقط گمان میں رہتے ہیں۔

"اُمّیّوُن" "اُمّی" کی جمع ہے۔ مفرداتِ راغب کی رُو سے اُمی وہ ہے جسے لکھنا پڑھنا نہ آتا ہو اسی کتاب میں قطرب کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ امیّت کے معنی غفلت و جہالت کے ہیں اور اُمّی اسی مفہوم میں ہے۔ صاحب المیزان کے قول کے مطابق "اُمّی" "اُم" ماں کی طرف منسوب ہے۔ ایسلیے کہ ماں کی مامتا اس بات سے روکتی تھی کہ وہ بچّہ کو معلم کے سپرد کردے لہٰذا بچہ فقط ماں کی طرف سے تربیت حاصل کرتا تھا۔

لفظ "اُمّی" دو مقامات پر (اعراف ۱۵۷/۱۵۸) پیغمبرِ اکرمؐ کی صفت واقع ہوا ہے۔ اس سے مراد ایسا انسان ہے جس نے کسی دُنیاوی ذریعہ سے علم حاصل نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس لفظ کو رسُول اور نبی جیسے عظیم عُہدوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یعنی رسُولِ اکرمؐ کی اُمیّت کو آپ کی دلیل نبوّت کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی مکتب یا درس میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم نہیں لی۔ اس موضوع پر ان شاءاللہ کسی مناسب موقع پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اس آیت سے قبل یہودیوں کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا گیا۔ ایک منافقین کا گروہ جو مسلمانوں میں گھس کر انہیں اپنے ایمان کا یقین دلانا چاہتا تھا، دوسرا ان لوگوں کا گروہ جو منافقوں کو اس عمل سے منع کرتا تھا۔ اب اس آیۂ مبارکہ میں تیسرے گروہ کا ذکر فرمایا گیا کہ یہ عوام الناس ہیں اور یہ کتاب کو

دوراز کار اور جھوٹی امیدوں کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ ان کے علماء نے جو جھوٹی اور دل خوش کن باتیں انہیں بتلادی ہیں، ان میں مگن رہتے ہیں اور ان کے پاس اپنے خوبصورت عقیدوں کے لیے کوئی دلیل و برہان نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے وہ ظن و گمان ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں یہودی عوام کے دو عیبوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پہلا عیب یہ تھا کہ وہ اپنے علماء سے سنی ہوئی باتوں کو بطور عقیدہ اپنا لیتے تھے اور ان میں دوسرا عیب یہ تھا کہ وہ ظن و گمان پر بھروسہ کرتے تھے۔ اس سے پوری انسانیت کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ اعتقادی مسائل میں تقلید جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ جاہل یہودی کیا کرتے تھے، بلکہ حسب صلاحیت و استعداد عقائد کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھنی ضروری ہے۔ اسی طرح اعتقادیات میں ظن و تخمین کافی نہیں ہیں بلکہ جزم و یقین کا حاصل ہونا ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو انسان غضب خداوندی کا سزاوار ہوگا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَٰبَ بِأَيْدِيهِمْ
ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا
بِهِۦ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ
أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾
وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ
قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ
اللَّهُ عَهْدَهُۥ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾
بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَٰطَتْ بِهِۦ خَطِيٓـَٔتُهُۥ
فَأُولَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨١﴾
وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ أُولَٰٓئِكَ
أَصْحَٰبُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨٢﴾

پس افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب کو لکھتے
ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے
ذریعہ تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں پس افسوس ہے

ان پر اس کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھّا اور پھر افسوس ہے اس کے سبب جو وہ کمائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گنتی کے چند دنوں کے سوا آگ ہمیں چھوئے گی بھی نہیں ان سے کہہ دو کیا تم لوگ خدا سے کوئی وعدہ لے چکے ہو تو پھر وہ کسی طرح بھی اپنے وعدہ کے خلاف نہ کریگا یا جانے بغیر اللہ پر باتیں بنا رہے ہو

کیوں نہیں جس نے بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا تو وہ لوگ یقیناً اہلِ دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام بھی کیے ہوں وہی جنتی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

یہ یہودیوں کا چوتھا گروہ ہے اور اس سے مراد علماء ہیں۔ اور جب پیغمبر اکرمؐ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہودی علماء کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر آپ کی نبوت چل گئی تو یہودیوں کی طرف سے ملنے والے وظائف و تحائف بند ہو جائیں گے اور معاشرے میں جو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا، غرض معاشی اور سماجی دونوں طرح کے نقصانات کا اندیشہ تھا لہٰذا انہوں نے توریت میں مذکور ان ساری پیش گوئیوں میں تحریف کر دی جن کا تعلق رسولِ اکرمؐ سے تھا، یہاں تک کہ آپ کے بیان شدہ حلیہ کو بھی تبدیل کر ڈالا۔ اس آیت میں اسی صورتِ حال کو بیان فرمایا گیا ہے۔

پہلے فَوَیۡلٌ کی فا بظاہر سبب کے لیے ہے اور یہ اشارہ کر رہی ہے کہ یہودی عوام الناس جس ظن و گمان میں پھنسے ہوتے ہیں اور کتاب کی جن جھوٹی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ انھیں علماء سُوء کی من گھڑت باتیں ہیں جن کا حقیقی کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں تین

مرتبہ لفظ ویل استعمال ہُوا ہے، یہ ناراضگی کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے اردو میں تُف اور وا ئے استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے مراد عذابِ شدید ہے۔ اس لفظ کا تین بار (ایک آیت) استعمال ہونا مختلف اعمال کی مختلف سزاؤں کی نشان دہی کر رہا ہے۔

(۱) کلامِ خدا میں تحریف کرنا۔ (۲) جاہلوں کو اس کے ذریعہ گمراہ کرنا۔
(۳) اس عملِ خبیث کے ذریعہ دولت کمانا۔

اس آیت میں دوبار تحریر کے سلسلے میں ہاتھوں کا ذکر کیا گیا ہے "اپنے ہاتھوں سے کتاب کو لکھتے ہیں" اور "پس افسوس ہے اس کے سبب جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا" یہ سب جانتے ہیں کہ ہاتھ ہی سے لکھا جاتا ہے تو اس کے بیان کی ضرورت کیا تھی؟ یہ تاکید اس لیے ضروری تھی تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ لوگ کسی دوسرے کی تحریف کردہ کتاب کو نقل نہیں کر رہے تھے، بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے تحریف کر رہے تھے۔

توریت کی تنقید علمی دُنیا میں ایک مستقل موضوع کی صُورت اختیار کر چکی ہے اور اب تک مختلف یورپی زبانوں میں اس موضوع کی بے شمار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں، جن میں یہ تلایا گیا ہے کہ یہ کتاب عہدِ موسیٰ کے بہت بعد مرتب کی گئی۔ محققین نے متنِ توریت (پانچوں کتابوں) کو جانچا، تاریخی حوالوں کو کھنگالا، زبان و بیان کے محاورات و اسالیب پر نظر کی اور اس وقت کی بستیوں کے مختلف رسم و رواج دیکھے اور توریت کے مذکورہ واقعات سے ان کا موازنہ کیا اور پھر اس نتیجے تک پہنچے کہ یہ پانچوں کتابیں اصلی نہیں ہیں، بلکہ اصلی کتابوں کی بنیاد پر انھیں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کی ایک سامنے کی مثال موسیٰ علیہ السّلام کی وفات کا ذکر ہے۔ "پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اس نے اِسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل دفن کیا پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اُس کی طبعی قوت کم ہوئی ہے۔[1]" اب یہ بات کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ یہ عبارت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہونے والی کتاب کی نہیں ہے، بلکہ کسی اور کی تحریر کردہ ہے۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں اس کتاب کے محرف ہونے پر دلیل ہیں۔

اس بحث کی روشنی میں یہ سوال اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ کتاب جس میں پہلے ہی تحریف ہو چکی ہو اگر یہودی عُلماء نے اس میں مزید تحریف کر دی تو قرآن مجید اس عمل کو قابلِ مواخذہ کیوں قرار دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب کو دو نسبتوں کے حوالے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] کتاب استثناء باب ۳۴ فقرات ۵/۶/۷

ایک جواب یہودیوں کی نسبت سے اور دوسرا توریت کے کلام الٰہی ہونے کی نسبت سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ آج علمی حلقوں نے توریت کی تحریف کو اپنی تحقیقات کے ذریعہ یقین کی منزل تک پہنچا دیا ہے، لیکن زمانۂ نزولِ آیت کا یہودی اُس پوری کتاب کو کلامِ الٰہی سمجھتا تھا اور کلامِ الٰہی کو سمجھتے ہوئے اس میں تحریف کر رہا تھا، یعنی وہ خود اپنے ایمان و اعتقاد کی رُو سے کلامِ الٰہی میں تحریف کا مجرم بن رہا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگرچہ توریت میں تحریف ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کتاب میں کلامِ الٰہی پایا جاتا ہے اور قرآن مجید نے اسی پائے جانے والے کلامِ الٰہی کی تحریف کو قابلِ مواخذہ قرار دیا ہے۔ جیسے رسُولِ اکرمؐ کے سلسلے کی پیش گوئیاں۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ الخ یہودیوں کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کی چہیتی قوم ہیں لہٰذا وہ جہنم میں نہیں جائیں گے اور اگر داخل بھی کیے گئے تو بنا بر اختلافِ اقوال وہ سات دن، چالیس دن، ایک سال یا گیارہ ماہ سے زیادہ نہیں رہیں گے اس کے جواب میں فرمایا گیا قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (اے رسُولؐ! ان سے سوال کرو کہ کیا تم لوگوں نے اللہ سے ایسا کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟) اس لیے کہ اس بات کا تعلق روزِ قیامت سے ہے اور روزِ قیامت کی تفصیلات فقط دلیل نقلی سے حاصل ہو سکتی ہیں ظن و تخمین بلکہ دلیل و برُہان سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں تو اگر ایسا کوئی عہد بہ دلیل نقلی تمہارے پاس ہے تو وہ ہمارے سامنے پیش کرو۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً الخ بلیٰ حرف نفی کے بعد استعمال ہوتا ہے اور نفی کو ثابت کرتا ہے جیسے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰى شَهِدْنَا[1] (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں، ہم اس بات کے گواہ ہیں) اس طرح اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ قَالُوا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ[2] (کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا)۔ سیئۃ ہر برُائی کو کہتے ہیں لیکن اس آیت میں شرک کی برُائی مراد ہے۔ علامہ طبرسی نے تحریر کیا ہے کہ يُوَافِقُ مَذْهَبَنَا لِاَنَّ مَا عَدَا الشِّرْكِ لَا يَسْتَحِقُّ بِهِ الْخُلُوْدَ فِي النَّارِ عِنْدَنَا[3] (یہ قول کہ یہاں سیئہ سے مراد شرک ہے، ہمارے مذہب کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ ہمارے عقیدے میں شرک کے علاوہ کوئی دوسری برائی جہنم کی ہمیشگی کا استحقاق نہیں پیدا کرتی)۔

اس موضوع پر محمد جواد مغنیہ نے ایک دلچسپ بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر

---

[1] سُورۂ اعراف ۱۷۲۔

[2] سُورۂ ملک ۹/۸۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد اوّل آیت زیرِ تحریر کے ذیل میں۔

کوئی شخص اقرار بالشہادتین کرتا ہو اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو تو اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ کافر ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ یا مؤمن فاسق ہے جو اپنے گناہ کی سزا پائے گا۔ اور پھر جنت میں داخل ہوگا؟

خوارج پہلے قول کے قائل ہیں اور امامیہ و اشاعرہ اور اکثر صحابہؓ و تابعینؒ دوسرے قول کے قائل ہیں۔ معتزلہ نے ایک تیسرا قول ایجاد کیا ہے اور انہوں نے ایسے شخص کے لیے ایک تیسری حیثیت ثابت کی ہے کہ وہ نہ کافر نہ مؤمن۔

کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن فاسق ہے۔ اس قول کی صحت پر علامہ حلی نے شرح تجرید میں استدلال کیا ہے کہ اگر ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جو شخص اپنی پوری زندگی عبادتِ الٰہی میں بسر کرے۔ پھر آخر میں ایک معصیت کرے۔ جب کہ ایمان پر بھی باقی ہو تو یہ اسی طرح جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔ جس طرح وہ شخص ہمیشہ جہنم میں رہے، جس نے پوری زندگی شرک میں گزاری ہو اور یہ محال ہے کہ اس لیے کہ عقلاء اسے قبیح قرار دیتے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ایک بدی (سیئہ) تمام نیکیوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح ہے جیسا کہ قرآن مجید نے سورۂ ہود (۱۱۵) میں ارشاد فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آیت میں لفظ سیئہ کو شرک پر حمل کیا جائے۔ اس کے بعد کی آیت وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ اس بات پر دلیل ہے کہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ بلکہ جنت میں داخل ہو گا اس لیے کہ آیت عام ہے اور اس میں وہ بھی شامل ہے جو ایمان اور عمل صالح رکھتا ہے اور پھر کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا۔[1]

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ اس سے قبل کی آیت میں جہنمی بننے کے دو اسباب بتلائے گئے کہ انسان بدی (سیئہ) کا اکتساب کرے اور گناہ اسے گھیر لے تو جہنمی بن جاتا ہے۔ اس طرح اس آیت میں جنتی ہونے کے دو اسباب بتلائے گئے کہ اگر انسان ایمان اور عمل صالح پر کاربند ہو تو جنتی بن جاتا ہے۔ دونوں آیات میں ثواب و عقاب کا پورا فلسفہ اپنے شرائط کے ساتھ سمجھا دیا گیا ہے کہ جو اپنے ارادے سے خدا کے بتائے ہوئے ایمان و عمل صالح سے منہ موڑے گا وہ جہنمی ہے اور جو اپنے ارادے سے خدا کے بتلائے ہوئے ایمان و عمل صالح پر گامزن ہوگا وہ جنتی ہے۔ اس آیت میں ایمان کا تذکرہ پہلے اور عمل صالح کا ذکر بعد میں ہے اور دیگر مقامات پر بھی قرآن میں یہی ترتیب نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی سورت کی آیت ۲۵ اور ۶۲ کو اور سورۂ تین و عصر کو پیش

---

[1] التفسیر الکاشف جلد اول صفحہ ۱۳۹۔

کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں میں رُتبہ کے اعتبار سے ایمان کی اہمیت عمل سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عمل صالح غیر اہم شے ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شرائط نجات کی دوسری اہم شرط ہی عمل صالح ہے۔ اس تقدیم و تاخیر سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ایمان و عمل میں اصل اور فرع کا رشتہ ہے اور اعمال صالحہ اس وقت ثمر آور ہوتے ہیں۔ جب انہیں ایمان کی بنیاد پر انجام دیا جائے۔ لیعنی وہ اعمال صالحہ جن کی بنیاد میں ایمان نہ ہو جو بربنائے عادت، یا اظہار دولت کے لیے یا خاندانی روایات کے سبب یا کسب شہرت وغیرہ کے لیے انجام دیئے جاتے ہیں وہ قابل جزا نہیں ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ
اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ
حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿٨٣﴾
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾
ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ
تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ
مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا

جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ
اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا تم کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ نیکی کرو گے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی، اور لوگوں سے اچھی بات کہو گے اور نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے، پھر چند افراد کے سوا تم میں سے سب منہ پھیر کر برگشتہ ہو گئے۔

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے جلاوطن کرو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور اس کے گواہ ہو۔

پھر تم ہی لوگ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے جلاوطن کرتے ہو ان پر گناہ

اور تعدی کرتے ہوئے چڑھائی کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے
پاس قیدی ہو کر آتے ہیں تو انہیں فدیہ دیکر چھڑاتے ہو حالانکہ
ان کا نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا، کیا تم کتاب کے
بعض حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو،
تم میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیاوی زندگی
میں ذلّت کے سوا کچھ نہیں اور یہ لوگ آخرت میں شدید
عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ اس سے
غافل نہیں ہے، جو تم لوگ کر رہے ہو۔

یثاق بنی اسرائیل سے توریت کے سارے احکام الٰہی مراد ہیں، ان میں سے اہم ترین احکام اس مقام پر بیان فرمائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ اس کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں، لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی صداقتیں ہیں جو زمان و مکان سے بے نیاز پوری انسانیت پر محیط ہیں۔ اور ان پر عمل پوری انسانیت سے مطلوب ہے۔

عبادت الٰہی

یہ جملہ اگرچہ خبریہ ہے، لیکن انشائیہ کے مفہوم میں ہے اور نہی ہے۔ ایسا جملہ اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب کہ نہی میں شدید تاکید مقصود ہو۔ اس ایک عبادت کے حکم میں درحقیقت دو حکم دیئے گئے ہیں جو جملہ کی ساخت ہی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی عبادت کرو اور دوسرے یہ کہ غیر خدا کی عبادت نہ کرو۔

والدین کے ساتھ احسان

عبادت الٰہی کے بعد بلا فصل جو عہد لیا گیا ہے وہ والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا ہے۔

بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کے وجود کا سبب حقیقی اللہ ہے۔ اسی طرح اس کے وجود کا سبب مجازی والدین ہیں۔ اس دنیاوی زندگی میں جتنی نعمتیں انسان کو ملتی ہیں وہ پیدائش کے بعد ہی ملتی ہیں۔ لہذا دنیاوی زندگی کی ساری نعمتوں کا پہلا وسیلہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ ان میں خدا کی رحمت سے ایک عجیب قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس طرح وہ کسی ذاتی غرض کے بغیر بندوں کو پالتا ہے۔ اسی طرح والدین کسی طمع کے بغیر اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مشابہتیں ہیں جو صاحبانِ فہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

ذخیرۂ احادیث میں اس موضوع پر بہت تفصیلی مواد موجود ہے۔ فقط دو حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔

"اِنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِيْ فَقَالَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ حُرِّقْتَ بِالنَّارِ وَعُذِّبْتَ اِلَّا قَلْبُكَ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَوَالِدَيْكَ فَاَطِعْهُمَا وَبَرَّهُمَا حَيَّيْنِ كَانَا اَوْ مَيِّتَيْنِ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ فَافْعَلْ فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ" [1]

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر سوال کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی بات تلقین فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دو اگرچہ آتشِ دنیا سے جلنا ہی کیوں نہ پڑے اور تم پر مصیبت ہی کیوں نہ آئے سوائے اس کے کہ زبان سے تقیۃً خلافِ ایمان اظہار کرنا پڑے اور تمہارا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ اور اپنے والدین کا خیال رکھو۔ پس ان کی اطاعت کرو، ان کے ساتھ نیکی کا سلوک کرو وہ زندہ ہوں یا مُردہ، اور اگر وہ حکم دیں کہ اپنے اہلِ خانہ سے یا اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤ تو وہی کرو اس لیے کہ یہ منجملۂ ایمان ہے۔

"قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا يَمْنَعُ الرَّجُلَ مِنْكُمْ اَنْ يَبَرَّ وَالِدَيْهِ حَيَّيْنِ وَمَيِّتَيْنِ يُصَلِّيْ عَنْهُمَا وَيَتَصَدَّقُ عَنْهُمَا وَيَحُجُّ عَنْهُمَا وَيَصُوْمُ عَنْهُمَا فَيَكُوْنُ الَّذِيْ صَنَعَ لَهُمَا وَلَهُ مِثْلُ ذٰلِكَ فَيَزِيْدُهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ بِبِرِّهٖ وَصِلَتِهٖ خَيْرًا كَثِيْرًا" [2]

---

[1] اصول کافی کتاب الکفر والایمان باب البر بالوالدین (۶۹ واں باب)

[2] اصول کافی کتاب الکفر والایمان باب البر بالوالدین (۶۹ واں باب)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا، کہ تم میں سے کسی شخص کو کیا چیز اس بات سے مانع ہے کہ وہ زندہ یا مُردہ والدین کے ساتھ نیکی کرے (مردہ ہونے کی صورت میں) ان کے لیے نماز پڑھے، ان کی طرف سے صدقہ دے، ان کی طرف سے حج کرے۔ اور ان کی طرف سے روزہ رکھے۔ پس جو کچھ ان کے لیے کرے گا اس کے ثواب کے مثل اسے بھی ملے گا پس خدا اس کے لیے اس نیکی اور صلہ کے عوض خیر کثیر میں اضافہ کرے گا۔

رشتہ دار

قربیٰ مصدر ہے اور اس کے معنی قرابت کے ہیں۔ ذی القربیٰ یعنی قرابت دار۔ اس عہد کو احسان والدین کے بعد رکھا گیا اس لیے کہ انسان کی ساری قرابتوں کا سرچشمہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ رشتہ داری یا ماں کی طرف سے ہوتی ہے یا باپ کی طرف سے۔ مذکورہ احکامات میں احسان (نیکی) کے ذیل میں دوسرے درجہ پر ان کا تذکرہ ان کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی اہمیت ہے جو ماں باپ کے وسیلے سے کسی انسان کے قرابت دار ہوتے ہیں تو اب سوچنا چاہیئے کہ رسُول اکرمؐ کے قرابت داروں کی کیا اہمیت ہو گی؟ اسی لیے اللہ نے ان کی محبت و مودت کو رسُولؐ کی رسالت کا اجر قرار دیا ہے۔ "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"[1] (رسُول کہہ دو کہ میں تم سے رسالت کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا سوائے اپنے قرابت داروں کی محبت کے)۔ قربیٰ اس آیت میں اگرچہ مصدر ہے مگر قرابت دار (فاعل) کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ صاحب تفسیر کشاف اور دیگر مفسرین نے بیان کیا ہے۔ کشاف، بیضاوی اور صواعق محرقہ کی بیان کردہ روایات کی رُو سے ان سے مراد علی و فاطمہ اور حسنین علیہم السلام ہیں۔ تفصیلی بحث ان شاء اللہ آیۂ مودت کے ذیل میں کی جائے گی۔

اس سلسلے کی ایک اور روایت بھی قابل توجہ ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ مَنْ رَعٰى حَقَّ قَرَابَاةِ اَبَوَيْهِ اُعْطِيَ فِى الْجَنَّةِ اَلْفَ اَلْفِ دَرَجَةٍ ثُمَّ فَسَّرَ الدَّرَجَاتِ ثُمَّ قَالَ وَمَنْ رَعٰى حَقَّ قُرْبٰى مُحَمَّدٍ وَعَلِيٍّ اُوْتِيَ مِنْ فَضَائِلِ الدَّرَجَاتِ وَزِيَادَةِ الْمَثُوْبَاتِ عَلٰى قَدْرِ زِيَادَةِ فَضْلِ مُحَمَّدٍ وَعَلِيٍّ عَلٰى اَبَوَيْ نَسَبِهٖ۔[2]

---

[1] سورہ شوریٰ، ۲۳۔

[2] تفسیر صافی صفحہ ۳۶۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے والدین کی قرابتوں کے حق کی رعایت کرے گا اسے جنت میں ہزار ہزار درجات عطا ہوں گے۔ پھر آپ نے درجات کی تفصیل بیان فرمائی اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جو محمدؐ اور علیؑ کی قرابت کے حق کی رعایت کرے گا اسے بلند ترین درجات اور کثیر ثواب عطا ہوں گے۔ ان دونوں عطاؤں میں اتنا ہی فرق ہوگا۔ جتنا کسی انسان کے نسبی والدین میں اور محمد و علی (علیہما السلام) میں ہے۔

یتیم

یتٰمیٰ یتیم کی جمع ہے۔ انسانوں میں یتیم اس نا بالغ بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ مرچکا ہو اور جانوروں میں وہ بچہ یتیم کہلاتا ہے۔ جس کی ماں مرچکی ہو (مجمع البیان، مفردات راغب) قرآن مجید نے یتیم کو بہت اہمیت دی ہے اور بڑی شد و مد کے ساتھ اس کے مسائل پر گفتگو فرمائی ہے (بقرہ ۱۷۷، نساء ۲، نساء ۱۰، انعام ۵۲ وغیرہ)۔

مسکین

مساکین مسکین کی جمع ہے اس کے معنی عاجز اور بے چارہ انسان کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں فقط ایک مقام پر لفظ "فقراء" کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ الخ[1] (صدقات فقط فقراء اور مساکین وغیرہ کے لیے ہیں) اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے مفسرین اور فقہاء نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی اور مترادف ہیں یا الگ الگ مفہوموں پر دلالت کرتے ہیں؟ بعض محققین کا خیال ہے کہ مسکین اسے کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور یہ فقیر سے درجہ میں پست تر ہوتا ہے۔ لیکن اس قول کی صحت اس وقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ جب ہم قرآن مجید کی یہ آیت دیکھتے ہیں اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ[2] اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کشتی کچھ مسکینوں کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے یعنی وہ کشتی کے مالک ہوتے ہوئے بھی قرآن کی نگاہ میں مسکین تھے[3] صاحب مجمع البیان نے تحریر فرمایا ہے کہ اَلْمِسْكِيْنُ هُوَ الْمُتَخَشِّعُ الْمُتَذَلِّلُ

---

[1] سورۂ توبہ، ۶۰۔

[2] سورۂ کہف، ۷۹۔

[3] قاموس قرآن جلد سوم صفحہ ۲۸۵۔

مِنَ الْحَاجَةِ مَاخُوْذٌ مِنَ السُّكُوْنِ كَاَنَّهُ قَدْ اَسْكَنَهُ الْفَقْرُ (مسکین اس انسان کو کہتے ہیں جو احتیاج کے سبب ٹوٹا ہوا اور فروتن ہو، یہ لفظ سکون سے بنا ہے، گویا اسے فقر نے عاجز اور بے چارہ بنا دیا ہے) اس تشریح کی روشنی میں جو کسی بھی سبب سے عاجز، بے چارہ اور درماندہ ہو جائے وہ مسکین ہے اور جو عدم مال کے سبب بے چارہ ہو وہ فقیر ہے، یعنی مسکین عام اور فقیر خاص ہے لیکن یہاں بعض ژرف نگاہ محققین کا یہ قول نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیئے کہ فقیر و مسکین اپنے اجتماع میں افتراق رکھتے ہیں اور اپنے افتراق میں اجتماع۔ یعنی جب یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہوں تو ان کے معنی میں فرق ملحوظ رکھا جائے گا اور جب یہ الگ الگ استعمال ہوں تو ان دونوں کا معنی ایک ہوگا۔ اس بحث کی صحیح جگہ سورۂ توبہ کی ساٹھویں آیت ہے۔

قول حسن

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ اَحْسَنَ مَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يُقَالَ لَكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ اللَّعَّانَ السَّبَّابَ الطَّعَّانَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُتَفَحِّشَ السَّائِلَ الْمُلْحِفَ وَيُحِبُّ الْحَلِيْمَ الْحَيَّ الْعَفِيْفَ الْمُتَعَفِّفَ[1]

لوگوں کے لیے وہ کہو جو تمھیں اپنے بارے میں پسند ہو اس لیے کہ خدا دشمن رکھتا ہے مومنین پر لعنت کرنے والے گالی دینے والے اور طعن و طنز کرنے والے کو اسی طرح دشمن رکھتا ہے فحش گو کو باصرار دست سوال دراز کرنے والے کو اور پسند کرتا ہے بردبار، باحیا، عفیف اور ایسے شخص کو جو اپنے نفس کو محرمات سے دور رکھے۔"

مذکورہ سارے احکام بہ شمول اقامۂ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کو بیان فرمانے کے بعد پھر ان کی سرکشی اور روگردانی کا تذکرہ کیا گیا اس میں یہ بھی مصلحت پوشیدہ ہے کہ عہدِ نزول قرآن کے یہودی اس تذکرہ کو سن کر اور اس سے نمایاں ہونے والی زجر و توبیخ کو محسوس کرکے سیدھے راستے کی طرف آنے کی کوشش کریں۔

ان احکامات کا تذکرہ موجودہ توریت کی کتاب خروج اور کتاب استثناء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ الخ۔ ان دو آیات کے سلسلے میں مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اوس و خزرج مدینہ کے دو مشرک قبیلے تھے اور ان میں قبلِ اسلام سے جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ یہودی بھی مدینہ میں تین قبیلوں میں منقسم تھے۔ بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر۔ بنی قینقاع قبیلۂ اوس کے

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۱۱۔

حلیف تھے اور جنگوں میں ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ جب کہ دوسرے دو قبیلے بنی قریظہ اور بنی نضیر، قبیلہ خزرج کے حلیف تھے۔ جب جنگ کا بازار گرم ہوتا اور دونوں مشرک قبیلے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہوتے تو ان کے یہودی حلیف بھی میدان میں آجاتے تھے۔ اس طرح یہودیوں کے ہاتھوں یہودی قتل ہوتے اور جب یہودی جنگی قیدی بنا لیے جاتے تو فاتح قبیلے کا ساتھ دینے والے یہودی قیدی یہودیوں کا فدیہ دے کر انھیں آزاد کرا لیتے تھے اب یہ اُن کی عجیب منطق تھی۔ کہ یہودی کا قتل جائز سمجھتے تھے اور اس کا قیدی بننا حرام جانتے تھے، پروردگار عالم نے ان آیات میں ان کے اس عجیب و غریب رویہ پر سخت اور کڑی تنقید فرما کر ان کی سرکشی اور نافرمانی کو واضح فرمایا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ الخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ جزوی طور پر مومن اور جزوی طور پر کافر تھے اس کے باوجود انہیں اشدِ عذاب کی خبر دی گئی اور بتلایا گیا کہ جزوی ایمان کام نہیں آئے گا اور اشد کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا کہ ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی اس لیے کہ اللہ کا مطلوب جزوی ایمان نہیں ہے، بلکہ کلی ایمان ہے۔ اس سے یہ قاعدہ کلیہ نکلتا ہے کہ نجات کے لیے انسان کو ہر اس چیز پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جس پر اللہ چاہتا ہے کہ ایمان لایا جائے ورنہ بصورت دیگر یہ نصف پر ایمان لانا بھی دین کا تمسخر اور استہزاء ہوگا۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا بِٱلۡأٓخِرَةِۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ ٱلۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی خرید لی ہے لہٰذا نہ تو ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

اس آیۂ مبارکہ میں انہیں یہ تبلادیا گیا ہے کہ آخرت کے بدلے دُنیا خریدنا گھاٹے کا سودا ہے ایسا گھاٹا جس کی تلافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ قیامت کے دن نہ ان کا نسل انبیاء میں ہونا کام آئے گا۔ نہ یہ دعوٰی کام آئے گا کہ وہ اللہ کی چہیتی قوم ہیں اور نہ ان کے آباء و اجداد صالحین کی شفاعت ان کے کام آئے گی۔

سرٹیفکیٹ

مَیں نے اِس احسن الحدیث کی آیاتِ قرآنیہ کو حرفاً حرفاً نہایت غور اور امعانِ نظر سے پڑھا ہے اور مَیں تصدیق کرتا ہوں کہ اس کے متن میں کوئی کمی بیشی اور کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہے ۔

فقیر سائیں نُور احمد طالب قادری

تصدیق مصحح

برائے قرآن مجید مترجم ' ترجمہ علامہ طالب جوہری مدظلہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ امابعد

اس کلام پاک و لاجواب کو بندہ ناچیز پرتقصیر نے اوّل سے آخر تک بہ نظر تعمّق پڑھا۔ کاتب کی چند ایک اغلاط جو سہواً" سرزد ہو گئی تھیں وہ ماشاء اللہ تمام کی تمام درست کرا لی گئی ہیں اور جیسا کہ بحکم خداوند بالا و برتر ذٰلک الکتب لا ریب فیہ اب کاتب کی اغلاط سے بھی مبّرا ہے کیونکہ اس خادم نے قبل ازیں کئی قرآن شریف پڑھ کر کاتبوں کی اغلاط درست کی ہیں اور خداوند کریم کے فضل و کرم سے خادم کو اس میں خاصی مہارت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ○ وما توفیقی الا باللہ

بندہ ناچیز پرتقصیر و طالب مغفرت
حافظ محمد اشفاق قادری
پروف ریڈر قرآن پاک 1/123 کریم پارک راوی روڈ لاہور

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۱۲	۱۰	اِس لیے قرآن	اِس لیے کہ قرآن
۵۷	۱۴	اِس	اِسی
۱۴۲	۲۰	انسانی دعا	دعا
۱۷۱	۱۲	یہ زمانہ	یہ وہ زمانہ
۲۰۳	۱۳	حواہش	خواہش
۲۴۸	۱۹	قرب الموارد	اقرب الموارد
۲۵۰	۱۴	اِس	اِسی
۲۵۱	۱۷	لہ	۳ہ
۲۵۲	۱۸	〃 〃 〃	مجمع البیان
۲۵۳	۷	امانت	امانت
۲۵۵	۹	اِس لیے قرآن	اِس لیے کہ قرآن
۲۶۴	۱۶،۱۷،۱۸،۱۹	یہ علامات ”	“ غلط ہیں
۲۷۰	۱۳	جومیری	تو جومیری
۲۷۷	۱۴	اوامرنواہی	اوامر ونواہی
۳۰۶	۶	رعیس	رعمیس
۳۰۶	۲۶	سورۃ الاعراف ۱۴۲	سورۂ مزمل ۱۵
۳۱۰	۱۷	ہے بقرہ میں	ہے جیب کہ بقرہ میں
۳۱۰	۱۷	کیا گیا	کیا گیا ہے
۳۲۷	۱۱	گئے	گئے لہ
〃	۱۹	اسے لہ	اسے
۳۳۳	۱۳	نذیر	نظیر
۳۳۹	۱۵	پہاڑوں	پہاڑی
۳۵۲	۲۰	ہوں	ہوتے
〃	۱۶	کوئی کرے	کوئی کام کرے

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۳۵۶	۱۸	عذاب	عذابوں
۳۶۲	۷	سوائے	سو آئے
۳۶۳	۱	جانور	جانوروں
۳۶۷	۱۱	اِس	اسی
〃	۱۳	یہ طے کہ	یہ طے ہے کہ
۳۷۴	۱۱	اور جب	جب
۳۷۵	۱۸	اِسے	اُسے
۳۷۷	۹	نہ کافر نہ مومن	نہ کافر ہے نہ مومن
〃	〃	جہنم میں رہے۔	جہنم میں رہے گا۔
〃	۱۱	ہے کہ	ہے
〃	۲۰	اِس	اسی

اعتذار

محترم قارئین، السلامُ علیکم!

"احسن الحدیث" کی اشاعت کے ضمن میں ہر ممکن احتیاط کے باوجود کتابت کی کچھ اغلاط رہ گئیں جنہیں بوجوہ دُور نہ کیا جاسکا۔ ہم اس پر انتہائی شرمسار ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ درگزر فرمائیں گے۔

آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔ اِنْشَاءَ اللّٰہ تعالیٰ!

ناشر